شمارہ نمبر 118

سہ ماہی

ادبیات

اسلام آباد

اکادمی ادبیات پاکستان

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

* * *

پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر»
میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

شمارے کا مصور

تنویر فاروقی

وہ مصور جو اپنے تخلیقی کارواں کو وسعت بخشنے میں محو رہتے ہیں ان میں تنویر فاروقی کا نام زیر بحث رہتا ہے۔ ان کا انداز اور اسلوب ان کے فن پارے کو احساسات اور جمالیات کا مرکب بنا دیتا ہے۔ ان کی ذاتی شخصیت کے گرویدہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا فن ان کے نام کو زندگی بخشنے میں ہمہ تن گوش ہے۔ مختلف انداز کے خیالات کو جس طرح تنویر فاروقی رنگوں کا سہارا دے کر پیش کرتے ہیں وہ قابل تحسین ہیں۔

ایک شاعر اور مصور کا خاکہ ذہن میں عجیب حلیے میں آتا ہے مگر تنویر فاروقی کی شخصیت اور حلیہ نہایت دلکش اور متاثر کن رہا۔ ان کے والد ایک سیاسی شخصیت تھے۔ ان کے ہاں حب الوطنی کا درس اور قومی خدمت کا ماحول سب پر عیاں تھا۔ تنویر فاروقی کو سیاست سے کوئی خاص دلچسپی نہیں البتہ اپنے کچھ خاص نظریات کا ساتھ نبھانا ان کا شیوہ رہا۔ دراصل فن مصوری سے تعلق انھیں بلندیوں کے اس مقام پر لے گیا کہ وہ معاشرے میں خود ایک نظریے کی صورت پھلتے پھولتے نظر آئے۔

قلم اور سیاہی سے رشتہ نبھاتے ہوئے تنویر فاروقی اپنے فن پاروں کو نت نئے انداز میں پیش کرتے ہیں، ایک طرف ان کا کمرشل کام معاشرتی تمدن میں عروج پر ہے اور دوسری طرف ان کی ذات سے وابستہ فن جوان کے خدوخال تو ابھارتا ہے وہ نہایت عمدہ اور ان کی زندگانی کا پرتو ہے۔ روغنی رنگوں کے ذریعے کینوس پر ان کا کام ان کے منفرد اسلوب کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان کے فن پاروں میں گھوڑے اور دلفریب مؤنث کی داستان رچی بسی ہے جو کسی کے دل پر بھی حاوی ہو کر اس کو فنون لطیفہ کے کسی بھی شعبہ کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ مشرقی حسن پرستی اور ناز و ادا کے ساتھ ساتھ سندھ کا روایتی انداز بھی ان کے فن پارے کو چار چند لگا دیتا ہے۔ دیہات اور شہر میں بسنے والے مردوں کے خاکے بھی ان کی مصوری کو مقام بخشتے ہیں۔

تنویر فاروقی دراصل خود میں گم وہ شخص ہے جس کا مسئلہ شہرت نہیں بلکہ اپنے اندر کی وحشت کو کسی مقام پر لے جانا ہے۔ دراصل مصور کی وحشت ہی ایک مسئلہ ہے جو اس کو اپنے انداز میں دوڑاتی ہے اور یہی اصل مصور کی نشانی بھی ہے، تنویر فاروقی نمائش زیادہ نہیں کیوں کہ تشہیر اور ابلاغ ان کا مسئلہ نہیں رہا۔

خوب صورت خواتین اور ان کی داستانِ انتظار ان کے فن پاروں کا اصل متن معلوم ہوتا ہے۔ ساکن کیفیات لیے ان کی تصاویر میں حسینائیں دراصل اپنا نظریہ پیش کر رہی ہوتی ہیں اور جمالیات کا منفرد انداز تنویر فاروقی کی مصوری سے آشکار ہوتا ہے۔ انسانی جمالیات ایک دائمی حقیقت ہیں اس لیے تنویر فاروقی کے فن پاروں میں پائل باندھی لڑکیاں اور آڑے پاجامے والی دلفریب خواتین اپنے انداز سے لوگوں کو لطف اندوز کرتی ہیں۔

تنویر فاروقی مغربی ذہن کا مالک ایک مشرقی شخص ہے جو مشرقیت کا لبادہ اپنے روحانی بدن سے اتارنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

(حمزہ حیدر)

سہ ماہی

ادبیات

اسلام آباد

شمارہ نمبر 118، اکتوبر تا دسمبر 2018

نگران : **سید جنید اخلاق**

مدیر منتظم : **ڈاکٹر راشد حمید**

مدیر : **اختر رضا سلیمی**

اکادمی ادبیات پاکستان
پطرس بخاری روڈ، سیکٹر ایچ۔ ایٹ/ون، اسلام آباد

مجلسِ مشاورتِ متن

ڈاکٹر توصیف تبسم
ڈاکٹر اقبال آفاقی
محمد حمید شاہد
ڈاکٹر وحید احمد

ضروری گزارشات

☆ مجلّے میں غیر مطبوعہ تحریریں شامل کی جاتی ہیں جن کی اشاعت پر شکریے کے ساتھ اہلِ قلم کی خدمت میں اعزازیہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے اپنی نگارشات: قلمی/اصل نام، پتا مع فون نمبر ارسال فرمائیں۔

☆ شاملِ اشاعت نگارشات کے نفسِ مضمون کی تمام تر ذمہ داری لکھنے والوں پر ہے۔ ان کی آرا کو اکادمی ادبیات پاکستان کی آرا نہ سمجھا جائے۔

☆ نگارشات اِن پیج فارمیٹ میں بذریعہ ای میل بھیجی جا سکتی ہیں:

قیمت موجودہ شمارہ: -/100 روپے (اندرون ملک) 40 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
سالانہ (4 شماروں کے لیے) -/400 روپے (اندرون ملک) 160 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
(رسالہ اندرون ملک بذریعہ رجسٹری اور بیرون ملک بذریعہ ہوائی ڈاک بھیجا جاتا ہے۔
ڈاک خرچ ادارہ خود ادا کرتا ہے)

طباعت: علی یاسر 051-9269712
سرکولیشن: میر نواز سولنگی 051-9269708

مطبع: NUST پریس، سیکٹر H-12، اسلام آباد

ناشر
اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
رابطہ: 051-9269714
Email: ar.saleemipal@gmail.com
Website: www.pal.gov.pk

فہرست

اداریہ	سید جنید اخلاق	9

مصرع مصرع روشنی ہونے لگی ہے چار سُو (عقیدت)

انجم خلیق	دل میں انجم پھر سے جاگی نعتِ نُو کی آرزو	11
محمد عارف قادری	کیا خوب ترے ذکر سے الحاق ہوا ہے	12

گردِ ملال کسی شعر پہ نہ ہو (غزلیں)

ظفر اقبال	سکوت سا تھا کوئی ہاؤ ہُو کے بیچوں بیچ	13
ڈاکٹر توصیف تبسم	کچھ تو تکمیلِ آرزو کیجیے	14
ڈاکٹر خورشید رضوی	سینۂ سنگ میں شرار ہے کیوں	15
انور شعور	جو گزر رہی ہے بدیس میں وہ تمھیں گھر آ کر بتائیں گے	16
جلیل عالی	عجب اک عکس تھا رقصِ غنا کا	17
نصرت صدیقی	زخم کی پھول میں شباہت ہے	18
عباس رضوی	شبِ گزشتہ جو بادِ مراد چلنے لگی	19
ڈاکٹر سید نواب حیدر نقوی	فلک کی نیم نگاہی سے آشنا ہوں میں	20
محمد حنیف	ریل نے سیٹی بجائی چل پڑی	21
نسیم عباسی	عمر بھر کی خود نمائی بے معانی ہو گئی	22
طارق نعیم	وہ جو اک شے کہیں پڑی ہوئی تھی	23
امان اللہ خان امان	نخل میوہ دار تھا اب کچھ نہیں	24
اشرف جاوید	کہانی دیدہ و دل کی زباں پہ لانے میں	25
اختر عثمان	گُلوں کے نقش سرِ آب دیکھنے کے لیے	26
ڈاکٹر ضیا الحسن	کیا کہوں تم سے کہ کیا موجود ہے	27
خالد معین	اب جو آنکھ میں نم رہتا ہے	28

ناز مظفر آبادی	حرفِ انکار تک نہیں جاتے	29
ڈاکٹر نثار ترابی	یوں دیکھنے کو جہاں میں کہاں نہیں ہیں ہم	30
افضل گوہر	ہمارے گھر جو ہمارے قفس بنائے گئے	31
افضل مرؔاد	کبھی خیال نہ آیا مطالبہ کرتے	32
احمد فرید	اسم پڑھا اور جسم سے اُٹھ کر عشق اٹھایا	33
خورشید ربانی	چشمِ یقیں سے دیکھیے وہم و گماں آئینہ ہے	34
مسعود صدیقی	بُجھا کے رقص کیا رات بھر چراغ کی لو	35
اشفاق عامر	دھوپ اس چشمِ تمنا کی جہاں سے گزرے	36
سحر تاب رومانی	تُو مری زندگی نہیں تھا	37
مظہر حسین سید	یہ تجربہ بھی عداوت میں کچھ نیا نہیں تھا	38
سرفراز زاہد	اگر مل جائے دل کا ایک کونا	39
عنبرین صلاح الدین	کس جگہ ہم پہ پہرا نہیں ہے بہن	40
احمد فرہاد	گرد گلِ ملال کسی شعر پر نہ ہو	41
محمد انیس انصاری	اُسی کی گود میں پلے بڑھے ہو	42
عبید الرحمٰن	کسی کے پاؤں کی رگڑ سے آگ سی لگی تو تھی، کدھر گئی	43
سید شمس الدین شمس گیلانی	ہر خوشی ہر ہنسی اُداسی ہے	44
ضیا شاہد	میں پہلی بار جب تم سے ملا تھا	45
فرح گوندل	کب سے ہے چشم و خواب میں جھگڑا پڑا ہوا	46
بلقیس خان	کسی کی سُنی نہیں ہے اگر مگر میں نے	47
فرح جعفری	وہ میرا ہو نہ سکا، میری جان ہو کے بھی	48
ذیشان مرتضیٰ	حرفِ بےصوت کی صدا ہوں میں	49
اسامہ امیر	جینے کو حیرانی پیدا کرتا ہوں	50
ندرت الٰہی	یوں ہوئیں آنکھیں چار بسم اللہ	51
بابر ظہراب	سفر کی ظلمتوں میں یہ ستارا چاہیے مجھ کو	52

نظم خطوں میں لکھی ہوئی محبت تھی (نظمیں)

آفتاب اقبال شمیم	پھر ملیں گے	53
ناصر زیدی	تین مصرعوں کی نظمیں	55

نصیر احمد ناصر	نظم ایک عورت کا پرس ہے	56
علی محمد فرشی	مشینہ 3	57
عزیز اعجاز	کبھی ہمارا خیال آئے	59
طاہر شیرازی	عجب خاں	62
عاطف علیم	میں اکیلی نہیں	64
عبید بازغ آمر	تیسری دنیا کا پیغامِ امن	66
نینا عادل	محبت میں	69
امجد بابر	لفظوں سے ڈرتے ہوئے	70
کنیز فاطمہ سیماب	تشنگی	71
عین نقوی	پیائش	73
شیراز بشارت خان	دوہے	74

اُس کی لکھی کہانی سے باہر نکل (فکشن)

ناول کا ایک باب

احمد حسین مجاہد	دیولاخ	75

افسانے

محمود احمد قاضی	میرا کمرہ	81
محمد الیاس	پچھلے جنم	85
خالد فتح محمد	مرزا کا گھر	89
آغا گل	بھولو	101
شعیب خالق	دست شناس	107
زیب اذکار حسین	حیرت آباد سے بے دخلی پر	112
بلال احمد	ایک کہانی ذرا پرانی	118
ارشد مرشد	اردو ادب ڈاٹ کام	124
سید ماجد شاہ	گھر آباد ہیں	128
سجاد بلوچ	روزے	131
عثمان عالم	اپنے جسم کا خدا	138
شیخ فاروق احمد	دوسرا دودھ	144

محمد جمیل اختر	خواب میں لکھی گئی گمشدہ کہانی	146
ابن آس محمد	نئے انسان کی لو اسٹوری	150
طیب عزیز ناسک	بیسمنٹ	153
شاہین کاظمی	ایک ادھورا گیت	156
مافات رضا	زندگی کا کوئی مکاں	162
کنزیٰ خالق	کہانی	167
امتیاز احمد	برفی	170
نین الٰہی میمن	محبت کو رخصت کر دیا	176
وقار عثمان	دیتے سے دیا	178

یادداشتیں

فریدہ حفیظ	فائل میں پڑے سفر	181

مضامین

ظفر اقبال	نظم کے بارے میں کچھ خیالات و پریشانی	189
مبین مرزا	اقبال: حرفِ نعت اور تشکیلِ افکار	192

یادِ رفتگاں

ڈاکٹر آصف فرخی	انتظار حسین کا اظہارِ خیال	209
محمد عاصم بٹ	یوسف حسن۔ طرح دار علمی اور عوامی شخصیت	230
ادریس بابر	یوسفی صاحب: آبِ گم سے خوابِ گم تک	236

شاخِ زماں آئینہ ہے، باغِ مکاں آئینہ ہے (بین الاقوامی ادب سے تراجم)

فکشن

ڈورس لیسنگ/حمید رازی	سؤر	(انگریزی ادب)	239
جوگندر پال/حنیف باوا	مختصر کہانیاں	(ہندی ادب)	244
ارون کمار جین/تنویر غلام حسین	پیٹ کی آگ	(ہندی ادب)	246
سویتلانا الیگزیوچ/مبشر احمد میر	لیفٹیننٹ کی موت	(روسی ادب)	249
ولادیمیر نابوکوف/سجاد بلوچ	علامتیں اور نشانیاں	(روسی ادب)	254
یاسوناری کاواباتا/خالد فرہاد دھاریوال	ممتا	(جاپانی ادب)	260

ایوالو ویوریوی/اعظم ملک تلاش (کینیڈین ادب) 269
رابندرناتھ ٹیگور/حمزہ حسن شیخ پوسٹ ماسٹر (بنگالی ادب) 274

شاعری

امیر خسرو/اختر عثمان بازارِ شوق (فارسی ادب) 280
منیر فیاض تعارف: ٹریسی کے سمتھ (انگریزی ادب) 282
ٹریسی کے سمتھ/منیر فیاض سائی فائی 283
ایک پرانی کہانی 284
فلوری عورت 285
ریاست ہائے متحدہ امریکہ تمھارا استقبال کرتی ہے 286
امرتا پریتم/اختر رضا سلیمی رب خیر کرے 288
پانچواں چراغ 289

وہ لفظ اس نے سنا میں نے جو کہا نہیں تھا (پاکستانی زبانی سے تراجم)

بلوچی

منیر مومن/واحد بخش بزدار رومال 291
قاسم فراز/واحد بخش بزدار ہجرت 294

پشتو

محمد ارشد سلیم زندگی کڑی دھوپ ہے (ناول کا ایک باب) 295

پنجابی

میر تنہا یوسفی/میر تنہا یوسفی موڑ مہاراں 300
اکبر لاہوری/اعظم ملک گفتگو 308
حنیف باوا/سعدیہ شمن کیا وہ میری بہن تھی؟ 312

پوٹھوہاری

فیصل عرفان/فیصل عرفان ماسری تے جیہاں کس رے 314

سرائیکی

غزالہ احمانی/سلیم شہزاد بارود کی خوشبو 315
شہباز مہروی/تسلیم فیروز نہر کنارے سایہ دار درخت تو جس نے بیچے ہیں 317

مسرت کلانچوی/حمزہ حسن شیخ پیاس 318

سندھی

اظہار سومرو/مصطفیٰ ارباب خوف 322
فیض پیرزادہ/مصطفیٰ ارباب بوڑھا 323
امر اقبال/مصطفیٰ ارباب ادھورے خواب۔ سے جاگا ہوا شخص 324
امتیاز ابڑو/فہیم شناس کاظمی گم شدہ پرچم 326

کشمیری

ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی/غلام حسن بٹ جگر کا خفقان 328

ہندکو

احمد حسین مجاہد/احمد حسین مجاہد مزدور 330

☆☆☆☆

اداریہ

ادبیات کا نیا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔

قریباً ایک سال بعد ہم عام شمارہ پیش کر رہے ہیں۔ اس سے قبل ہم نے ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ اور عبداللہ حسین پر خصوصی شمارے شائع کیے، جنھیں آپ کی جانب سے بے حد سراہا گیا۔

موجودہ شمارے میں جہاں ہم نے مختلف اصنافِ سخن کے ممتاز لکھنے والوں سے خصوصی نگارشات حاصل کی ہیں وہاں ہم نے یہ کوشش بھی کی ہے کہ نئے لکھنے والوں کی بھی نمائندگی ہو۔ چنانچہ آپ کو غزل، نظم اور افسانے میں کئی نئے نام نظر آئیں گے۔

حسبِ روایت موجودہ شمارے میں بھی جہاں حمد، نعت، سلام، غزلیں، افسانے، ناول کے ابواب، مضامین اور دیگر اردو اصناف شامل ہیں: وہاں دیگر پاکستانی زبانوں: براہوی، بلوچی، پشتو، پوٹھوہاری، پنجابی، سرائیکی، سندھی، کشمیری اور ہندکو کے ممتاز لکھنے والوں کی نگارشات کے تراجم بھی شامل کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں بین الاقوامی زبانوں سے تراجم بھی اس شمارے کا حصہ ہیں۔

امید ہے حسبِ سابق آپ کو یہ کاوش بھی پسند آئے گی۔ ہمیں آپ کی رائے انتظار رہے گا۔

سید جنید اخلاق

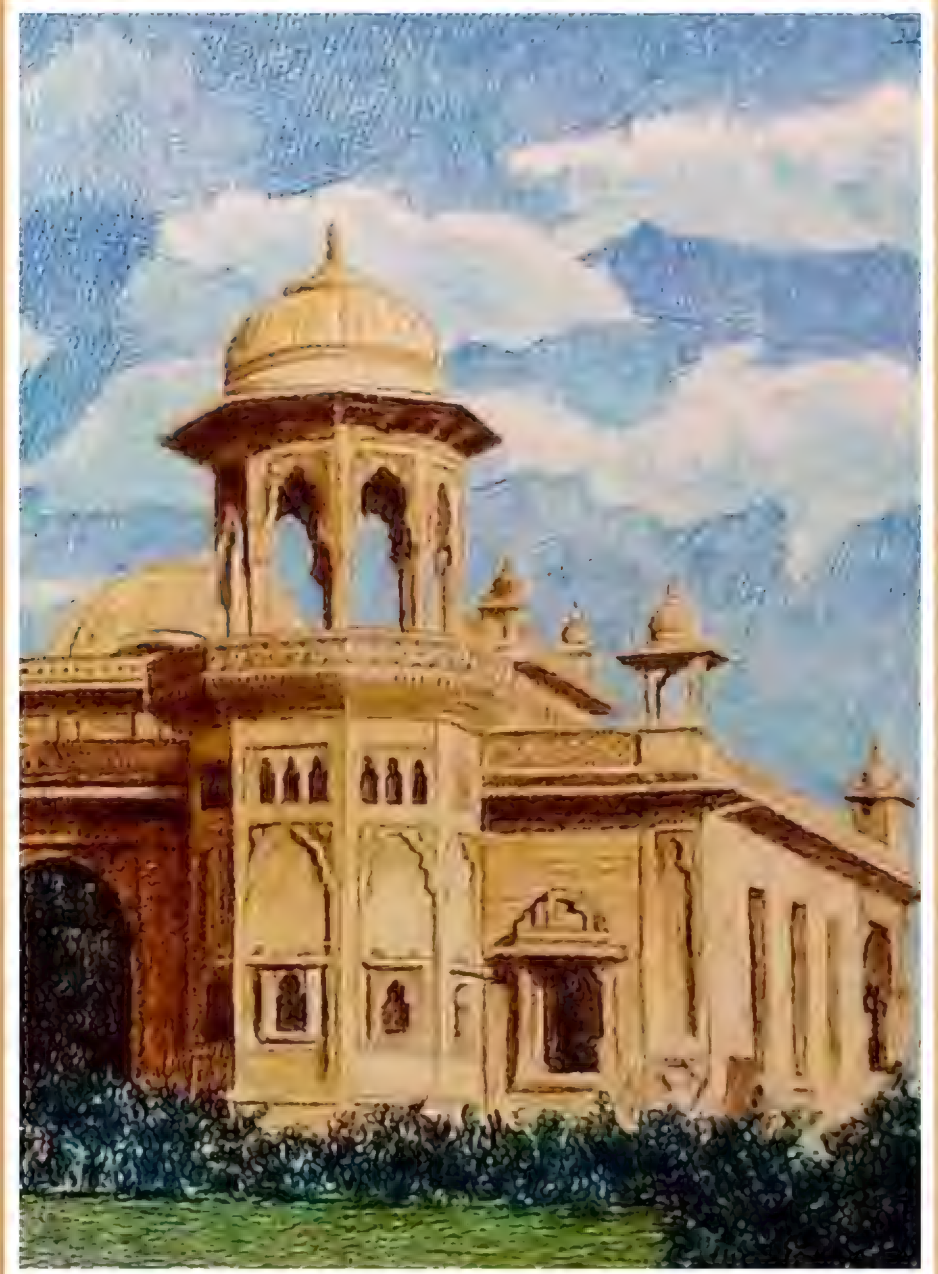

مصرعہ مصرعہ روشنی ہونے لگی ہے چار سُو
(عقیدت)

انجم خلیق

نعت رسولِ مقبول ﷺ

دل میں انجم پھر سے جاگی نعتِ نَو کی آرزو
مصرعہ مصرعہ روشنی ہونے لگی ہے چار سُو
چار سُو سے ماورا سمتوں میں بھی چاروں طرف
آپؐ ہی کا ذکر ہے اور آپؐ ہی کی گفتگو
گفتگو جُزدانِ خاموشی میں ہی لپٹی رہے
لب کشائی کون کر سکتا ہے اُنؐ کے رُوبرو
رُوبرو ہونا ہے جب اُنؐ کے سرِ محشر ہمیں
اے غمِ شبیرؑ تیرے ہاتھ میری آبرو
آبرو بھی آپؐ کی بخشش ہوئی جاگیر ہے
آپؐ ہی چاہیں تو ہیں آباد اس کے کاخ و کُو
کاخ و کُو اُس شہرِ دل آویز کے میں دیکھ لوں
پھر ہوا بے شک اُڑا دے خاک میری کُو بہ کُو
کُو بہ کُو پھر کر زلیخا نے کہا ، ماہِ عربؐ
آپؐ پر ہے ختم میری حسنِ کُل کی جستجو
جستجُو کی شرطِ اول ہے وِلا انجم خلیق
ورنہ اُس گھر کی غلامی کا وثیقہ اور تُو!

☆☆☆☆

محمد عارف قادری

نعت رسولِ مقبول ﷺ

کیا خُوب ترے ذکر سے الحاق ہوا ہے
پُر نُور ہر اک گوشۂ آفاق ہوا ہے
آنکھوں سے جو دل میں اُتر آیا ہے وہ روضہ
راحت کا امیں سینۂ عُشاق ہوا ہے
اِک ذات، کہ ہر رنج میں ٹھہری ہے تسلی
اِک نام، کہ ہر زہر کا تریاق ہوا ہے
ہر خُوبیِ کردار ہوئی جس پہ مکمل
حاصل وہ تجھے جوہرِ اخلاق ہوا ہے
کرنے کے لیے زیست، ترا اُسوۂ کامل
تفویض ہمیں صُورتِ اسباق ہوا ہے
خُود صاف ہوئی نامۂ اعمال کی کالک
جب صلِ علیٰ زینتِ اوراق ہوا ہے
کس شانِ تلطُّف سے، کس اندازِ کرم سے
اللہ تری دید کا مشتاق ہوا ہے
اُمت کو کرے گا نہ سرِ حشر وہ رُسوا
مطلوب سے طالب کا یہ میثاق ہوا ہے
تقسیم ہوئیں حشر میں اسنادِ شفاعت
صد شکر کہ عارفؔ پہ بھی اطلاق ہوا ہے

☆☆☆☆

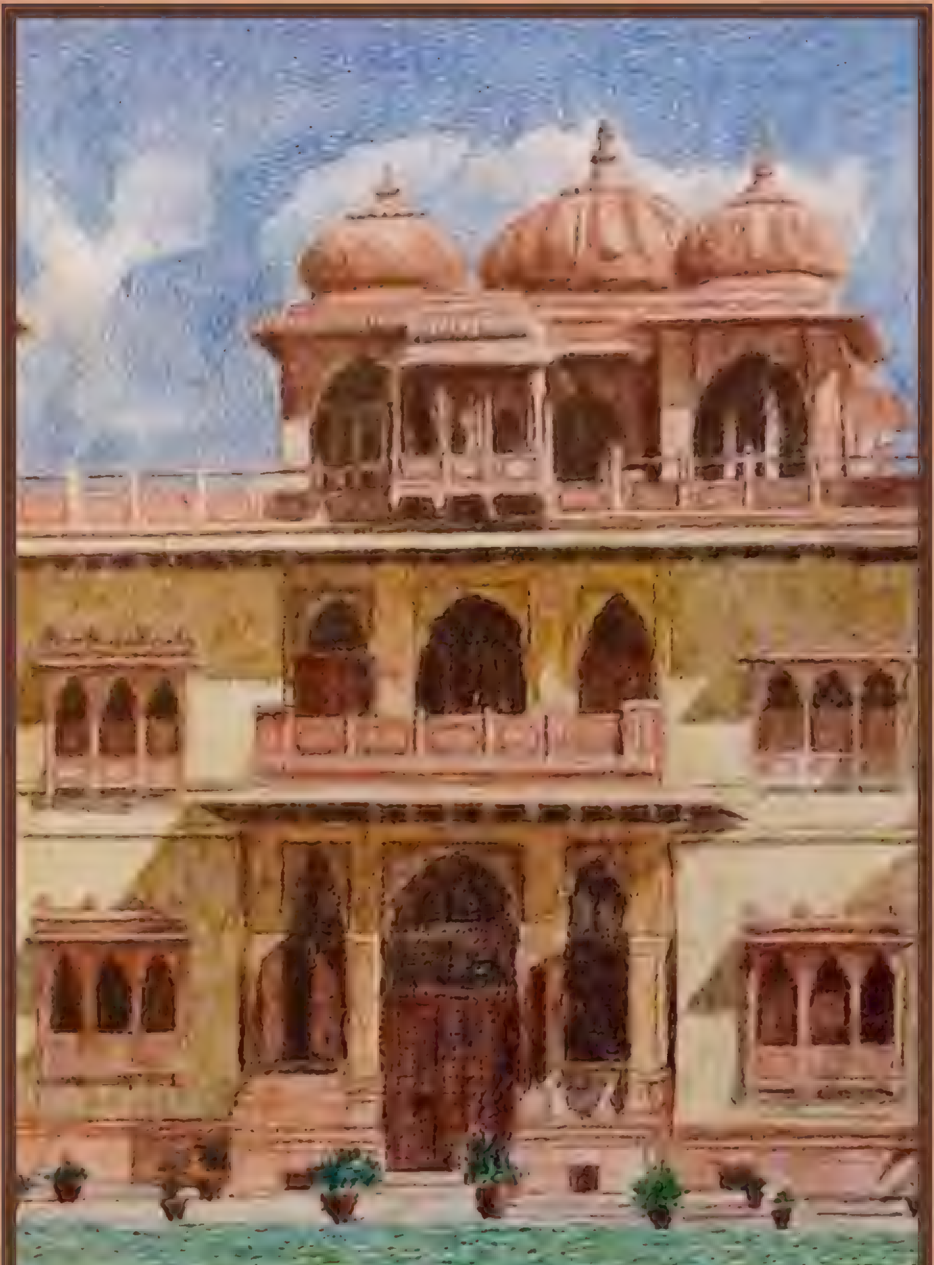

گردِ ملال کسی شعر پر نہ ہو

(غزلیں)

ظفر اقبال

سکوت سا تھا کوئی ہاؤ ہُو کے بیچوں بیچ
طرف اک اور بھی ہے چار سُو کے بیچوں بیچ
میں اپنی راہ نکالوں گا دیکھتے رہنا
تمھارے ساتھ کبھی گفتگو کے بیچوں بیچ
میں پہلی بار جہاں کھُل کے سانس لے رہا تھا
ہوا بھی چل رہی تھی رنگ و بُو کے بیچوں بیچ
سوالِ وصل کی نوبت بھی آنے والی تھی
کسی جھجکتی ہوئی آرزو کے بیچوں بیچ
تمھیں میں سوچ رہا تھا کہ دیکھ بھی رہا تھا
نماز ادا ہوئی تھی جب وضو کے بیچوں بیچ
لرز رہی تھیں عجب اور اجنبی شکلیں
یہ واقعہ بھی ہُوا رُوبرو کے بیچوں بیچ
لڑائی تھی کوئی امکان بھی نہ تھا لیکن
ساری سلح ہوئی دُوبدُو کے بیچوں بیچ
ہجومِ دربدری میں تلاش تھی جس کی
وہ رہتا تھا کہیں کُو بکُو کے بیچوں بیچ
ہمارے پاس تھا جو وہ بھی کھو دیا ہے ظفرؔ
کسی کی الجھن ہوئی جستجو کے بیچوں بیچ

ڈاکٹر توصیف تبسم

کچھ تو تکمیلِ آرزو کیجیے
آنکھ نم ناک، دل لہو کیجیے

خطِ ساغر سے کم نہ ہو بادہ
دلِ ناکام کو سبو کیجیے

ہے یہی زندگی، یہی ہم ہیں
کس طرح ترکِ رنگ و بُو کیجیے

دیکھیے پہلے آنکھ بھر کے اُسے
پھر یہ آئینہ، چار سُو کیجیے

سُنیے ہر ایک کی، پھر اس کے بعد
اپنے لہجے میں گفتگو کیجیے

یہ زمیں کھینچتی ہے اپنی طرف
کیسے اس خاک سے نمو کیجیے

☆☆☆☆

ڈاکٹر خورشید رضوی

سینۂ سنگ میں شرار ہے کیوں
خاک اندر سے لالہ زار ہے کیوں

پیڑ مایوس کیوں نہیں ہوتے
انھیں سودائے برگ و بار ہے کیوں

جھوٹ سچ خود سے کیوں نہیں کھلتے
بات مرہونِ اعتبار ہے کیوں

خواب کو اتنا طول کس نے دیا
عُمر کو اتنا اختصار ہے کیوں

میں اُسے کیوں خزاں میں ڈھونڈتا ہوں
پھول پابستۂ بہار ہے کیوں

اے دلِ زار! ایک عمر کے بعد
آج پھر اتنا بے قرار ہے کیوں

☆☆☆☆

انورشعور

جو گزر رہی ہے بدیس میں وہ تمھیں گھر آ کے بتائیں گے
کوئی حال چشمِ پُر آب سے کوئی مُسکرا کے بتائیں گے

سفرِ حیات کی دھوپ میں ہمیں چھاؤں زُلفِ بُتاں نے دی
ہوئے ہم پہ اکثر و بیشتر جو کرم خدا کے، بتائیں گے

وہ چھپائیں گے نہیں آپ سے، جو ہماری رائے ہے آپ پر
کوئی بات صاف نہ کہہ سکے تو گھما پھرا کے بتائیں گے

کروں اُن سے مَے کا سوال اگر تو ہزار فائدے چارہ گر
کبھی اس دوا کے بتائیں گے، کبھی اُس دوا کے بتائیں گے

سرِ انجمن ہمیں دُور سے نظر آ رہے ہیں وہ حُور سے
یہ قیاس بلکہ یہ واقعہ اُنھیں پاس جا کے بتائیں گے

وہ مزہ جو لال پری میں ہے ابھی کیا بیان کریں بھلا
تمھیں اس چڑیل کی کیفیت کبھی پی پلا کے بتائیں گے

وہ الگ لگے ہے ہجوم میں، کوئی چاند جیسے نجوم میں
اگر اے شعور نقوش ہم رُخِ دِل رُبا کے بتائیں گے

☆☆☆☆

جلیل عالی

عجب اک عکس تھا رقصِ غنا کا
اڑا کر لے گیا جھونکا ہوا کا
رُتوں سے پوچھتی پھرتی ہے خوشبو
اثاثہ تھی کبھی کس خوش قبا کا
کسی خواہش کے خودکش فیصلے سے
بالآخر ہو گیا دل بھی دھماکا
بلاؤں کا بلاوا بھی محبت
محبت ہی مداوا ہر بلا کا
وہ بازارِ طرب کو رو رہے ہیں
لگا ہے کوچۂ دل پہ بھی ناکا
میں اپنی مملکت خود کیوں نہ ڈھونڈوں
رہوں کیوں منتظر سر پہ ہما کا
کہانی جانے کیا صورت نکالے
ابھی تو ابتدائی سا ہے خاکا
طلب ہو تو نکل آتا ہے عالیؔ
سرِ بحرِ فنا رستہ بقا کا

☆☆☆☆

نصرت صدیقی

زخم کی پھول میں شباہت ہے
یہ ترے ہاتھ کی کرامت ہے

دل کا آئینہ صاف کر کے دیکھ
آدمی کتنا خوب صورت ہے

قلتِ آب کو نہ بڑھنے دو
پیاس کی کربلا سے نسبت ہے

اس کا مطلب غلط نہ لینا، مجھے
غور سے دیکھنے کی عادت ہے

پھول ہے پتیوں کے دم سے پھول
کیسی وحدت تاب کثرت ہے

آؤ مل کر کریں شجر کاری
دھوپ میں بے پناہ شدت ہے

☆☆☆☆

عباس رضوی

شب گزشتہ جو بادِ مراد چلنے لگی
تو جیسے روح میں اِک سرخوشی اترنے لگی
گزر گئے وہ شب و روز بے قراری کے
تو زندگی بڑے آرام سے گزرنے لگی
کسی خیال کی شہنائی کیا بجی دل میں
کہ یک بہ یک مرے اندر کی رُت بدلنے لگی
نگاہِ شوق کا جادو تو دیکھتا کوئی
کہ زلفِ یارِ حسیں خود بخود سنورنے لگی
کوئی ستارہ جبیں جب بھی مہربان ہوا
تو روشنی مرے چاروں طرف بکھرنے لگی
بس اِک نظر کا کرشمہ بس اِک خیال کا بیچ
ہمارے بیچ جمی برف سی پگھلنے لگی
وہ لب کشا جو ہوا تھا تو چھا گیا تھا سکوت
وہ چُپ ہوا تو خموشی کلام کرنے لگی
اتر گیا کسی اندھی گپھا میں ہجر کا چاند
تو سرد رات تاسف سے ہاتھ ملنے لگی
کسی کے نام پہ دل بلّیوں اچھلنے لگا
تو کیتلی میں دھری چائے بھی ابلنے لگی

☆☆☆☆

ڈاکٹر سید نواب حیدر نقوی

فلک کی نیم نگاہی سے آشنا ہوں میں
زمیں کی فتنہ گری میں پھنسا ہوا ہوں میں

سکون سینۂ سوزاں کو کس طرح آئے
چراغِ صبح کی صورت لرز رہا ہوں میں

میں مطمئن تھا کہ سایہ کہیں ملے گا مجھے
بدن کو دیکھا تو سارا جلا ہوا ہوں میں

نہ جانے کیسے سکوں دل کو آئے گا آخر
جلے ہیں دوسرے گھر اور بچ گیا ہوں میں

ہر ایک سمت ہیں وہم و گماں کے سناٹے
سرابِ زارِ تمنا میں گِھر گیا ہوں میں

میں جانتا ہوں کہ انجامِ عشق کیا ہوگا
وفا کے نام پہ پھر بھی مِٹا ہوا ہوں میں

مری تلاش میں منزل ہے دربدر راہی
جو دیکھا گردِ سفر میں اَٹا ہوا ہوں میں

☆☆☆☆

محمد حنیف

ریل نے سیٹی بجائی چل پڑی
ہر طرف بادِ جدائی چل پڑی

جس طرف میں نے بنایا راستہ
اس طرف ساری خدائی چل پڑی

رُک گئی تھی اک جگہ گاڑی مری
بس دعا سے میرے بھائی چل پڑی

وسوسوں نے گھیر رکھا دیر تک
یاد آئی نیند اُڑائی چل پڑی

اور پھر میں دیکھتا ہی رہ گیا
وہ مرے نزدیک آئی چل پڑی

☆☆☆☆

نسیم عباسی

عمر بھر کی خود نمائی بے معانی ہو گئی
جس پہ میں تحریر تھا وہ برف پانی ہو گئی

دیکھنے والے کی آنکھوں میں بڑھاپا آ گیا
دیکھتے ہی دیکھتے صورت پرانی ہو گئی

کیا بتائیں کون سا کردار ہم دونوں کا تھا
یہ کہانی ہیر رانجھے کی کہانی ہو گئی

کون ورنہ اس علاقے میں اسے پہچانتا
جگنوؤں سے روشنی کی ترجمانی ہو گئی

اب نہ وہ مہماں نہ وہ مہماں نوازی کا شعور
گھر کی بیٹھک گزرے وقتوں کی نشانی ہو گئی

سلسلہ بندی شجر کی جڑ سے تھی چوٹی تلک
پھول پھل کی ساری خصلت خاندانی ہو گئی

اور کیسا فرق پڑتا اس کے آنے سے نسیم
دل شگفتہ ہو گیا ہے رُت سہانی ہو گئی

☆☆☆☆

طارق نعیم

وہ جو اک شے کہیں پڑی ہوئی تھی
پھر جو دیکھا نہیں پڑی ہوئی تھی

آج مل ہی نہیں رہی ہے دُنیا
کل تلک تو یہیں پڑی ہوئی تھی

سخت مشکل سفر یقین کا تھا
ہر قدم پر نہیں پڑی ہوئی تھی

آسماں تو مرا ہدف نہیں تھا
میرے پیچھے زمیں پڑی ہوئی تھی

تیری تصویر مل گئی ہے مجھے
آئنے میں کہیں پڑی ہوئی تھی

وقت آغاز مجھ سے ہونا تھا
ساعتِ اولیں پڑی ہوئی تھی

میں اُسے دیکھ ہی نہیں پایا
میرے اتنے قریں پڑی ہوئی تھی

☆☆☆☆

نخل میوہ دار تھا اب کچھ نہیں
تجھ سے کتنا پیار تھا اب کچھ نہیں

ایک مدت تک یہاں دریا رہا
پھر یہاں بازار تھا، اب کچھ نہیں

وقت ہوتا ہے میاں ہر کام کا
عشق تھا آزار تھا اب کچھ نہیں

شاہ کو بھی وقت مٹی کر گیا
کل جہاں دربار تھا اب کچھ نہیں

داستان عشق سنتے تھے وہاں
پیڑ سایہ دار تھا اب کچھ نہیں

جل چکا پھر وصل کا سر سبز باغ
شوق تھا دیدار تھا اب کچھ نہیں

تو جو میرے ساتھ تھا میرے لیے
دشت بھی گلزار تھا اب کچھ نہیں

☆☆☆☆

اشرف جاوید

کہانی دیدہ و دل کی زباں پہ لانے میں
مجھے زمانہ لگا ہے یہاں تک آنے میں
ابھی شجر سے سحر کی اذان گونجے گی
ذرا سی دیر ہے چڑیوں کے چہچہانے میں
امیرِ شہر کی جانب کبھی نہیں دیکھا
غنا ملی ہے فقط ہاتھ سے کمانے میں
میں مارا جاؤں گا، اس سے زیادہ کیا ہو گا
ہزیمت اور طرح کی ہے بھاگ جانے میں
کسی کی راہ میں جلتا تو کوئی بات بھی تھی
رکھا ہی کیا ہے لحد پر دیا جلانے میں
خیال تھا! وہ کہے پر یقین کر لے گا
میں پیش و پس میں رہا معجزہ دکھانے میں
نیام سے نکل آئیں تمام تلواریں
مزہ لیا سرِدربار سر اُٹھانے میں
یہ ایک سانحہ کتنے سوال چھوڑ گیا!
پرندہ پایا گیا مردہ آشیانے میں
تمھاری یاد کے ناخن سے زخم تازہ رکھا
وگرنہ کیا نہیں ممکن رہا زمانے میں

☆☆☆☆

اختر عثمان

گُلوں کے نقش سرِ آب دیکھنے کے لیے
ملی تھیں آنکھیں مجھے خواب دیکھنے کے لیے

میں جانتا ہوں کہ محفل میں لوگ آتے ہیں
مرے تنے ہوئے اعصاب دیکھنے کے لیے

میں خود اُتر گیا پانی میں آخری حد تک
لہکتی جھیل کا مہتاب دیکھنے کے لیے

میں ریستوران میں آیا کروں گا بعد از مرگ
یہ اپنا حلقۂ احباب دیکھنے کے لیے

وہ رکھ رکھاؤ عجب تھا کہ خلق آتی تھی
ہمارے ہاں ادب آداب دیکھنے کے لیے

نظر بھی چاہیے اختر، جگر بھی اور دل بھی
کسی کی کِشت کو شاداب دیکھنے کے لیے

☆☆☆☆

ڈاکٹرضیاالحسن

کیا کہوں تم سے کہ کیا موجود ہے
جس طرف دیکھوں ضیا موجود ہے
دوسرا اپنی جگہ کچھ بھی نہیں
ایک میں ہی دوسرا موجود ہے
ایک تو وہ ہے یہاں اور ایک میں
درمیاں اک تیسرا موجود ہے
اور ہی کچھ ہے یہاں موجودگی
جو بھی ہے موجود ناموجود ہے
وہ بھی ہے ، جو ہے ورائے ہست و بود
یعنی وہ بھی ہے جو لاموجود ہے
میں بھٹکتا ہوں میانِ ہست و بود
ایک وہ ہے جو سدا موجود ہے
دوریوں میں ہے کوئی قربت نہاں
قربتوں میں فاصلہ موجود ہے
ہم سمجھتے ہیں خلا جس کو یہاں
اس کے اندر بھی خلا موجود ہے
آنکھ سے تو دیکھنا ممکن نہیں
کیا نہیں موجود کیا موجود ہے
آنکھ بھر کے دیکھیے پھر ہو نہ ہو
جو ابھی اچھا بھلا موجود ہے

خالد معین

اب جو آنکھ میں نم رہتا ہے
پہلے سے کچھ کم رہتا ہے

دل کو حقیر نہ جان، یہاں پر!
اک پورا عالم رہتا ہے

اُس سے اتنا ڈرنا کیسا
جو شعلہ مدھم رہتا ہے

یاد ہمیشہ آتا ہے وہ
ملنا جُلنا کم رہتا ہے

خوشیوں ہی کے پہلو بہ پہلو
کوئی نہ کوئی غم رہتا ہے

قریۂ دل میں شام ڈھلے ہی
ایک عجب ماتم رہتا ہے

☆☆☆☆

ناز مظفر آبادی

حرفِ انکار تک نہیں جاتے
بحث و تکرار تک نہیں جاتے

ہم کہاں سے گواہ لائیں گے
دامنِ تار تک نہیں جاتے

راستے معتبر نہیں ہوتے
جو درِ یار تک نہیں جاتے

آپ کی بات مان لیتے ہیں
قصۂ دار تک نہیں جاتے

دشمنی حوصلے سے کرتے ہیں
آخری وار تک نہیں جاتے

ایک مصرعے سے جان لیتے ہیں
شرح اشعار تک نہیں جاتے

نازؔ درویش طبع آدمی ہیں
شہ کے دربار تک نہیں جاتے

☆☆☆☆

ڈاکٹر نثار ترابی

یوں دیکھنے کو جہاں میں کہاں نہیں ہیں ہم
جہاں پہ ہونا تھا ہم کو وہاں نہیں ہیں ہم

کوئی تو ردِ بلا کا بھی اسم ہاتھ آئے
کہ ایک عمر سے منزل نشاں نہیں ہیں ہم

نمو کی کوئی بشارت ملے خدایا ہمیں
سرابِ دشت ہیں آبِ رواں نہیں ہم

ہے اک فریبِ مسلسل تماشہ گاہوں میں
خبر نہیں ہے کہاں ہیں کہاں نہیں ہیں ہم

ہمارے عہد سے روٹھا ہوا ہے موسمِ گل
خزاں زدہ ہیں پہ ہرگز خزاں نہیں ہیں ہم

ہمارے گھر کے در و بام روز روتے ہیں
شکستہ چھت ہیں پختہ مکاں نہیں ہیں ہم

ہمیں نثار ترابؔی یہیں پہ رہنا ہے
زمیں زادے ہیں جی! آسماں نہیں ہیں ہم

☆☆☆☆

افضل گوہر

ہمارے گھر جو ہمارے قفس بنائے گئے
تو پھر یہ اتنے بڑے شہر کیوں بسائے گئے

گھروں میں پھیلنے والی گھٹن بتاتی ہے
ہوا کے گیت کہیں جنگلوں میں گائے گئے

ہمیں سے بن نہ سکا کوئی دوسرا ہم سا
زمیں سے خاک بھی لی چاک بھی گھمائے گئے

ہمارے خواب کسی پر بھلا کہاں کھلتے
بجھا بجھا کے دیے روشنی میں لائے گئے

زمیں پہ میرے ہی نقشِ قدم نہیں گوہر
یہاں پہ اور بھی کتنے ہی لوگ آئے گئے

☆☆☆☆

افضل مرآد

کبھی خیال نہ آیا مطالبہ کرتے
دیار جبر میں اپنا محاصرہ کرتے

یہ ہار جیت کا منظر بھی سامنے آتا
ذرا سی دیر کو اپنا مقابلہ کرتے

غمِ زمانہ سے فرصت اگر ذرا ملتی
تمھاری یاد سے ملنے کا تجربہ کرتے

ہر ایک اپنے تعلق کا نوحہ گر نکلا
کسی کے ساتھ کہاں تیرا تذکرہ کرتے

ہم آسمان کی وسعت کو ناپتے لیکن
زمین روک رہی تھی محاسبہ کرتے

ہماری تشنہ لبی کو جواز مل جاتا
سیاستِ غمِ دوراں سے مشورہ کرتے

ہمیں انا سے تعلق پہ فخر ہے اتنا
کبھی مرآد کو دیکھا نہیں گلہ کرتے

☆☆☆☆

احمد فرید

اسم پڑھا اور جسم سے اُٹھ کر عشق اٹھایا
دل درویش نے مست قلندر عشق اٹھایا
فرش پہ عرش کے بعد مکرر عشق اٹھایا
روح نے اب کہ جسم کے اندر عشق اٹھایا
شاعر، صوفی، فلسفہ دان، ولی، پیغمبر
سب نے اپنے ظرف برابر عشق اٹھایا
نیند سے جاگے سر پر دنیاداری ڈھوئی
آنکھ لگی اور خوب کے اندر عشق اٹھایا
سچا، جھوٹا، خام، حقیقی اور مجازی
لیکن ہم نے سب سے بہتر عشق اٹھایا
اس کو عشق خود آپ اٹھا کر لے گیا آگے
جس نے ہمت کی اور بڑھ کر عشق اٹھایا
حضرتِ قیس نے خود آکر گٹھڑی اٹھوائی
میں نے جب اپنے کاندھوں پر عشق اٹھایا
جس دن سب اپنے ہاتھوں میں نامے لائے
ہم نے تو اس دن بھی سر پر عشق اٹھایا
ایک بدن دو جسم ہوا تھا جس خواہش پر
اس خواہش نے پیکر پیکر عشق اٹھایا
یہ دیوانگی دیوانے پن سے نہیں آئی
ہم نے احمد سوچ سمجھ کر عشق اٹھایا

خورشید ربانی

چشمِ یقیں سے دیکھیے وہم و گماں آئینہ ہے
روشن ہے کوئی عکسِ گل ورنہ کہاں آئینہ ہے

دریا کی اتنی کج روی ساحل کی اتنی بے رخی
تم پر کوئی رنگِ ہوا اے بادباں آئینہ ہے؟

دیکھا ہے جس نے رات کا پردہ اٹھا کے دن کبھی
اُس پر یقیں آئینہ ہے اُس پر گماں آئینہ ہے

سنتا ہے کوئی کب یہاں دریا کا شورِ خامشی
لیکن ہمارے دل پہ تو موجِ رواں آئینہ ہے

کس کا ہدف ہے میرا دل کس کا ہدف ہے میری جاں
مجھ کو خبر ہے تیر کی مجھ پر کماں آئینہ ہے

خیمے جلے ہیں کس طرح روزن بجھے ہیں کس طرح
تم پر چراغِ دوجہاں آگ اور دھواں آئینہ ہے

مہکا ہوا ہے کس قدر قریہ ہمارے خواب کا
شاخِ مکاں آئینہ ہے ، باغِ زماں آئینہ ہے

☆☆☆☆

مسعود صدیقی

بُجھا کے رقص کیا رات بھر چراغ کی لو
جلی ہے دیکھیے اس بات پر چراغ کی لو

یہ میرا عکس گریزاں ہے کس لیے مجھ سے
ہے جب چراغ کے نزدیک تر چراغ کی لو

مجھے پتا نہیں چلتا کہ کون کون ہے ساتھ
شبِ بلا میں نہ گُل ہو اگر چراغ کی لو

وہاں کے لوگ تھے ترسے ہوئے اندھیرے کو
میں رُک گیا تھا جہاں دیکھ کر چراغ کی لو

اُسے ہَوا نہیں ، دُوری بُجھانے والی ہے
مجھے جو لگنے لگی ہے شرر چراغ کی لو

گزارا کرنا پڑا رات کی طوالت پر
میں کر سکا نہ بڑی کھینچ کر چراغ کی لو

☆☆☆☆

اشفاق عامر

دھوپ اس چشمِ تمنا کی جہاں سے گزرے
روز اک خواب کا سایہ سا وہاں سے گزرے

پھول کے رنگ مری سوچ سے گہرے نکلے
کتنے چپ چاپ شبِ عہدِ خزاں سے گزرے

سلسلہ پھیل گیا دل میں بھی دیواروں کا
کوئی اس دشت میں آئے تو کہاں سے گزرے

اک ہوا ہے کہ مہکتی ہے گزر جاتی ہے
کون ہے ورنہ جو اس مقتلِ جاں سے گزرے

کوئی وعدہ ہی نہیں دامنِ دل میں عامؔر
کس سے ملنے کی لگن اشکِ تپاں سے گزرے

☆☆☆☆

سحرتاب رومانی

تُو مری زندگی نہیں تھا
مسئلہ اک یہی نہیں تھا

کچھ وہاں واقعی تھا لیکن
کچھ وہاں واقعی نہیں تھا

سب مناظر بدل رہے تھے
اور میں بھی وہی نہیں تھا

یار جادوئی اس نگر میں
کیا کوئی سامری نہیں تھا

وہ امامِ زمانہ، ہوگا
میں مگر مقتدی نہیں تھا

سوچنا چاہیے جو مجھ کو
سوچتا میں وہی نہیں تھا

میں سحرؔ چاہتا تھا جیسے
ویسا ہوتا کبھی نہیں تھا

☆☆☆☆

مظہر حسین سید

یہ تجربہ بھی عداوت میں کچھ نیا نہیں تھا
وہ لفظ اس نے سنا میں نے جو کہا نہیں تھا

مجھے خبر تھی کہ یہ بات پھیل جائے گی
میں اس لیے تیرے بارے میں سوچتا نہیں تھا

قلم ہوئے ہیں مرے ہاتھ ورنہ دنیا کو
نئے سرے سے بنانا بھی مسئلہ نہیں تھا

میں پہلا شخص ہوں جو اس جگہ سے گزرا ہوں
یقین کر کہ یہاں کوئی راستا نہیں تھا

سبھی کو عزّت و شہرت کی بھوک لے ڈوبی
سُخن میں خوف تھا لہجے میں دبدبہ نہیں تھا

عجیب لوگ تھے مُردوں سے بات کرتے تھے
جو مر رہے تھے انھیں کوئی پوچھتا نہیں تھا

تمھارے ساتھ تو ہر مرحلے پہ ہم بھی تھے
ہمیں بھی دیکھ، کسی کا بھی آسرا نہیں تھا

☆☆☆☆

سرفراز زاہد

اگر مل جائے دل کا ایک کونا
سکھا دوں میں تجھے پلکیں بھگونا

ہما نامی پرندہ چاہتا ہے
مری جیومیٹری میں قید ہونا

اُٹھا کر رکھ دیا دھڑکن کے نزدیک
کسی نے مسکراہٹ کا کھلونا

ہماری کارٹونی خواہشوں پر
چلو سنجیدگی اب ہنس پڑو نا!

میں اپنے خواب اٹھا کر بھاگ آیا
بہت ویران تھا جنت کا کونا

☆☆☆☆

عنبرین صلاح الدین

کس جگہ ہم پہ پہرا نہیں ہے بہن
کیا زمیں قید خانہ نہیں ہے بہن
کون دہلیز لچھمن کی ریکھا نہیں
کس کہانی میں سیتا نہیں ہے بہن
اُس کی لکھی کہانی سے باہر نکل
ورنہ انجام اچھا نہیں ہے بہن
تیرے چہرے کو تکتا ہوا آدمی
کیوں تری بات سُنتا نہیں ہے بہن
تیری قسمت میں ہے ریت ہی ریت اور
پار بھی کوئی دریا نہیں ہے بہن
تیری خود سے شناسائی کیسے نہیں
تیرا خود سے تو پردہ نہیں ہے بہن
آدھی دنیا کا چہرہ بھی خوف ہے
جھوٹ کا کوئی چہرہ نہیں ہے بہن
جو ترے خواب کو راستہ دے سکے
ایسا کوئی دریچہ نہیں ہے بہن
یہ محل، رسم دنیا کا اونچا محل
آسماں سے تو اونچا نہیں ہے بہن

☆☆☆☆

احمد فرہاد

گرد گل ملال کسی شعر پہ نہ ہو
یہ کیا کہ دل کے خون سے بھی لفظ تر نہ ہو

تو آئے باغ میں تو ترے احترام میں
واجب ہے کوئی پھول کسی شاخ پہ نہ ہو

کیا لفظ جس کی چوٹ سے بچ جائے قصر ہجر
کیا شعر جس سے غم کا ہمالہ بھی سر نہ ہو

اک ہجر جس میں مہکا رہے لمس کا کنول
اک وصل جس میں قرب کا کوئی گزر نہ ہو

اک زہر مستقل جو رگوں میں رواں رہے
اک شخص جس کے چھوڑ کے جانے کا ڈر نہ ہو

یہ کیا کہ سانس سانس اذیت بنی رہے
یہ کیا کہ ایک عمر ہو وہ بھی بسر نہ ہو

یہ کیا کہ بے ثمر ہی رہے درد کا شجر
یہ کیا کہ خون تھوکیے لیکن اثر نہ ہو

☆☆☆☆

محمد انیس انصاری

اُسی کی گود میں پلے بڑھے ہو
آج جسے پاگل کہتے ہو

کہاں گئی برسوں کی کمائی
اب بھی وہیں کے وہیں کھڑے ہو

کون ہے اس دیوار کے پیچھے
کس کی بولی بول رہے ہو

سب پیسے کا کھیل ہے بابا!
باتیں کرنا سیکھ گئے ہو

جلد حقیقت کھل جائے گی
کن ہاتھوں میں کھیل رہے ہو

آنکھیں بھی ہنستی ہیں تمھاری
ہنستے ہوئے اچھے لگتے ہو

جانِ انیس! ذرا ٹھہرو تو
اتنی جلدی کہاں چلے ہو

☆☆☆☆

عبیدالرحمن

کسی کے پاؤں کی رگڑ سے آگ سی لگی تو تھی، کدھر گئی
نظر تو آئی تھی مجھے ذرا سی دیر روشنی، کدھر گئی

میں اس کے لفظ لفظ کی بناوٹوں میں گم تھا جب ہوا چلی
جو میرے دل کی میز پر کتاب تھی کھلی ہوئی، کدھر گئی

بس ایک موڑ کیا کٹا کہ واپسی کا راستہ ہی کھو گیا
میں ڈھونڈ ڈھونڈ تھک گیا یہیں تو تھی مری گلی، کدھر گئی

میں بھول آیا ہوں کہیں کہ چھین لے گیا کوئی، خبر نہیں
جو میں نے رب سے پائی تھی مرے نصیب کی خوشی، کدھر گئی

اداسیوں کے دشت نے تھکا دیا، بجھا دیا، سلا دیا
وہ میری آنکھ میں جو تھی سمندروں سی تازگی، کدھر گئی

☆☆☆☆

سید شمس الدین شمس گیلانی

ہر خوشی ہر ہنسی اُداسی ہے
زندگی میں سبھی اُداسی ہے

اک تو غم ہے تری جُدائی کا
اور پھر شام کی اُداسی ہے

اشک آنکھوں سے کر گئے ہجرت
اور جو رہ گئی اُداسی ہے

گھر کے چُپ ہیں سبھی دَر و دیوار
اک فقط بولتی اُداسی ہے

مجھ پہ بیتا ہوا ہے موسمِ ہجر
میں نے دیکھی ہوئی اُداسی ہے

داغِ دل ہے چراغ سا یا پھر
طاق پر جل رہی اُداسی ہے

مجھ پہ اُتری ہوئی ہے آیتِ غم
مجھے سونپی گئی اُداسی ہے

کیسا ہے شورِ سیلِ اشکِ رواں؟
کیسی چُپ چاپ سی اُداسی ہے

آج سچ میں ہے، شمس دل کو ملال
آج تو واقعی اُداسی ہے

ضیا شاہد

میں پہلی بار جب تم سے ملا تھا
میں اپنے آپ کو بھولا ہوا تھا

کنارے دو تھے جیسے ہم ندی کے
ہمارے درمیاں اک فاصلہ تھا

ہوا کی سازشوں سے بجھ گیا وہ
دیا جو میرے گھر میں جل رہا تھا

وہ کہتا تھا ستارے توڑنے کو
مجھے روٹی کا اپنی سوچنا تھا

جسے بچپن سے تھی چندا کی خواہش
وہ بچہ جان میری کھا رہا تھا

☆☆☆☆

فرح گوندل

کب سے ہے چشم و خواب میں جھگڑا پڑا ہوا
تھا میرے اندروں کوئی رخنہ پڑا ہوا

تخریب سازِ حسن تھا یہ عشق بد حواس
وہ دیکھ دور تک مرا ملبہ پڑا ہوا

تو نے کہا نا تھا کہ میں اک دکھ کی مار ہوں
رکھا ہے تیرے سامنے دعوی پڑا ہوا

دامان خوش پہ خون کے چھینٹے گواہ ہیں
نوک سناں پہ رکھا ہے رشتہ پڑا ہوا

ڈھونڈا کیے ہیں ہاتھ پہ رکھے چراغ شب
اک طاقچے کے پیچھے اجالا پڑا ہوا

ننھے شجر پہ دھوپ نے ڈیرہ جما لیا
کونے میں دب کے رہ گیا سایہ پڑا ہوا

اک شاخ ہجر ڈھل گئی غم کی اٹھان سے
اور نخلِ وصل زار ہے دھندلا پڑا ہوا

☆☆☆☆

بلقیس خان

کسی کی سنی نہیں ہے اگر مگر میں نے
جواب دینا ہے ڈنکے کی چوٹ پر میں نے
ابھی سے سائے میں جا کے نگوڑا بیٹھ گیا
ابھی تو دل کو لگایا تھا کام پر میں نے
تری نظر میں تو یہ سرسری سی کوشش تھی
مجھے پتا ہے، بنایا ہے کیسے گھر میں نے
پھر ایک عمر سزا کاٹنی پڑی مجھ کو
نظر ملائی تھی سورج سے لحہ بھر میں نے
وہاں وہاں پہ محبت کا نقش دیکھیے گا
زمیں پہ پاؤں دھرا ہے جدھر جدھر میں نے
سخن وری تو جدا ایک ذمہ داری ہے
میں سوچتی ہوں لیا کیوں یہ دردِ سر میں نے
بھگت رہی ہوں نئی زندگی کا خمیازہ
کہ اپنے ہاتھوں سے کاٹے ہیں اپنے پر میں نے
میرے لیے تو یہ سایہ بھی دھوپ ہے بلقیس
تلاش جس کو کیا تھا شجر شجر میں نے

☆☆☆☆

فرح جعفری

وہ میرا ہو نہ سکا، میری جان ہو کے بھی
میں بے مکان تھی، اپنا مکان ہو کے بھی

تمام عمر کٹی تیز دُھوپ میں میری
میں سایہ پا نہ سکی، سائبان ہو کے بھی

مقابلہ تھا مرا زلزلوں سے، طوفاں سے
میں ٹوٹ پھوٹ گئی، اک چٹان ہو کے بھی

مدد کو میری نہ آگے بڑھا کوئی میرا
میں بے امان رہی، خاندان ہو کے بھی

لکھا گیا تھا مجھے پتھروں کے سینے پر
میں بے نشاں نہ ہوئی، بے نشان ہو کے بھی

نصاب زیست میں مضمون اختیاری تھا
کہ میں پڑھی نہ گئی، داستان ہو کے بھی

فرحؔ طویل سفر کا، عجیب قصہ ہے
کہ ہم نے بات نہ کی، ہم زبان ہو کے بھی

☆☆☆☆

ذیشان مرتضیٰ

حرفِ بے صوت و بے صدا ہوں میں
اپنی آواز سُن رہا ہوں میں
ایک بیوہ کی آنکھ کا دُکھ ہوں
ایک مفلس کا بچپنا ہوں میں
کوئی تصویر سے نکالے مجھے
کتنا سہما ہوا کھڑا ہوا ہوں میں
شور کے بحرِ بیکراں میں دوست
ایک دم توڑتی صدا ہوں میں
تُو محبت کا اک صحیفہ ہے
جس کا منظوم ترجمہ ہوں میں
خامشی ترجمان ہے میری
ایک متروک قہقہہ ہوں میں
ایسا ٹُوٹا ہوں جڑ نہ پاؤں گا
تم تو کہتے تھے دیر پا ہوں میں
جانے کس کی تلاش میں ذیشان
آئینوں میں بھٹک رہا ہوں میں

☆☆☆☆

اسامہ امیر

جینے کو حیرانی پیدا کرتا ہوں
خاموشی سے معنی پیدا کرتا ہوں

تم کو کیا معلوم کہ کتنی مشکل سے
تھوڑی سی آسانی پیدا کرتا ہوں

شام ڈھلے میں ساحل پہ جاتا ہوں اور
موجوں میں طغیانی پیدا کرتا ہوں

اکثر شعر کو ڈھکتا ہوں میں لفظوں سے
کبھی کبھی عریانی پیدا کرتا ہوں

تیرے بدن پہ ملنے کو کچھ دھوپ کے ساتھ
مٹی ریگستانی پیدا کرتا ہوں

رکھتا ہوں چوپال سجائے گلیوں میں
گھر اندر ویرانی پیدا کرتا ہوں

رات سرہانے دیپ جلاتا ہوں اپنے
خوابوں میں ارزانی پیدا کرتا ہوں

☆☆☆☆

ندرت الٰہی

یوں ہوئیں آنکھیں چار بسم اللہ
ہو گئے ہم شکار بسم اللہ
دل سنبھالوں یا تھاموں دھڑکن کو
اس نے بھیجا ہے تار بسم اللہ
بس مرا نام لے کے خلوت میں
کبھی دل سے پکار بسم اللہ
ان کی گلیوں میں پھول مہکے ہیں
میری قسمت میں خار بسم اللہ
ہم نے تو عشق میں یہی سیکھا
''جس طرح کہ دے یار بسم اللہ''
تجھ کو پانے کی جستجو میں صنم
دل بھی بیٹھیں ہیں ہار بسم اللہ
حالتِ دل بیان کر نہ سکا
تیرا عرضی گزار بسم اللہ
غیر سے تیری دوستی ندرت
ہم پہ رہ رہ کے وار بسم اللہ

☆☆☆☆

بابر ظہراب

سفر کی ظلمتوں میں یہ ستارا چاہیے مجھ کو
ابھی تیری محبت کا سہارا چاہیے مجھ کو

کوئی برسات کا بادل یہاں بارِ دگر آئے
دھنک جیسا کوئی لمحہ دوبارہ چاہیے مجھ کو

تری خواہش کے آنگن میں ہو میرے پیار کی چھایا
مکمل اس حویلی پر اجارہ چاہیے مجھ کو

ابھی تو اِک ستارے پر قدم میں نے جمائے ہیں
ابھی تو آسماں سارے کا سارا چاہیے مجھ کو

ابھی ظہراب اُس کو دیکھتا ہے چشمِ حیرت سے
ابھی دریائے حیرت کا کنارا چاہیے مجھ کو

☆☆☆☆

نظم خطوں میں لکھی ہوئی محبت تھی

(نظمیں)

آفتاب اقبال شمیم

پھر ملیں گے

میں بُھلا دوں اُسے
پر مری دسترس
میرے بس میں نہیں
ایک پیکر سا آنکھوں کی
دہلیز پر
آ کے رُکتا ہے
لگتا ہے جانے کی جلدی میں ہے
میں اُسے روکتا ہوں
مگر یوں لگے
جیسے وہ میری آواز سنتا نہیں
اور شاید وہ اب
مجھ کو پہچانتا بھی نہیں!

وقت کی یہ تماشا گری
وقت خود دیکھتا ہے
مگر کیا پتہ
وہ بڑے وقت کے

دائرہ وار چلنے کے فرمان
میں جل رہا ہو
ہمیں کیا پتہ
وقت ۔۔۔۔ ہم جس کی صدیوں میں
پیمائش کرتے رہے ہیں
لاوقت کے ایک دو پل کا حصہ ہو
اور کیا یہ بڑا ایک
مژدہ نہیں
چند برسوں کی تاخیر درپیش ہے
دیکھنا ایک دن
یہ جو لاوقت ہے
اس میں ملنا
ہمارے مقدر میں ہے!

☆☆☆☆

ناصر زیدی

تین مصرعوں کی نظمیں

وہ مرے سامنے ہے بیٹھی ہوئی!
نین نقش دل میں یُوں اُترتے ہیں
جیسے آہو خرام کرتے ہیں

تیری فرقت میں دل نشیں چہرے
میں عموماً زیادہ دیکھتا ہوں
میری جاں! بے ارادہ دیکھتا ہوں

تیری سانسوں کی خوشبوؤں میں بسے
لفظ و معنی میں ڈوب جاتا ہوں
تجھ کو جاں سے عزیز پاتا ہوں

کتنی لذت ہے تیری باتوں میں
ذائقہ رُوح میں اُترتا ہے
جسم اندر سے رقص کرتا ہے

اپنی تصویر بھیج کر اُس نے
مستقل اپنے ہی تصوّر میں
قید رکھنے کا مجھ کو سوچا ہے

☆☆☆☆

نصیر احمد ناصر

نظم ایک عورت کا پرس ہے

نظم خطوں میں لکھی ہوئی محبت تھی
جسے دیمک کھا گئی
نظم بادلوں کا درخت تھی
اور بارش کا پھول
جسے ہوا لے اُڑی
نظم ایک لڑکی کے ہاتھ کا لمس تھی
جسے ایک شاعر نے چھو لیا
اور وہ پرندہ بن گئی
نظم اے ٹی ایم سے نکلی ہوئی رقم تھی
جسے ایک عورت کا پرس کھا گیا

☆☆☆☆

علی محمد فرشی

مشینہ (۳)

مشینہ!
مشینہ!
گہے آسمینہ! گہے آس مینہ!
زمانہ ہے، دیوانہ پا رقص کرتا، دھمکتا، دھڑپتا ہوا
تیرے چوگرد شہزادے، جوکر بنے، ناچتے ہیں
کہ جیسے قیامت کے سائے پلکتے جھپکتے
چھلاچھل جلاجل بجاتے
گزرتے ہیں
شیشے تڑختے ہیں
مے زندگی کی چھلکتی، چھلکتی ہوئی
تیرے قدموں پہ گرتی ہے
تو یوں قہقہہ تُو لگاتی ہے
کہ جیسے زمیں پھٹ کے ٹکڑوں تقسیم ہونے لگے
یا پہاڑوں پہ الٹیں پہاڑ
اور آندھی جو جنگل کے جنگل اُڑاتی چلی جا رہی ہو

تاریخ!
دیوانی! تو کیوں سسکتی ہے
میلے میں آئی ہے
محمل سے نیچے قدم رکھ

یہ "شولیٹ"(۱) تجھے تین صدیوں کے سارے تماشے
فقط تین منٹوں میں پورے کے پورے دکھا دے گی
اک ثانیے میں
تجھے ہیروشیما کی بربادیاں یوں لگیں گی
کہ جیسے حلوق (۲) قدم اپنا رکھ دے
کروڑوں بلکتی ہوئی ننھی جانوں پہ

دو ایسی لمبی لڑائیاں بھی دیکھے گی تو جو گزشتہ صدی بیچ
یورپ کے بندر لڑے تھے
تو ہٹلر کے بوٹوں تلے
پورا عالم سسکتا تھا
چرچل تڑپتا تھا جیسے مگرمچھ
آنسو بہاتا ہے، معصوم روحیں چباتا ہے جب چپ
یہ امریکی، روسی تجھے آدمیت ہڑپتے ملیں گے
غلامی میں انساں تڑپتے ملیں گے

تماشا ہے
ڈر مت! اگر راجی کرے گی تو
آگے بڑھے گی
ابھی اور آگے بھی سرکس بہت ہیں
جہاں آج کا آدمی اپنی انگلی پہ خود ناچتا ہے
اٹھائے ہوئے اپنے جیون کا لاشہ
بناتے ہوئے اپنی میت کی سیلفی
☆☆☆☆

---

(۱) Conceit: A type of time travelling machine
(۲) داستان ''آرائش محفل'' کا ایک عفریت

عزیز اعجاز

کبھی ہمارا خیال آئے

کبھی ہمارا خیال آئے
تو پھول زلفوں میں ٹانک لینا
مہکتے گجروں سے
اپنی سونی کلائیوں کو
سنوار لینا
گھنیری زلفوں میں
موتیے کی لڑی سجا کر
حسین آنکھوں میں
دھار کجرے کی ڈال لینا
گلاب عارض پہ خال رکھنا
لبوں کی شوخی بحال رکھنا
کبھی ہمارا خیال آئے
تو روبرو آئینے کو رکھ کر
تم اپنی آنکھوں میں جھانک لینا
اگر حیا آئینے سے آئے
تو جان لینا
کسی کی آنکھیں
تمھارے چہرے کو تک رہی ہیں

کوئی تمھارے حسیں تصور میں
کھو گیا ہے
کبھی ہمارا خیال آئے
تو کینوس پر
بکھرتے رنگوں سے
کوئی تصویر
بنتے بنتے نہ بن سکے تو
اسے ادھورا ہی چھوڑ دینا
ادھوری تصویر اور تقدیر میں
پرانی مماثلت ہے
کبھی ہمارا خیال آئے
تو ریگِ ساحل پہ پا برہنہ
خرام کرتے ہوئے، ہوائیں
تمھارے بالوں میں سرسرائیں
تو ان کی سرگوشیوں کو سننا
وہ بھولی بسری کوئی کہانی
تمھیں سُنا کر اُداس کر دیں
تو سر جھٹک کر
تم اُس کہانی کو بھول جانا
کبھی ہمارا خیال آئے
تو تیز بارش میں
ایک سُونی سڑک پہ چل کر

کہیں بہت دُور جا نکلنا
اگر کوئی ساتھ چل رہا ہو
تو جان لینا
وہ کون ہوگا
کوئی تو ہوگا
جو ایک ایسی ہی
تیز بارش کی شام
تم سے بچھڑ گیا تھا
تو پھر قدم سے قدم ملائے
یہ کون ہے جو
تمھارے ہمراہ چل رہا ہے
کوئی نہیں ہے
کوئی نہیں ہے۔۔۔۔
کہ وہ تو خواب و خیال ہو کر
کہیں بہت دُور جا چکا ہے
یہ وہم دل سے نکال دینا
کبھی ہمارا خیال آئے
کبھی ہمارا خیال آئے۔۔۔۔

☆☆☆☆

طاہر شیرازی

عجب خاں

عجب خاں جو مصور ہے
عجب خاں وہ مصور ہے
بہت سے گمشدہ دریا ہیں
جن کے پانیوں کے کھوج میں
معلوم صحراؤں کی جانب جانکلتا ہے

عجب خاں
جب شبینہ کینوس پر
منتشر کرتا ہے رنگوں کو
سنا ہے چاندنی اس دم نچھاور ہوتی جاتی ہے

کہیں پانی کہیں کائی
کوئی کشتی کوئی راہی
سب اُس کے ساتھ ہوتے ہیں
عجب کی سوچتی آنکھوں میں جب دن رات ہوتے ہیں

وہ ست رنگی کمانوں کا
جہانوں کا مصور ہے

وہ خوشبو کو گلابوں سے بھی پہلے
دودھیا کاغذ پہ جب تخلیق کرتا ہے
کمالِ فیض کی تصدیق کرتا ہے

وہ جب ویرانیاں
حیرت کدوں میں ڈھال دیتا ہے
وہ جب منظر بناتا ہے
اگر وہ گھر بناتا ہے
تو اندر کی طرف کھلتے ہوئے کچھ در بناتا ہے
پرانی بے تمازت کھڑکیوں میں رنگ بھرتا ہے
تو جیسے اپنے سارے خواب وہ تصویر کرتا ہے

بہت اوجھل ہوئے جاتے زمانوں کو وہ دل آویز کرتا ہے
عجب خاں اپنی تنہائی کو رنگ آمیز کرتا ہے

☆☆☆☆

عاطف علیم

میں اکیلی نہیں

جب اکیلی تھی میں درد کے شہر میں
دکھ کی آغوش میں ظلم کے قہر میں
روح گھائل تھی میری بدن نیلگوں
میں بھٹکتی رہی درد کی لہر میں
تب اکیلی تھی میں، اک پہیلی تھی میں

چپ کی سولی کے سائے میں لرزاں رہی
تن کی تہمت لیے بے اماں میں رہی
جبر کے ضابطے سب تھے میرے لیے
ناتواں میں رہی، بے زباں میں رہی
تب اکیلی تھی میں، اک پہیلی تھی میں

اور پھر میں نے توڑا حصار بدن
میں کہ بکھری ہوئی تھی چمن درچمن
میں نے اثبات اپنا کیا جب سکھی
میں جوالا بنی سر بسر تن بہ تن
تب اکیلی تھی میں، اک پہیلی تھی میں

حرف انکار مچلا تو میں تن گئی
جبر کے موسموں سے مری ٹھن گئی
اپنے تن پر اجالے سجائے ہوئے
میں کہ سورج کی پہلی کرن بن گئی
میں نئے عہد نامے کا عنواں بنی
میں اکیلی نہیں اب اکیلی نہیں

☆☆☆☆

عبید بازغ امر

تیسری دنیا کا پیغامِ امن

تمدن آفریں لوگو!
زمیں تم جس پہ امن و آشتی کے گیت گاتے ہو
اُسی کے تیسرے درجے میں ہم ناچار رہتے ہیں
جو دکھ کا بیج بوتے، درد کی فصلیں اُگاتے ہیں
دھویں میں، خون میں، آتش میں بودوباش کرتے ہیں
تمھیں آقا سمجھتے ہیں
بسر آزادیِ مبہم میں دن اور رات کرتے ہیں!

کسی بھونچال میں
پت جھڑ میں
یا پھر
سیلِ گریہ میں
تمھیں ہم یاد کرتے ہیں!

تمھاری ہی مدد کی آس میں ہم سانس لیتے ہیں
تمھارے ہر کرم پر ہم بہت ممنون رہتے ہیں!

ہمارے مہربانو
امنِ عالم کے نگہبانو!

جہاں ہم ہیں
وہاں سرمایہ ومحنت کی مہلک جنگ جاری ہے
ہر اک شے میں ملاوٹ ہے
مساوات وسماجی عدل کو انساں ترستے ہیں
یہاں معصوم بچے خوف کے عالم میں پلتے ہیں!

دھماکوں اور جھگڑوں میں
فسادِ نسل ومذہب میں
یہ بہتا خونِ انسانی
ہمارے اپنے اندر کے چھپے دشمن کی سازش ہے!

یہ ہتھیاروں کے تاجر، امن عالم کے یہ سوداگر
یہ دولت کے لیے
لوگوں کو آپس میں لڑاتے ہیں
خزانے قوم کے تخریب کاری پر لٹاتے ہیں!

ہمارے ناخداؤ!
تم ہماری کشتیِ جاں کو بھلا کب تک بچاؤ گے
ہمیں خود اپنی ہمت سے یہ دریا پار کرنا ہے۔
نظامِ تیرہ وتاریک سے باہر نکلنا ہے
ہمیں ان مرگ زاروں میں
سلگتی زندگی کی ٹمٹماتی لو بچانی ہے
نئی دنیا بسانی ہے!

چلو آؤ
نصابوں میں رکھی نفرت کو الفت میں بدلتے ہیں
غلط تفسیر کو
تاریخ کے جھوٹے پلندوں کو
ہم آتش میں جلاتے ہیں
نیا دستور لکھتے ہیں
نیا آئیں بناتے ہیں!

یہ کیا ہر ایک منظر پر فقط اک رنگ چھایا ہو
یہ کیا اب ایک ہی گل کا گلستاں پر اجارہ ہو
ہمیں ہر باغ سے ہر رنگ کا اک پھول چننا ہے
انھیں رنگوں سے ہم کو ایک گلدستہ بنانا ہے
ہمیں مالا بنانی ہے ہمیں موتی پرونے ہیں
تمھارے اور اپنے بیچ کی دوری مٹانی ہے!

یقیں رکھو کہ ہم اک دن
بلندی اور پستی کی مسافت جھیل کر
ملنے تمھارے پاس آئیں گے
محبت سے تمھیں اپنے برابر میں بٹھائیں گے
کیے ہیں تم نے جو ہم پر
وہ احساں سب اُتاریں گے!!

☆ ☆ ☆ ☆

نینا عادل

محبت میں

محبت میں عبادت کے لیے مخصوص ہے ساعت
مگن
مبہوت
اور مجذوب اک ساعت
ارادہ بے ارادہ آنسوؤں سے غسل کرنے کی
کسی اک نام کی تسبیح لاکھوں بار پڑھنے کی
سراپا ہُوک ہونے کی
غبارِ راہ ہونے کی
درِ آئینہ خود اپنے لہو کو سرد کرنے کی
خوشی سے بھینٹ چڑھنے کی
کسی بجھتی ہوئی رنجور شب جلتے دیے کی آتشیں لَو کے بھڑکنے کی
تڑپنے کی...
بدن کی بدنما بے ست نجاست سے
سپیدہ روح کے گمنام پنچھی کے نکلنے کی
طہارت کی....
محبت میں طہارت کے لیے مخصوص ہے ساعت
یہی وہ وقت ہے جب شیطنت اپنی بقا کے واسطے پیہم ہزاروں داؤ چلتی ہے
وہ سارے داؤ! تدبیریں
سبب جن کے مقامِ بارگاہِ روح مقتل میں بدل جائے
طلب کے آستانے پر مہکتے سرخ پھولوں سے لہو کی تیز بو آئے

امجد بابر

لفظوں سے ڈرتے ہوئے

لفظ دعا کی طرح ہوتے ہیں
یہ کبھی طلسمی اثرات سے خالی نہیں ہوتے
ہم انھیں محض کے پیرائے میں
خیال کے صندوق میں قید نہیں رکھ سکتے

لفظوں کی نفسیات
ہمیں بولنے کی تہذیب
ادھورے جذبوں کی نگہبانی سکھاتی ہے
ہم آواز کے سفر سے
کلام کی ابجد سیکھتے ہیں
اور زبان کی سرحد کے پار چلے جاتے ہیں

ہمیں برے لفظوں سے ڈرنا چاہیے
جیسے بری بات سے
اندھے خیال سے
جیسے اپنے آپ سے
اور اچھے لفظوں کا لغت ترتیب دیتے ہوئے
زندگی کی خوش خطی کو قائم رکھنا چاہیے

کنیز فاطمہ سیماب

تشنگی

ہے ریگ ریگ تشنگی
نصیبِ جاں سراب ہے
ترے فسوں کے دور میں
اُداسیوں کے شور میں
خمارِ جاں کے ہم نفس
تری طویل چُپ کی یہ
ستم گری عذاب ہے
وہ رنگ جو بدل گیا
ورودِ شام کے قریں
کوئی چراغ بُجھ گیا، کوئی چراغ جل گیا
مرا فسانۂ جنوں بھی آنسوؤں میں ڈھل گیا
یہ دل تڑپ سرشت تھا
مچل گیا، مچل گیا
مری ستارہ آنکھ میں
کسی دیے کا خواب ہے
یا خواب کا سراب ہے

مجھے دیارِ شوق کا کوئی تو راستہ ملے
دیا جلے یا دل جلے
انا کے موڑ پر کبھی روایتوں کا دن ڈھلے
یا شامِ درد رو پڑے
مری ستارہ آنکھ میں
ترے دیے کا خواب ہو
وہ خواب بے سراب ہو

☆☆☆☆

عین نقوی

پیمائش

میں نے کاغذ کے خواب پر
اپنی آنکھیں کاڑھیں
اور انگلیوں کی سلائی سے
ڈوریوں کی لمبائی کا اندازہ لگایا
کہ ایک رات بننے میں
کتنے دن لگتے ہیں

میں نے مٹی کو اپنے ہونٹ چٹائے
اور ان پر جمی پپڑیوں کی خشکی سے
سیرابی کی قیمت کا اندازہ لگایا

میں نے سورج سے دھوپ چوری کی
اسے اپنی مٹھی میں چھپایا
اور اس کی تپش سے
محبت کا حساب کیا

پھر کسی نے میری راکھ چنی
اور اپنی ہتھیلی کی سیاہی میں
تمھاری بجھی ہوئی محبت کو یاد کیا

شیراز بشارت خان

دوہے

سو غم جوکھم جان پر، واڑوں سب کچھ وائے
سُکھیا سورج ڈوب کر، کھینچے غم کے سائے

مانگے موسیٰ جام رِت، کیوں وہ پھر غش کھائے
کالی کملی وال رِکت، نور میں ضم ہو جائے

بُلھا باہو بخش کیا، بھید بھرے سب شاعر
بھیدی وہ بت بند ہے، شبدوں میں جو ظاہر

سُکن کی دُھن میں کوک سن، فن کی اپنی تان
فن پہ تن من واریو، واریو اپنی جان

من کی کھیتی چٹیل کر، کیا سمجھے پر بھیت
پودا ناہیں ہوئے ہے، اوسر ہو جب کھیت

اس اگنی بیتال کا، خاکہ کھینچے کون
پل میں موسیٰ روپ ہے، پل میں ہے فرعون

پودے بنے درخت جو، سارے نہ پھل دار
جو نہ دیوے پھل تو پھر، بن جائے انگار

☆☆☆☆

اُس کی لکھی کہانی سے باہر نکل

(فکشن)

احمد حسین مجاہد

دیولاخ

(ناول کا ایک باب)

شاہ صاحب کے آستانے پر عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا تھا۔ بل کھاتی سڑک خودرو پھولوں سے لدے پہاڑ کے دو اطراف میں گھومتی ہوئی پہاڑ کی چوٹی پر بنے مزار کے احاطے میں پہنچ کر کسی عقیدت مند کی طرح اپنے وجود سے بے نیاز ہو جاتی تھی۔ مزار کی دائیں جانب دیوار کے پیڑوں کے سائے میں ایک مختصر سا مہمان خانہ تھا جہاں دور دراز سے آنے والے زائرین اپنی صدیوں کی تھکن اتارنے کی سعی کرتے تھے۔ اس مہمان خانے کے بالکل سامنے مزار کی بائیں جانب مگر مزار سے ذرا سا ہٹ کر دو تین کھوکھے تھے، جہاں کھانے پینے کی معمولی اشیا مہنگے داموں فروخت ہوتی تھیں۔ مزار کے عقب میں ایک مسجد اور اس کے پیچھے شاہ صاحب کا آستانہ تھا۔ مزار اور مزار کے احاطے میں دیوار کے درختوں پر لہراتی سبز جھنڈیاں منہ زور ہواؤں کے تھپیڑے سہتے سہتے نڈھال ہو جاتیں تو ہوا کے نامہربان جھونکے انھیں یوں شاخوں سے جدا کر دیتے تھے کہ موسم خزاں میں اس بے بسی کے ساتھ پتے بھی شاخ سے جدا نہیں ہوتے۔ ان خالی شاخوں پر جلد ہی کپڑے کی نئی سبز کترنیں، جھنڈے اور جھنڈیاں پوری آب وتاب کے ساتھ لہرانے لگتی تھیں۔

سید وصی اللہ شاہ نماز ظہر کے بعد اپنے آستانے سے ملحق ایک بڑے ہال میں جلوہ افروز ہوتے تو عقیدت مند اُن کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے وہاں امڈ پڑتے۔ چالیس سالہ شاہ صاحب بوٹے قد کے تھے اور ان کے روحانی تقاضوں نے انھیں اپنے فربہ مائل جسم سے تقریباً بے نیاز کر رکھا تھا۔ چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی تھی جو مہندی کی خوشبو سے معطر رہتی تھی۔ مہندی کا رنگ جب پھیکا پڑنے لگتا تو اس کی اوٹ سے شاہ صاحب کی ڈھلتی عمر اپنا جلوہ دکھانے لگتی جسے پھر سے پس رنگ و خوشبو کر دیا جاتا۔ سفید اونی چادر ان کے شانوں پر کچھ اس انداز میں پڑی ہوتی کہ ان کی لمبی زلفوں کو مزید نمایاں کرتی تھی۔ شاہ صاحب کے چہرے پر دکھائی دینے والی متانت اتنی واضح نہیں جتنی کہ اُن کی آنکھوں میں نظر نہ آنے والی ایک بے نام سی جستجو۔ اُن کی بائیں آنکھ کا انتہائی بایاں کنارہ اور اوپر والے ہونٹ کا وہ گوشہ جو بیک وقت نچلے ہونٹ اور ہونٹوں تک پھیلی ہوئی اُن کی داڑھی کا نقطۂ اتصال تھا، جب ایک لمحے کے لیے ایک ساتھ مرتعش ہوتے تو یہ اس بات کا واضح اشارہ ہوتا کہ جستجو کامیابی سے ہم کنار ہو چکی ہے۔

شاہ صاحب ہال میں تشریف لاتے تو ان کے فرزند سید نعمت اللہ شاہ ان کے ساتھ ہوتے۔ پندرہ برس کا سن، چھریرا بدن، خاموش اور پرسکون سید نعمت اللہ شاہ اپنے باپ کی ساری امیدوں کا مرکز تھے۔ شاہ صاحب مسند پہ بیٹھتے، کچھ دیر تک نظریں جھکائے زیرِ لب آیاتِ قرآنی کا ورد کرتے رہتے۔ ہال میں پھیلا سناٹا جب اُن کے قدم چھونے لگتا تو وہ نظریں اٹھاتے، پورے ہال کا جائزہ لیتے، کچھ دیر سکوت فرماتے اور پھر اپنا بازو یوں آگے بڑھا دیتے کہ اُن کا ہاتھ لکڑی کے چبوترے تک آ جاتا۔ سارا ہال سبحان اللہ کی دبی دبی آوازوں سے بھر جاتا۔ پہلے عورتیں اور بچے، پھر بوڑھے اور آخر میں ہال میں موجود نوجوان ایک ترتیب سے آگے کی طرف سرکتے، چبوترے کے سامنے پہنچتے، شاہ صاحب کے ہاتھ کو چھوتے، اپنے ہاتھ کو بوسہ دیتے اور شاہ صاحب کی طرف منہ کر کے الٹے قدموں سے چلتے ہوئے ہال سے باہر نکل جاتے۔ یہ سلسلہ عصر کی نماز تک چلتا رہتا۔ نمازِ عصر شاہ صاحب خود پڑھاتے اور اس کے بعد وہ اپنے گھر تشریف لے جاتے۔

شاہ صاحب کا برسوں سے یہی معمول تھا۔ مسجد، مزار اور احاطے کی دیکھ بھال کے لیے انھیں کوئی خاص انتظام نہیں کرنا پڑتا تھا کہ عورتیں اپنے دوپٹے اور مرد اپنی چادر سے یہ خدمت سرانجام دیتے تھے۔ مہینے میں شاید ایک دوبار ہی وہ احاطے کی طرف آتے تھے اور وہ بھی اُس وقت جب احاطے میں ان کے ذاتی مریدوں اور مجاوروں کے سوا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ البتہ انھیں اپنے بیٹے سید نعمت اللہ شاہ کی بہتر پرورش کے لیے طرح طرح کے جتن کرنے پڑتے تھے۔

شاہ صاحب کے دادا جنھیں بڑے شاہ صاحب کہا جاتا ہے، کشمیر سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ بڑے شاہ صاحب جب کشمیر سے یہاں تشریف لائے تھے تو ان کے پاس ایک تسبیح، چادر اور جاے نماز کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ گرمیوں کے دن تھے۔ دوپہر کے وقت درختوں کے سائے بھی اونگھنے لگتے تھے۔ بڑے شاہ صاحب کی بستی میں آمد ہوئی تو بی بی صاحب ان کے ساتھ تھیں۔ خان بہادر صاحب اس وقت اپنی حویلی کے برآمدے میں کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور کرمو نائی ان کے بال بنا رہا تھا۔ کرمو نائی کی متجسس آنکھوں نے بڑے شاہ صاحب کو دیکھا تو قینچی جیسے اس کی انگلیوں میں دھنس کر رہ گئی۔ لمبا قد، سفید نورانی چہرہ اور اس پر سیاہ داڑھی۔ خان بہادر صاحب کو ایک پل میں احساس ہو گیا کہ کرمو کہیں اور کھو گیا ہے۔ انھوں نے دھیرے سے اپنی آنکھیں کھولیں لیکن اس سے پہلے کہ وہ مڑ کر کرمو کی طرف دیکھتے، ان کی نظر دالان کے اس پار ایک درخت کے سائے میں دو اجنبی مسافروں پر پڑی۔ خان بہادر صاحب جہاں دیدہ انسان تھے، انھوں نے پہلی ہی نظر میں تاڑ لیا کہ مسافر کسی جاے پناہ کی تلاش میں ہیں۔ انھوں نے کرمو کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور سیدھے بڑے شاہ صاحب کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ بڑے شاہ صاحب نے ایک ہاتھ اپنے سینے

پر رکھتے ہوئے انھیں سلام کیا اور دوسرے ہاتھ سے پتھر کا سہارا لے کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن خان بہادر صاحب نے اپنا ہاتھ ان کے شانے پر رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالا اور انھیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ جانے ایسی کیا بات تھی کہ خان بہادر صاحب کو اس دن اس درخت کے سائے میں عجیب سا سکون ملا۔ انھوں نے ایک نظر بی بی صاحب کو دیکھا جو ان کی طرف پشت کیے چادر میں سمٹی ہوئی بیٹھی تھیں۔

دریک کے اس درخت کی شاخوں پر ٹنگی دوپہر کا پرندہ ہوا کی خاموشی کو اپنے پروں میں سمیٹے کاہلی کے چھینٹے اڑاتا اس سارے منظر سے اپنی لاتعلقی کا مسلسل اعلان کیے جا رہا تھا۔ مٹی اپنی گھٹی ہوئی مہک کو پھر سے تازہ کرنے کے لیے دور پہاڑوں کے سر پر تیرتے بادل کے ایک ٹکڑے کی طرف دیکھتے ہوئے بہت معصوم دکھائی دے رہی تھی۔ گھروں کے آنگنوں میں رکھے تنوروں سے اٹھتا دھواں اپنی اوقات سے بڑھ کر اوپر کی طرف لپکتا مگر ہوا کچھ ہی دیر میں اسے اپنے اندر جذب کر لیتی تھی۔

خان بہادر صاحب نے بڑے شاہ صاحب کا ہاتھ تھاما اور کچھ کہے بغیر واپس حویلی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ حویلی کے برآمدے میں پہنچ کر انھوں نے کرمو کی طرف دیکھا۔ کرمو حویلی کے ادب آداب سے بخوبی آگاہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے موقع پر اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے بی بی صاحب کو حویلی کے دروازے پر پہنچا کر دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور جواب کا انتظار کیے بغیر واپس خان بہادر صاحب کی پشت پر آ کھڑا ہوا۔ وہ اس وقت بڑے شاہ صاحب سے محو گفتگو تھے۔

احاطے میں بڑے شاہ صاحب کے مزار کے ساتھ وصی اللہ شاہ کے والد کرامت اللہ شاہ بھی ابدی نیند سو رہے تھے۔ جب بڑے شاہ صاحب اس دنیا سے پردہ فرما گئے تو ان کے سعادت مند بیٹے کرامت اللہ شاہ نے ان کی وصیت کے مطابق انھیں گھر کے باہر پتھر کی اس سل کے قریب ہی دفن کر دیا جس پر وہ نماز پڑھا کرتے تھے۔ شہر سے دور پہاڑ پر اس ڈھائی تین کنال پر پھیلے ہوئے احاطے کو بڑے شاہ صاحب کی وفات سے جو شناخت اور اعتبار و وقار ملنے والا تھا اس سے خود کرامت اللہ شاہ بھی آگاہ نہ تھے۔ وہ تو بس ہوتے ہوتے کچھ ایسا سلسلہ بنا کہ کسی منصوبے کے بغیر ہی خان بہادر صاحب کی طرف سے بڑے شاہ کو دی گئی ماڑی نے تقدیس کی چادر اوڑھ لی اور دیکھتے ہی دیکھتے ماڑی کا حلیہ بدل گیا اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس کام کا آغاز بھی خود خان بہادر صاحب کے ہاتھوں ہوا۔

بڑے شاہ صاحب کی وفات کے بعد خان بہادر صاحب چالیسویں تک ہر جمعرات کو ماڑی آتے اور خیرات کے چاول بانٹنے کے بعد واپس شہر چلے جاتے۔ وہ اکیلے تھوڑا ہی آتے تھے، ان کے ساتھ تو پورا ایک جلوس ہوتا تھا۔ خان بہادر صاحب نے بڑے شاہ صاحب کا چالیسواں اس عقیدت و احترام کے ساتھ کیا

کہ کرامت اللہ شاہ انھیں دیکھتے تو احساس تشکر سے آنکھیں بھیگ جاتیں۔

اس دن احاطے میں ایک طرف دیگیں چڑھی ہوئی تھیں جن میں چاول اور گوشت پک رہا تھا اور دوسری طرف شاہ صاحب کی قبر کے گرد چار چار فٹ اونچی دیواریں اٹھائی جا رہی تھیں۔ دیواریں بن چکیں تو ان میں لکڑی کا دروازہ بھی فٹ کر دیا گیا یوں مزار کی ابتدائی شکل سامنے آ گئی۔ مزار کی توسیع اس وقت عمل میں آئی جب کرامت اللہ شاہ کا انتقال ہوا اور بڑے شاہ صاحب کی قبر کے ساتھ ہی ان کی قبر بھی بن گئی۔ کرامت اللہ شاہ کی وفات کے بعد خود وصی اللہ شاہ نے چالیسویں کا اہتمام کیا کہ اب خان بہادر صاحب اس دنیا میں نہیں تھے۔ وصی اللہ شاہ کا چھوٹا بھائی ہدایت اللہ شاہ بھی وہیں موجود تھا لیکن وہ اس سارے معاملے سے اس طرح لاتعلق تھا جیسے وہ اپنے باپ کرامت اللہ شاہ کو جانتا ہے نہ اپنے بھائی وصی اللہ شاہ کو۔ اس کے دماغ میں کچھ اور ہی چل رہا تھا۔ جب مزار کے گرد دیواریں اٹھائی جانے لگیں تو اس نے دبے انداز میں احتجاج بھی کیا مگر وصی اللہ شاہ نے اسے ڈانٹ دیا اور وہ دیودار کے پیڑوں کی چھاؤں میں اپنا منہ دوسری طرف پھیر کے لیٹ گیا اور اس وقت تک لیٹا رہا جب تک احاطہ لوگوں سے خالی نہیں ہو گیا۔ اس نے خیرات کے چاول بھی نہیں کھائے تھے اور اجتماعی دعا میں بھی شریک نہیں ہوا تھا۔

اس رات ہدایت اللہ شاہ اور وصی اللہ شاہ میں بہت بحث و تکرار ہوئی۔ ہدایت اللہ شاہ نے جب اپنے بڑے بھائی سے کہا کہ ہمارے باپ دادا تو ساری عمر لوگوں کو ان رسوم و رواج سے دور رہنے کی تلقین کرتے رہے ہیں اور وہ مزاروں پہ بنی ہوئی عمارات کو اچھا نہیں سمجھتے تھے تو وصی اللہ شاہ نے یہ کہہ کر اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنے باپ دادا کے عقیدت مندوں سے اب ٹکریں تو نہیں مار سکتا۔ ہدایت اللہ شاہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن وصی اللہ شاہ نے یہ کہہ کر کہ اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے اسے خاموش کر دیا اور بات بظاہر آئی گئی ہو گئی۔

سید کرامت اللہ شاہ خلوت پسند انسان تھے۔ ان کی ساری زندگی گوشہ نشینی کے عالم میں گزری تھی۔ انھیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ ان کے اردگرد کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ وہ ہمہ وقت عبادت اور ذکر و اذکار میں مشغول رہتے تھے۔ سجدوں کی کثرت سے ان کی پیشانی پر ابھرنے والا نقش دور سے دکھائی دیتا تھا۔ وہ راتیں جاگ کر گزارتے تھے اور اتنا روتے تھے کہ آنسوؤں نے ان کے رخساروں پر مستقل راستہ بنا لیا تھا۔ درویش طبع کرامت اللہ شاہ کی معاملاتِ دنیا سے لاتعلقی کی وجہ سے ان کی زندگی ہی میں ان کے بچوں کو کھلی آنکھوں سے دنیا دیکھنے اور برتنے کا تھوڑا بہت ہنر آ گیا تھا۔ خود کرامت اللہ شاہ میر انیس کے اس شعر کا عملی نمونہ تھے:

کنجِ عزلت میں مثالِ آسیا ہوں گوشہ گیر   رزق پہنچاتا ہے گھر بیٹھے خدا میرے لیے

سید کرامت اللہ شاہ کی زندگی ہی میں مزار پر لوگوں کا آنا جانا شروع ہو گیا تھا لیکن انھوں نے کبھی

اس طرف توجہ ہی نہ دی کہ مزار پر کون آ رہا ہے اور وہاں کیا ہو رہا ہے۔ ان سارے معاملات سے ان کی اس لاتعلقی نے سید وصی اللہ شاہ کو نوجوانی ہی میں عملی طور پر مزار کا متولی بنا دیا تھا۔ اس کے بعد تو ایک سلسلہ چل نکلا۔ پہلے تو شہر اور ارد گرد سے لوگ مزار پہ آنے لگے، درختوں کی شاخیں سبز کپڑے کی کترنوں سے سجنے لگیں، قبر کے سرہانے کسی نے دو چار گول گول پتھر لا کے رکھ دیے تو کسی نے قبر پر چادر چڑھا دی۔ کوئی پھول لے آیا اور کسی نے قبر پہ نقد رقم رکھ دی، پھر دور دراز کے علاقوں سے لوگوں کا یہاں آنا جانا شروع ہوا اور ماڑی نے ماڑی سیداں بن کر اپنی مٹی کو مقناطیس بنا لیا جو دور دور سے خلق خدا کو یہاں کھینچ لاتا تھا۔

ہدایت اللہ شاہ یہ سب کچھ دیکھتا تھا مگر بات اس کے بس سے نکل چکی تھی۔ اب تو مزار کے ساتھ جہاں پتھر کی وہ سل پڑی تھی جس پر کبھی بڑے شاہ صاحب نماز پڑھا کرتے تھے، دیواروں اور چھت سے تہی ایک مسجد بھی بن چکی تھی۔ احاطے میں درختوں پر کپڑے کی کترنوں کے بجائے اب بڑے بڑے جھنڈے لہرانے لگے تھے جنھیں دیکھ کر ہدایت اللہ شاہ اکثر سوچتا تھا کہ اتنے کپڑے سے تو دو تین ننگے بدن ڈھانپے جا سکتے ہیں۔ مزار کی دیواریں چار کے بجائے نو دس فٹ تک اٹھا دی گئی تھیں اور قرائن سے لگتا تھا کہ جلد ہی کوئی بندۂ خدا اس پر چھت بھی ڈال دے گا۔

اب تو ہر جمعرات کو یہاں زائرین کا تانتا بندھ جاتا تھا۔ لاہور کے ایک بڑے تاجر نے احاطے میں زائرین کے لیے دو تین کمرے بنوا دیے اور یہی وہ بندۂ خدا تھا جسے خدا نے قبروں پر چھت ڈالنے کی توفیق بھی دے دی تھی۔ مزار بن گیا تو ماڑی سیداں کے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے۔ وصی اللہ شاہ کو محسوس ہونے لگا تھا کہ ڈھائی تین کنال جگہ اب کم پڑنے لگی ہے۔ پھر کہیں سے ایک مجاور بھی آ گیا اور مزار پر شام ہوتے ہی چراغ بھی جلنے لگا اور اگر بتی کی خوشبو نے دیودار کے پیڑوں کی خوشبو کے ساتھ مل کر وہ سماں پیدا کیا کہ لوگ اسے بھی بڑے شاہ صاحب کی کرامت ہی سمجھنے لگے۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ خوشبو ان کے لباس سے مہینوں تک نہیں جاتی۔ پھر عورتیں آنے لگیں اور مزار پر پڑے گول پتھروں کے دن پھر گئے اور وہ رفتہ رفتہ ملائم ہونے لگے۔ منتیں مانی جانے لگیں، چڑھاوے چڑھائے جانے لگے، مرادیں مانگی جانے لگیں اور عورتوں کے رنگ برنگے گرہ لگے دوپٹے درختوں کی شاخوں پر جھولنے لگے۔ ایک نیاز مند نے قبریں پختہ کروا دیں اور قبروں کے سرہانے کتبے بھی نصب کروا دیے۔ دیواروں میں طاق ابھر آئے اور یوں مزار کی ہیئت ہی بدل گئی۔

بڑے شاہ صاحب کا گھر جو صرف ایک کمرے پر مشتمل تھا اب پھیلنے لگا اور ایک سال کے اندر اندر ہی اتنا پھیل گیا کہ عملی طور پر گھر سے آستانہ الگ ہو گیا۔ پھر اس آستانے نے ایک باقاعدہ شکل اختیار کر لی اور یوں مسجد اور گھر کے درمیان ایک بڑا ہال بن گیا۔ مزار پر مستقل رہنے والے مجاوروں کی تعداد بھی بڑھنے لگی تھی

اوران کے درمیان اندر ہی اندر ایک کشمکش کا بھی آغاز ہو گیا تھا۔ مزار پہ کون بیٹھے گا، چراغ کون روشن کرے گا، مزار کو غسل کب اور کون دے گا، نذر اور نیازیں کون وصول کرے گا، ابھی یہ طے نہیں ہوا تھا اس لیے یہ سب کام ایک غیر منظم انداز میں ہو رہے تھے۔ اب تو یہاں ہر وقت ایک میلہ سا لگا رہتا تھا۔ زائرین جن میں بچے، بڑے، جوان، عورتیں سب شامل تھے، کی تعداد بہت بڑھ چکی تھی جن کی سہولت کے لیے وصی اللہ شاہ کی اجازت سے احاطے میں دو چار کھوکھے بن گئے تھے جہاں کھانے پینے کی اشیا مل جاتی تھیں۔

وصی اللہ شاہ نے حج بھی کر لیا تھا اور اب وہ دم درود بھی کرنے لگے تھے۔ انھیں مرید سازی کا گر بھی آ گیا تھا جس کی وجہ سے ان کا حلقۂ اثر روز بہ روز بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ انھیں کسی بات کی کوئی فکر نہیں تھی بس ایک ہدایت اللہ شاہ کی طرف سے پریشان تھے کہ کہیں اسے کسی دن جن نہ چمٹ جائیں اور وہ اس سارے سلسلے کو لپیٹ کے نہ رکھ دے۔ ہدایت اللہ شاہ کو وہ نذر رنذرانے میں سے اس کا حصہ دے کر مطمئن ہو جاتے تھے کہ ہدایت اللہ شاہ یہ رقم لے کر کچھ دن کہیں چلا جاتا تھا اور جب اس کی جیب ہلکی ہونے لگتی تو تب واپس آتا تھا۔ وہ پیسے لے کر کہاں جاتا ہے، کیا کرتا ہے، وصی اللہ شاہ نے یہ جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ہاں کبھی کبھی اس کی شادی کا خیال ضرور ذہن میں آتا تھا۔ انھوں نے ایک دوبار ہدایت اللہ شاہ سے اس سلسلے میں بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس عجیب انداز میں ان کی بات سنی ان سنی کر دیتا تھا کہ وصی اللہ شاہ کو خود پر غصہ آنے لگتا تھا۔ انھیں کبھی کبھی یہ شک بھی گزرتا تھا کہ ہدایت اللہ شاہ نے انھیں بتائے بغیر کہیں شادی کر لی ہے اور وہ یہاں سے نذر رنذرانے کی رقم لے کر یقیناً اپنی بیوی ہی کے پاس جاتا ہے۔ عجیب بات تھی کہ اس خیال سے انھیں دکھ بھی ہوا مگر ان کے اندر کہیں ایک دھیما دھیما سا کوئی اور احساس بھی سر اٹھانے لگا تھا جسے وہ ابھی کوئی نام نہیں دے پا رہے تھے یا دینا ہی نہیں چاہتے تھے۔

پھر خدا نے انھیں نعمت اللہ شاہ کی شکل میں اس سارے سلسلے کا وارث عطا کر دیا۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی ہدایت اللہ شاہ کے بارے میں پریشان تو تھے لیکن کچھ دن پہلے تک وہ جس جذبے کو کوئی نام نہیں دے پا رہے تھے اب اس کے خد و خال واضح ہونے لگے تھے۔ کچھ ہی دن میں اس بے نام جذبے نے اتنا قد نکالا کہ اس کے سامنے ان کی پریشانی کی کوئی حیثیت ہی باقی نہ رہی۔ البتہ ان کی بیوی کی پریشانی بڑھتی ہی جا رہی تھی اور وہ اکثر وصی اللہ شاہ سے اپنی پریشانی اور ہدایت اللہ شاہ کے مستقبل کے بارے میں گفتگو کرتی اور شاہ صاحب بہت خوب صورتی سے کوئی ایسا نکتہ نکال لاتے کہ بات کہیں اور پہنچ جاتی اور اُن کی بائیں آنکھ کا انتہائی بایاں کنارا اور اوپر والے ہونٹ کا وہ گوشہ جو بیک وقت نچلے ہونٹ اور ہونٹوں تک پھیلی ہوئی اُن کی داڑھی کا نقطۂ اتصال تھا، ایک ساتھ ارتعاش میں آ جاتے۔

محمود احمد قاضی

میرا کمرہ

اس کمرے کو جو گلی کے ساتھ منسلک ہے ہم اپنی سہولت کے لیے بیٹھک بھی کہہ لیتے ہیں۔ کوٹھیوں اور بنگلوں والے ایسے کمرے کو ڈرائینگ روم کہتے ہیں۔ صحیح معنوں میں یہ بیٹھک اس لیے نہیں کہ یہ ایک کثیر المقاصد کمرہ ہے۔ اس میں میری ذات کے علاوہ اور بہت کچھ ہے۔ اس کا ایک دروازہ باہر گلی میں کھلتا ہے۔ بیرونی دیوار میں تین پلوں والی، شیشوں سے مزین کھڑکی ہے۔ اوپر چھت کے قریب دو روشن دان ہیں۔ سامنے والی دیوار کے دائیں کونے میں ایک لمبوترا اٹیچڈ باتھ ہے۔

اسی دیوار کے دوسرے کونے میں ایک دروازہ ہے جو گھر کے اندر کھلتا ہے۔ اس دروازے کے اوپر بھی ایک روشندان ہے۔ یار دوست آ جائیں تو اس دروازے کو بند رکھا جاتا ہے۔ جب میری بیٹی اس پر ہلکے سے ہاتھ مارتی ہے تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ وہ اپنے ہاتھوں میں چائے اور دوسرے لوازمات والی ٹرے تھامے کھڑی ہے۔ میں اٹھتا ہوں اور اس سے ٹرے لے لیتا ہوں۔ گرمیوں میں اس دروازے کے آگے ایک پردہ جھولتا رہتا ہے۔ ڈیوڑھی کی طرف والی دیوار میں ایک الماری بنی ہے جس میں زیادہ تر مقامی اور غیر ملکی فکشن کی کتابیں رکھی ہوئی ہیں۔ اس الماری کے قریبی کونے میں بید سے بنا ایک چار خانوں والا ریک رکھا ہے۔ اس میں تاریخ کی کتابیں ٹکی ہوئی ہیں۔ اس کے اوپر والے گول فریم پر دنیا کے نقشے پر مبنی ایک ہوا بھرا پلاسٹک کا گلوب دھرا ہے۔ ریک میں رکھی کتابوں کے پیچھے گیس، بجلی اور فون کے ادا شدہ بلوں کی رسیدیں رکھی ہوئی ہیں۔ ساتھ ہی چند یادگاری اشیاء سے بھرے ہوئے دو چار پڑے ہیں۔ یہ سب چیزیں قطعی طور پر نادر الوجود نہیں لیکن تھوڑی انوکھی ضرور ہیں۔

ان میں زیادہ تر منی ایچر قسم کی چھوٹی چھوٹی نفیس اور بھدی چیزیں ہیں۔ اس ریک کے قریب لکڑی کی ایک وراثتی میز ہے جس کے پائے خاصے لمبے ہیں۔ اس میں ایک دراز بھی ہے جس میں میری لازمی اور ضروری دستاویزات رکھی ہوئی ہیں۔

میز کے آگے جس کے اوپر والے تختے کو ایک پلاسٹک شیٹ سے ڈھک دیا گیا ہے ایک چھوٹی سی گھومنے والی کرسی رکھی ہے۔ میں اس پر کم ہی بیٹھتا ہوں۔

اس کمرے میں ون ون تھری کی ترتیب والے تین بھدے سے صوفے پڑے ہیں۔ ان کی پوشش

نہ ہونے کے برابر ہے اور ان کی پشت بھی اونچائی میں چھوٹی ہے اس لیے یہ خاصے غیر آرام دہ ہیں۔ ان صوفوں پر پانچ عدد چھوٹے چھوٹے کشن بھی پڑے رہتے ہیں۔ دو بڑے سائز کے فلور کشن ہیں جو کمرے کے فرش پر بچھے چھ بائی نو کے ایک عام سے پرانے قالین پر رکھے رہتے ہیں۔ بید کے بنے دو عدد موڑھے بھی ہیں جو کتابوں والی الماری کے سامنے رکھے ہوئے ہیں ان پر دو کشن نما گدیاں دھری رہتی ہیں۔ گلی کی طرف کھلنے والے دروازے کے قریب چھوٹا سا لکڑی کا بنا ریک موجود ہے جس میں زیادہ تر ڈکشنریاں ٹھنسی ہوئی ہیں۔ اس کی ٹاپ پر کاغذات کے پلندے اور دیگر فائلیں دھری ہیں۔ مسودات بھی ادھر ہی رکھے ہیں۔ کمرے کے درمیان میں ایک سنٹر ٹیبل رکھا ہوا ہے جو مستطیل شکل کا ہے۔ اس کی ٹاپ چپ بورڈ کی بنی ہوئی ہے جسے فارمیکا کی شیٹ سے ڈھک دیا گیا ہے۔ اس پر ایک میز پوش بھی دھرا ہے۔

ادھر کی گلی بھی عجوبہ گلی ہے۔ یہ دن رات چالو رہتی ہے۔ ریڑھے، ریڑھیاں، رکشے، سائیلنسر کے بغیر شور مچاتی، دندناتی موٹر سائیکلیں اس کے سینے پر مونگ دلتی رہتی ہیں۔ سبزی فروش، ابلے ہوئے تمبو ٹل میں دبے بھٹے بیچنے والے، برف کے گولے والے، مٹکے والی اور مشینی قلفیوں والے اور گول گپوں والے بھی ادھر آئے رہتے ہیں۔ سلائی مشین، واٹر کولر، گیس کے چولہے، پریشر ککر، جوسر گرائینڈر مرمت کرنے والے بھی ادھر اکثر آتے ہیں۔ مرونڈا، سک سرما، بھنے چنے بیچنے والے، کھیس دریاں اور کمبل بیچنے والوں کے ساتھ واٹر سیٹ، ٹی سیٹ اور ڈنر سیٹ بیچنے والے، تین ہزار کی چیز ایک دم تین سو سے بھی کم میں دے جانے والے پٹھان بھی یہاں کا پھیرا لگاتے رہتے ہیں جن کے پاس کالی پتی (چائے) قہوہ اور گرم مصالحہ بھی ہوتا ہے۔ اپنے مکانوں کو تین منزلہ بنانے کے لیے مٹی سے بھری، اینٹوں اور بجری سیمنٹ ریت سے لدی ٹرالیاں یہاں کا معمول ہیں۔ لینٹر والا سریا بڑے بڑے ریڑھوں پر لاد کر آتا ہے۔ چند ایک کاریں بھی ادھر کھڑی نظر آتی ہیں جو لوگوں سے ملنے کے لیے آنے والے مہمانوں، رشتے داروں کی ہوتی ہیں۔ گلی میں موجود واحد ڈاکٹر کی دکان پر کراہتے ہوئے آنے والے مریض زیادہ تر مسکراتے ہوئے واپس جاتے ہیں۔ یہ اس گلی کا واحد اطمینان دلانے والا گوشہ ہے۔ یہ گلی چوں کہ دونوں اطراف کے بازاروں کو آپس میں جوڑنے کا فریضہ بھی ادا کرتی ہے اس لیے ہر وقت لوگوں کے شور شرابے اور آوازوں سے بھری رہتی ہے۔ یہ لوگوں کی ایک چھوٹی سی خود کفیل دنیا ہے جس میں بنے سیپٹک ٹینکوں کے اوپر سے ٹرائی سائیکل چلاتے بچے خوش خوش سفر کرتے ہیں اور یہاں ہی کبھی کبھار (ہفتے میں ایک بار) ایک لچھے بیچنے والا بھی آتا ہے۔ وہ خاموش آنکھوں اور تھرتھراتے لبوں والا نوجوان ہے۔ لگتا ہے اس کے جسم کے سارے مساموں میں صرف خاموشی تیرتی ہے۔ ایک بار اس نے مجھ سے بس اتنا کہا تھا کہ وہ رات کو ایک جگہ پر چوکیداری کرتا ہے اور دن کو لچھے بیچتا ہے۔ ایک دو بار وہ اپنا مال

سائیکل پر بھی لایا۔ لیکن زیادہ تر وہ پیدل ہی ہوتا ہے۔ اس کے پاس ایک گھنٹی ہے جو وہ بجاتا ہے۔ یہ ایک طرح کا سگنل ہے جو گلی کے بچوں کے لیے خوشی کا پیغام ہوتا ہے وہ اس سے لچھے لینے کے لیے باہر کی جانب لپکتے ہیں (کچھ دنوں سے وہ آنہیں رہا پتہ نہیں اس کے ساتھ کیا ماجرا ہوا ہے۔ بچے اور میں خود اس کے بغیر اداس ہیں) ایک بندر والا بھی آتا ہے۔ زور سے ڈمرو بجاتا ہے۔ کوئی باہر ہی نہیں نکلتا۔ صرف ایک گھر ہے جہاں سے اسے روٹی مہیا کی جاتی ہے۔ میں بھی اس کی طرف چند روپے بڑھاتا ہوں۔ روپے لے کر جب وہ سلام کے لیے اپنا ہاتھ اوپر ماتھے تک اٹھاتا ہے تو شرم سے میں پانی پانی ہو جاتا ہوں۔ میں اسے ایسا کرنے سے منع کرتا ہوں۔ وہ باز ہی نہیں آتا۔ اسے عادت جو پڑ چکی ہے۔ جمانوں کو سلام کرنے کی۔ کاش وہ اپنے اس معمول کے تقاضے کو بھول سکے۔ ویسے یہ ایک حقیقت ہے کہ بچے بندر کا تماشہ دیکھنا بھول چکے ہیں۔ انہیں اب دوسرے مشینی تماشوں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ مجھے اس بندر والے کی آنکھوں کی بے بسی اور بے توقیری سے بڑھ کر اس کے بندر کی آنکھوں کی اداسی سے ڈر لگتا ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں اگر اس بندر والے نے بھی ادھر آنا چھوڑ دیا تو کیا ہوگا۔

گرمیوں میں میں بیٹھک میں ہی اپنی چارپائی بھی بچھا لیتا ہوں۔ جب کوئی مہمان آجائے تو اس چارپائی کو پھرتی کے ساتھ یہاں سے اٹھا لیا جاتا ہے۔ اس طرح آنے والے کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ اس کے آنے سے پہلے ادھر ایک چارپائی بھی موجود تھی۔ یہی کمرہ میرے اٹھنے بیٹھنے، سونے اور پڑھنے لکھنے کے کام آتا ہے۔ دوستوں کے ساتھ گپ شپ اور بحث مباحثہ بھی یہیں برپا ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس کمرے کا اصل مقصد اور اس کی غایت بھی یہی ہے۔ کبھی کبھی دوسرے شہروں سے بھی لوگ ملنے آجاتے ہیں۔ شہر کے اندر کے لوگ بھی آتے ہیں۔ بحث گرما گرم بھی ہوتی ہے اور پھیکی، ٹھس، ٹھنڈی بھی ہوتی ہے۔ ادب، سیاست، فلم، موسیقی خاص موضوعات ہوتے ہیں۔ بعض اوقات پرائزن ٹیبل بھی کام آجاتا ہے۔ تب گراموفون ریکارڈ بجتے ہیں۔ رسولن بائی اور روشن آرا کی آواز کا جادو چلتا ہے۔ میں آڈیو کیسٹ کا رسیا ہوں۔ اب اس کا چلن تو نہیں رہا پھر بھی میرا بوڑھا ٹیپ ریکارڈر کام آ ہی جاتا ہے۔ کلاسیکی، نیم کلاسیکی اور پرانے فلمی گیت میرے ذہن کو بالیدگی بخشتے رہتے ہیں۔ یہیں پر کوئی دوست اپنا ہارمونیم بھی لے آتا ہے۔ تب گلی کے شور کے جلو میں غزل، ٹھمری، شبد راگ کی سریلی گونج بھی اس کمرے میں سنائی دینے لگتی ہے۔

لوگ آتے ہیں۔ آتے رہتے ہیں۔ شاید آتے رہیں گے لیکن کچھ عرصے سے یوں ہو رہا ہے کہ اب ان کے آنے کی رفتار اور تعداد میں بتدریج کمی آ رہی ہے۔ غالباً پنچھی اپنا چوگا چگ چکے ہیں۔ وہ سیر ہو چکے ہیں۔ شاید میں اندر سے نچڑ گیا ہوں یا وہ ہی زیادہ ادبی، سیاسی مال سے، انبار سے بھر چکے ہیں۔ خود میری بھی اس کمرے کے ساتھ جڑت میں کمی آئی ہے۔ اب میں ادھر ضروری کاغذات لینے، اپنی نئی تحریروں کی نقول کو

فائلوں میں محفوظ کرنے اور دوسری قسم کے کاغذات کے پلندوں کو ادھر سنبھالنے کے لیے ہی آتا ہوں۔ میرے اور اس کے ساتھ میں نامحسوس طریقے سے کمی آتی جا رہی ہے۔ اب یہ میرے لیے ایک جنک یارڈ ہے یادوں کا۔ میں اب جب ادھر آتا ہوں تو کوئی نہ کوئی یاد میرے پاؤں سے ضرور لپٹ جاتی ہے۔ وقت کی طناب سے ٹوٹا پٹور کوئی پل، کوئی لمحہ جب میرے ساتھ معانقہ کرتا ہے تو میری ڈھارس بندھتی ہے۔

آج کل ایسا ہو رہا ہے کہ جب میں اپنے کمرے کے فرش پر اپنے پاؤں دھرتا ہوں تو اس کی سانسیں تیکھی ہونے لگتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے یہ میری ہی سانسیں ہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆

محمد الیاس

پچھلے جنم

سیرت النبی کا مکمل سیٹ ہاتھوں پر اٹھائے بیوی دروازے پر آن کھڑی ہوئی اور اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ کرسی چھوڑ کر میں پذیرائی کو لپکا۔ محبت سے دونوں ہاتھ کندھوں پر رکھے اور خندہ پیشانی سے عرض کیا: ''خوش آمدید، تشریف لائیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کر کتابیں بڑے سبھاؤ سے میز پر رکھیں اور کرسی سنبھال لی۔ طویل ازدواجی رفاقت میں میرا یہ آزمودہ تجربہ رہا ہے کہ موقع بموقع تھوڑی سی بے ضرر منافقت اس اہم ترین انسانی رشتے پر خوش گوار اثرات مرتب کرتی ہے۔ مکرر عرض کیا مگر شعر میں تصرف کرتے ہوئے: ''وہ آئیں گوشہ عافیت میں ہمارے خدا کی قدرت ہے، کبھی ہم ان کو کبھی اپنے آپ کو دیکھتے ہیں۔''

بیوی قدرے کھل کر ہنسی اور بولی: ''آپ کے یہ انداز دلبری بندے کو مار ڈالتے ہیں۔ اللہ جانے کتنیوں کے کرم پھوٹے اور کس کس کی نیندیں حرام ہوئی ہوں گی۔ یہ جو آپ کے طور طریقے ہیں، ان پر کوئی تاجدار ملکہ بھی پہلی ملاقات میں ہی بھٹک جائے۔ کراچی میں نکاح سے پیشتر آپ کی ان اداؤں نے میری کئی نمازوں میں خلل ڈال دیا تھا۔ ابا جی مرحوم نے جوں ہی آپ کا پروپوزل میرے سامنے رکھا، میں نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور فوراً ہاں کر دی۔ خود کو سمجھا لیا کہ محبت کے بدلے محبت بھاگوانوں کو ملا کرتی ہے۔ مجھے اپنی نمازیں بچانی ہیں۔ اللہ کرے وہی یکسوئی لوٹ آئے۔ ہم مسلم خواتین پر اللہ کا کرم ہے کہ ذاتِ باری نے نکاح کو شرعاً دو طرفہ محبت کے ساتھ مشروط نہیں کیا۔ ورنہ تو بیشتر ازدواجی رشتے مباح ہی نہ ٹھہرائے جا سکتے۔

میں نے ہمت کر کے پوچھ لیا کہ محبت کا یقین کیسے دلایا جا سکتا ہے تو جواب ملا: ''محبت کا جذبہ لفظوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ آنکھوں سے، باتوں سے، ہاتھوں کے لمس سے، ہر ہر ادا سے محبت اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ گمان گزرتا ہے کہ تخلیق کائنات سے پہلے خالق نے محبت کا جذبہ پیدا کیا اور اسی کے تحت نظام ہستی چلا رہا ہے۔ جہاں یہ جذبہ ماند پڑ جائے، وہاں بگاڑ آ جاتا ہے۔ کہنے آئی تھی کہ اوٹ پٹانگ کتابیں پڑھنے کی بجائے سیرت پاک کا مطالعہ کریں۔ خواہ چند صفحات ہی روزانہ، مگر باقاعدگی سے۔ بعض اوقات آپ ایسی باتیں کر جاتے ہیں، جس سے ایمان خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ ایک دن آپ نے کہہ دیا کہ چار ہزار سال قبل مصر میں ہوتے تھے، آخن آتون کے زمانوں میں۔ کسی دیوی کی آنکھیں تراشیں، پتھر کا مجسمہ بناتے ہوئے

توفرعون ان آنکھوں پر عاشق ہوگیا۔ اس نے دیوی کے بارے میں جاننا چاہا مگر آپ بتانے پر آمادہ نہ ہوئے، کسی بھی قیمت پر۔ فرعون نے آپ کو اذیتیں دے دے کر قتل کر ڈالا۔۔۔ توبہ استغفار۔

بیوی کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا اور بولی: ''اور یہ جو آپ کو صفائی کا خبط ہے، اللہ معاف کرے۔ ملازمہ تو دور کی بات ہے، میرے دھوئے ہوئے برتن آپ استعمال سے پہلے خود نئے سرے سے دھونا شروع ہو جاتے ہیں۔ کبھی کسی مرد کے بارے میں نہیں سنا، جو راہ چلتے سگریٹ جوس کے خالی پیکٹ اور ریپر اٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈالتا پھرے۔ میں نے اسی لیے رات کو آپ کے ساتھ واک پر جانا چھوڑ دیا کہ سوسائٹی کی خواتین ہمیں دیکھنے لگ جاتیں اور مجھے شرم محسوس ہوتی تھی۔ اس معاشرے کا کلرک چپڑاسی بھی سرِ راہ کوڑا نہیں اٹھاتا اور آپ اتنے بڑے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ میری گلہ گزاری پر آپ نے عجب کہانی بیان کر دی۔۔۔ جین مت والے مہاویر کہ وردھمان کے زمانے کی، ایشوما کی بھولی پاروتی سے بیاہ۔۔۔ اللہ کی پناہ۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سوسائٹی پر اللہ کا کرم ہے کہ درس والی مسز علیم اور ان کی ساتھی خواتین دین کا علم رکھتی ہیں بلکہ دیگر مذاہب کا بھی۔ انھوں نے آخن آتون پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ مہاویرا اور وردھمان ایک ہی شخصیت کا نام ہے، جو جین مت کے بانی تھے۔ ان سے مسئلہ بیان کر کے شرعی حل پوچھا۔ مسز علیم نے کچھ سوالات کیے ہیں۔ آپ وہی کہانی دوبارہ دوہرائیں تاکہ میں جوابات اخذ کر سکوں۔ میں آج سن کے جاؤں گی۔ ایمان کی سلامتی کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔

بڑی مشکل آن پڑی تھی۔ عرض کیا: ''زوجہ محترمہ! آپ کا شکر گزار ہوں کہ مجھ جیسے نیم پاگل کے ساتھ نباہ کیا۔ پیدائشی طور پر ہی کوئی دماغی خلل ہے۔ بعض اوقات قوتِ متخیلہ بے حد تیز ہو جاتی اور سوتے جاگتے میں جو خواب دیکھتا ہوں، ان پر حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ آپ کی عالمہ فاضلہ خاتون نے صحیح فرمایا۔ مہاویر کا اصل نام وردھمان ہی تھا۔ مجھے ایک دور میں جین مت کی تعلیمات نے بڑا متاثر کیا تھا، جس کا بنیادی فلسفہ ترکِ خواہشات، تہذیبِ نفس اور رہبانیت ہے۔ مہاویر کہتا ہے کہ دائمی خوشی کے حصول کی خاطر جو انسان من کو آرزوؤں اور تمناؤں سے پاک کر لے، اس پر رنج و آلام وارد نہیں ہوتے۔ مایوسی اور افسردگی تب طاری ہوتی ہے، جب کوئی خواہش پوری نہ ہو۔ جو لوگ آرزوئیں نہیں پالتے، ان کی روح ہمہ وقت شاداں اور فرحاں رہتی ہے۔ یہی ذہنی سکون اور مسرت دراصل نروان ہے۔''

بیوی انہماک سے سن رہی تھی۔ میں نے بات جاری رکھی اور کہا: ''جین مت کی چند اور باتیں بھی اچھی لگیں۔ مثلاً یہ کہ دوسروں کے وجود کو اتنا ہی اہم، قابلِ احترام اور عزیز جانو، جتنا اپنے وجود کو سمجھتے ہو۔ کسی کا مال اسباب ناجائز ذریعے سے نہ ہتھیاؤ۔ حلال روزی کماؤ اور کھاؤ۔ ہمیشہ پاک دامن رہو۔ دیکھنے سننے سونگھنے

اور چکھنے کی لذت پر فتح پالو۔ چوں کہ حواسِ خمسہ کی لذات کا اسیر کسی بھی لمحے اسی طرح گمراہ ہو سکتا ہے، جیسے لذاتِ نفسانی کا شکار۔ اس کے علاوہ جین مت میں عدم تشدد کا تصور حیرت انگیز طور پر بلند ہے۔ ذی روح کو اذیت دینا تو درکنار، پیڑ پودوں، ہر طرح کی نباتات اور موجودات کو بھی گزند پہنچانے کی سخت ممانعت ہے۔"

میں اپنی تخیلاتی رو میں بہتا چلا گیا۔ یاد ہی نہ رہا کہ لمحہ موجود میں واحد سامع، پابندِ شرع میری حساس طبع زوجہ محترمہ ہیں۔ عرض کیا: "میرا آبائی تعلق مہاویر کی ماتا جی کے پتا جی کی راجدھانی، مگدھ سے تھا، جہاں میری راجکمار وردھمان سے دوستی ہوئی۔ وہ مجھے اپنے ہمراہ کندھ پور لے گیا۔ راجکماری اشودھا سے بیاہ ہونے کے موقع پر میں شہ بالا بنا اور پاروتی سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ پاروتی کے پتا جی، راج بھون کے دھوبی تھے۔ وہ سندر لڑکی بچپن سے راجکماری کی ہمجولی تھی۔ میں اور پاروتی صرف آنکھوں ہی آنکھوں میں ہم کلام ہوا کرتے، زبانی کبھی بات نہ کی۔ راجکماری کے من میں کیا سمایا کہ اپنے پتی راجکمار وردھمان کو ہم نوا بنایا اور چھوٹے ہوتے کی سکھی پاروتی کو میرے سنگ بیاہ دیا۔ راج بھون میں ہم پتی پتنی کے سمبندھ میں بندھ کر بھی صرف ایک دوسرے کو دیکھا کرتے۔ برش پر برش بیت گئے مگر نیناں کی پیاس نہ بجھی۔ راجکمار جب تیس برش کا ہوا تو ایک رات راج بھون سے غائب ہو گیا۔ بڑی ڈھونڈ مچی۔ پتا چلا کہ راج پتر کسی گوسالہ نامی بھکشو کے پاس دھیان گیان میں مگن ہے۔ بہت پرچایا مگر وہ لوٹ کے راج بھون نہ آیا۔ تیرھویں برش وہ اجوپالکا ندی کنارے کیول ہی دھونی رمائے جوگ بھیاس میں گم، آخر کو نروان پا گیا۔

میں اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا: "جین مت میں اور بھی خوبیاں دیکھیں۔ وہ ذات پات کو نہیں مانتے۔ صرف سبزی کھاتے۔ ایسا پیشہ اختیار نہ کرتے، جس میں ذرا سے تشدد کا عنصر بھی شامل ہو۔ منہ اس لیے ڈھانپ کے رکھتے کہ ہوا میں اڑتا کوئی بہت چھوٹا کیڑا سانس کے ذریعے اندر کھینچ کر تلف نہ کر بیٹھیں۔ راہ چلتے آگے آگے جھاڑو دیتے جاتے، یا پیروں تلے روئی کے گالے باندھ لیتے، مبادا زمین پر رینگتا حشرہ کچلا جائے۔ آخرکار میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ایسی کڑی پابندیاں ناقابلِ عمل ہیں۔ میں پتنی کو ہمراہ لے کر اپنی دنیا میں لوٹ آنا چاہتا تھا مگر راجکماری نہ مانی۔ کہنے لگی کہ وہ پہلے ہی بجوگی ہے۔ راجکمار نے نراش کر دیا۔ پتی بنا بھلا کیا جیون؟ ایسے میں ہمجولی کو بھی چھوڑ دوں، یہ ہم کبھی نہ ہونے دیں گے۔ تم آج سے تنکا توڑ کے دوہرا نہ کرو مگر پاروتی کے سنگ جیون پورا ادھر راج مندر میں رہو۔ راج بھون میں میرا اور پاروتی کا عہدہ وہی تھا جو آج کل ایوانِ صدر میں کیئر ٹیکر کا ہوتا ہے۔ جین مت سے پہلے کے اور ہم عصر تیرتھنکروں کے عقائد میں بھی صفائی کا تصور اور معیار بے انتہا اونچا تھا۔ حصولِ علم کے بعد باقی کی عمر، زندگی کو جسمانی روحانی صفائی پاکیزگی طہارت اور تقدیس سے مملو کرنے میں گزار دی جاتی تھی۔ پاروتی اور میں خود بھی صفائی کے معاملے میں بہت زیادہ حساس تھے۔"

میں نے دیکھا کہ بیوی کی ڈبڈبائی ہوئی چھتی چھتی آنکھوں سے آنسوؤں کی دولڑیاں گالوں پر بہہ نکلی ہیں۔ مجھے رنج پہنچا۔ سوچا کہ بات کو مختصر کردوں۔ لہٰذا شعوری کوشش سے خود کو تخیلاتی کیفیت سے نکالا اور لہجے میں محبت کی مزید شیرینی گھولتے ہوئے کہا: ”میری عمر پچاس برس ہونے کو آئی تھی۔ گویا چند برسوں میں ضعف اور نقاہت آ لیتی اور ایک دن راج بھون میں ہی پرلوک سدھار جاتا۔ آخر موقع پا کر میں بھی ایک رات اسی طرح نکل آیا، جیسے مہاویر غائب ہوا تھا۔ راتوں رات بھکشو کے بھیس میں جنا تیرکا کی عملداری سے نکل آیا۔ اگلے دن بھوجن کے واسطے جس دوار کنڈی چھنکائی، بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ چھوٹی سی بستی تھی۔ جمگھٹا ہو گیا۔ ایک ششیہ بھی ساتھ ہو لیا۔ بستی والوں نے پوچھا: بھکشو جی! کدھر کا خیال ہے؟ بتایا کہ بہت دور دیس پنجاب کی راجدھانی لوہور اور اس سے بہت آگے۔۔۔ سیانے بتاویں، لوہور سے ڈیڑھ دو سو کوس پر ٹکشلا سے ایک منزل اِدھر جہلم اور سندھ ساگر کے بیچ پوٹھوار میں راولوں کی بستی ہے، امنڈا نام کی، وہاں بڑے بڑے پورانک ملیں۔ ٹکشلا سے آگے اور بھی پوجیہ مان جگہیں ہیں۔ سرائے کالا، بھڑ، سرکپ، سرسکھ اور جانے کیا کیا۔ امنڈا میں ایک شتاودھان کی بڑی دھوم سنی۔

”جان! آپ ٹھیک ہیں ناں!“ بیوی نے متفکر لہجے اور لرزتی آواز میں پوچھا۔ مجھے احساس ہوا کہ بار بار اجنبی دنیا میں بھٹک کر غیر مانوس لفظیات بولنے لگ جاتا ہوں۔ تشفی آمیز لہجے میں کہا: ”میں بالکل ٹھیک ہوں جان! مختصر یہ کہ میں امنڈا لوٹ آیا۔ یہی راولپنڈی جو آج کا بہت بڑا شہر ہے۔ لاہور پہنچنے تک چودہ اور ششیہ ساتھ ہو لیے تھے۔۔۔ او مائی گاڈ! میں پھر بہک گیا۔ ششیہ طالب علم کو کہتے ہیں۔“

بیوی روتے ہوئے بولی: ”اللہ کا آخری اور سچا دین ہوتے ہوئے آپ کن بے سروپا عقائد سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ ہمیں ہر دم سجدہ شکر بجا لانا چاہیے کہ اللہ نے ہمیں مسلمان پیدا کیا۔ ان فاسد خیالات کو ذہن سے نکال باہر کریں اور اللہ سے معافی مانگیں۔ آپ کے دماغ پر شیطانی قوت کا غلبہ ہو جاتا ہے۔“

اچانک کسی خیال کے زیر اثر بیوی نے چونک کر زخمی نگاہوں سے مجھے یوں دیکھا گویا جگر کٹ گیا ہو اور بول پڑی: ”میں جوانی میں ڈاکٹر روبینہ کا سن کے روتی تھی اور جرمن شیفرڈ والی دیسی میم جو ہر روز آپ کو پھانسنے کی کوشش میں نکل پڑتی۔۔۔ پتا نہیں اور کتنی لفنگیاں پیچھے پڑی ہوئی تھیں۔ اب یہ نئی آ گئی ایشو مارانی۔ زمانے کی نظروں میں دھول جھونکنے کی خاطر دھوبی کی مسکین بیٹی پاروتی کو آپ کی بیوی بنا دیا۔ اس کو صرف آنکھوں ہی آنکھوں میں دیکھنے کی اجازت دی ہوگی۔ خود مزے سے تیس بتیس سال تک آپ کو دبائے رکھا۔ حرافہ خصم کی کمی میرے شوہر سے پوری کرتی رہی۔“

بیوی فرطِ غم سے بلبلا اٹھی۔ میں نے بانھوں میں بھر کے سینے سے لگا لیا۔

خالد فتح محمد

مرزا کا گھر

مرزا کا گھر کھلا، دل بڑا اور دسترخوان وسیع تھا۔ بیٹھک میں ہر شام وہاں آنے والے اکٹھے ہونا شروع ہو جاتے۔ یہ اکٹھ گرمیوں میں شام سات بجے اور سردیوں میں چھ بجے سے شروع ہوتا۔ مرزا نے شام کی اِن محفلوں کے لیے ایک الگ کمرہ رکھا ہوا تھا۔ کبھی کبھار مرزا کو ذاتی یا خاندانی مجبوریوں کی وجہ سے شہر سے باہر بھی جانا پڑتا لیکن اُس کی غیر حاضری میں بھی سب اکٹھے ہو کے اپنی محفل برپا رکھتے۔ وہاں ایک میز پر گرم پانی سے بھرے دو بڑے تھرموس، پیالے، چمچ، ٹی بیگ اور خشک دودھ پڑے ہوتے، ایک کونے میں فرج تھا جس میں پانی کی بوتلیں ہوتیں اور ساتھ پڑی میز پر درجن گلاس رکھے ہوتے۔ دوسرے کونے میں ایک سنک تھی جس میں پیالے یا گلاس دھوئے جاتے۔ مرزا چوں کہ شوگر کا مریض تھا اس لیے سب کو پھیکی چائے پینا پڑتی۔ چائے میٹھا کرنے کا طریقہ زیادہ خشک دودھ ڈالنا تھا۔ پورے دس بجے کھانے کا اعلان کیا جاتا اور یہ خبر دینے کے لیے وہ دروازے میں سے جھانک کے شرمائی ہوئی آواز میں کہتی: کھانا تیار ہے۔ جن لوگوں نے اپنے گھروں میں کھانا کھانا ہوتا وہ رخصت لے کے چلے جاتے اور باقی ساتھ والے کھانے کے کمرے میں داخل ہو جاتے۔ یہ کوئی پُرتکلف دعوت نہیں ہوتی تھی: اُبلے ہوئے چاول، دال، کسی قسم کا سالن، چپاتیاں اور کسی دِن میٹھا ہوتا۔ وہ گفتگو جو کھانا لگ جانے کے اعلان کے ساتھ منقطع ہو گئی تھی کھانے کے دوران میں پھر شروع ہو جاتی۔ مرزے کی بیٹھک میں آنے والے کسی خاص نظریے سے تعلق نہیں رکھتے تھے اور نا ہی مرزا کا اپنا کوئی نظریہ تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ لوگ اُس کے پاس آئیں، اُس کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوں اور اگلے دِن وہاں ہونے والی بحث کا شہر میں چرچا ہو۔ مرزا کی کوئی سیاسی وابستگی بھی نہیں تھی۔ اُس کے پاس بائیں اور دائیں بازو کے انتہاپسند، روشن خیالی میں یقین رکھنے والے، دونوں انتہاؤں کے بیچ درمیانی راستے پر چلنے والے، غیر نظریاتی لوگ، صنعت کار، سرمایہ دار، دکان دار اور دانشور جن میں شاعر، فکشن نگار مصور اور گلوکار شامل تھے، آتے۔ وہاں مباحثے ہوتے لیکن کوئی فیصلہ نہیں کیا جاتا تھا۔ مرزا کی کرسی مخصوص تھی اور کبھی کوئی اُس کرسی پر نہیں بیٹھا تھا۔ جب اِن محفلوں کا آغاز ہوا تو چند ایک نوجوانوں نے اُس کرسی پر بیٹھنا چاہا اور وہ چند ایک مواقعوں میں سے تھا جب مرزا نے اپنی شدید ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے اُنھیں اُٹھ جانے کو کہا۔

مرزے کا باپ ایک معمولی حیثیت کا آدمی تھا اور اُس کی اپنے محلے میں کریانے کی چھوٹی سی دکان تھی۔ اُس کا اُٹھنا بیٹھنا اُن لوگوں کے ساتھ تھا جن کی شہرت اچھی نہیں تھی اور نا صرف محلے والے، مرزے کے گھر کے افراد بھی اُس کے اُن کے ساتھ تعلق کو پسند نہیں کرتے تھے۔ چوں کہ بڑا مرزا ایک سخت مزاج آدمی تھا کسی نے براہِ راست کہا نہیں لیکن یہ تعلق سب کو کھٹکتا تھا۔ پھر یہ تعلق ایک دم ختم ہو گیا۔ تعلق کے اِس اختتام پر کئی ایک افواہیں یا قصے مشہور رہے لیکن کوئی بھی اِن کے سچے ہونے کی تصدیق نہیں کر سکا۔ عام خیال یہی تھا کہ مرزا جوئے میں اُن کی آخری پائی تک جیت گیا تھا اور وہ چوں کہ جرائم کی دنیا کے پیشہ ور کھلاڑی تھے، اُنھوں نے اپنی ہار اپنی دنیا کا معمول سمجھا، وہ جیت بھی سکتے تھے، اِس لیے وہ دوبارہ کبھی دیکھے نہیں گئے۔ مرزا کے باپ نے کرائے کی دکان خرید لی اور میونسپل کارپوریشن میں اپنے نو حاصل شدہ سرمائے میں سے کچھ خرچ کر کے محلّہ میں کسی اور دکان کا کھولے جانا غیر قانونی طے کروا لیا اور اِس طرح اپنی اجارہ داری کا آغاز کیا۔ یہ ایک طویل سفر تھا جو اُس نے تیز رفتاری سے طے کیا اور جلد شہر میں ڈیپارٹمینٹل سٹور کھولنا شروع کر دیے۔ مرزا اُس کی واحد اولاد تھی جسے اُس نے کاروبار میں ڈالنے سے پہلے اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ اُس کے باپ کو اپنی زندگی میں یہی ایک کمی محسوس ہوتی تھی جو اپنے بیٹے میں پوری کر دی۔ مرزے نے جب کاروبار سنبھالا تو اُس نے اپنی جدت پسندی سے ڈیپارٹمینٹل سٹوروں کو ایک نیا رُخ دیا۔ اکاؤنٹ سے لے کے سیلز تک کا تمام عملہ لڑکیوں پر مشتمل کر دیا۔ ہر سٹور میں چند میزوں کی کوفی شاپ کھول دی جہاں کبھی جگہ خالی نہیں رہتی تھی۔ اپنے سلاٹر ہاؤس کھولے جہاں گھر کے تیار کیے گئے بکروں کا گوشت بنایا جاتا اور بکروں کے ریوڑوں کے لیے دیہات میں جدید طرز کے بکر خانے بنائے۔ یہ بھی ایک طویل سفر تھا اور مرزا نے اپنے باپ کی طرح اِسے بھی تیز رفتاری کے ساتھ طے کیا۔

مرزا نے جب شام کی محفلوں کے آغاز کا فیصلہ کیا تو اُس نے سب سے پہلے میرے ساتھ مشورہ کیا۔ آگے چلنے سے پیشتر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مرزے نے میرے ساتھ مشورہ کیوں کیا؟ جن دنوں میں مرزے کے باپ کی کریانے کی دکان تھی تو ہم دونوں اکٹھے گھوما کرتے تھے۔ میرے گھر کے مالی حالات اُس سے قدرے بہتر تھے اور دن کا ایک کھانا وہ ہمارے ہاں ضرور کھاتا۔ مرزا مجھے کبھی اپنے ہاں کھانا کھلانا چاہتا لیکن میری ماں کی طرف سے ایسا کرنے پر سخت پابندی تھی۔ ماں کو میرے مرزے کے ساتھ گھومنے پر قطعاً کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں اُس گھر میں کھاؤں جہاں کی کمائی میں مکمل حلال شامل نا ہو۔ مرزا کبھی کبھار ضد بھی کرتا کہ اُس نے میرے لیے خصوصی طور پر کھانا بنوایا ہے اور مجھے اُس کا دل توڑتے ہوئے تکلیف بھی ہوتی لیکن میں ماں کی بات کو کسی حد تک غلط بھی نہیں سمجھتا تھا۔ سکول سے چھٹی کے بعد ہم

سارا دن گلیوں میں گھومتے۔ مرزا شلوار کی طرز پر پائجامہ پہنے ہوتا اور اُس کے پاؤں میں مچھلی کی شکل کے سیاہ رنگ کے سلیپر ہوتے جو ایڑھی پر سے گھِس جانے کی وجہ سے آدھا نمبر چھوٹے محسوس ہوتے۔ میں بستہ گھر میں رکھ کے فوراً اپنی نیکر قمیص اور پی ٹی شوز پہنتا۔ گرمیوں کی جلتی ہوئی دوپہروں میں مرزا کی ماں ہمیں گھر سے باہر نکلنے نہیں دیتی تھی۔ میں یہ وقت اُس کے ساتھ گزارنے کو ترجیح دیتا کہ میری ماں دوپہر کو سوتی نہیں تھی۔ وہ ایک گھسا ہوا کرتا پہن کے پنکھے کے نیچے بیٹھے دوپہر گزار دیتی تھی اور ہمارے لیے گھر سے نکلنا مشکل ہوتا تھا۔ مرزا کی ماں ہمیں باہر نہ جانے کا حکم دے کے خود سو جاتی اور ہم وہی کرتے جو ہمیں کرنا چاہیے تھا۔ اُن دوپہروں میں بھی ہمیں بیٹھک میں جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ وہاں متواتر دبی دبی بھاری قسم کی مرد آوازیں آتی رہتیں اور ایک دن میں نے مرزا سے اُن آوازوں کے متعلق پوچھا تو پہلے اُس کا رنگ زرد ہو گیا اور پھر اُس نے کہا کہ اُس کے باپ کے کوئی مہمان چند دن ٹھہرنے کو آئے ہوئے تھے۔ مجھے لگتا کہ وہ مہمان تو چند دنوں کے بجائے وہاں مستقلاً آباد تھے۔ محلے میں کریانے کی دکان ملازم چلاتا تھا اور شام کو مرزا کا باپ ایسی تفصیل سے حساب لیتا کہ ملازم کے چھکے چھوٹ جاتے۔ مرزے کے باپ کو دکان میں پڑی ہر چیز کی تعداد اور قیمت زبانی یاد تھی اور کوئی ملازم بھی اُسے دھوکہ نہیں دے سکتا تھا۔

مرزا کی ماں جب سو جاتی تو ہم اپنے مشن پر نکلتے۔ وہ عجیب قسم کی بے راہ روی کے دن تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ کون سی عمر رسیدہ عورتیں ٹانگیں دبوانا پسند کرتی ہیں اور ہم ٹانگیں دباتے کسی خفیہ جگہ تک پہنچ جاتے جس کے لیے ہمیں گالیاں تو بہت دی جاتیں لیکن نہ ہی گھر سے نکالا جاتا اور نہ ہی شکایت لگا دینے کی دھمکی پر کبھی عمل درآمد ہوتا۔ ہمیں معلوم تھا کہ کون سے گھروں کے لوگ دوپہروں کو گھوڑے بیچ کے سوتے ہیں، ہم اُن گھروں کی باہر لگی گھنٹیاں دباتے یا کنڈیاں کھڑکاتے اور جیسے ہی دروازہ کھولے جانے کی آواز آتی تو ہم وہاں سے ہٹ جاتے۔ ہمارے اوسان اُس وقت تک خطا رہتے جب تک ہمیں یقین نہ ہو جاتا کہ کوئی ہمارے پیچھے نہیں آ رہا۔ اُس پکڑے جانے کے خوف کے انتظار میں اتنی لذت تھی کہ میں آج تک نہیں بھول سکا ہوں۔

ایک دن مرزے کی بیٹھک سے آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ مجھے حیرت تو ہوئی لیکن میں نے پوچھا نہیں۔ اگلے دن بیٹھک کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور مرزا کی ماں نے ہمیں وہاں جا کے کھیلنے کو کہا۔ مجھے اِس حکم نامے سے ایسی خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر تھا۔ کمرہ اُسی طرح تھا۔ عورت کے لمس کا کہیں سے بھی احساس نہیں ہوتا تھا۔ کمرے کو پرانے انداز میں دیکھ کے مجھے حیرت ہوئی۔

مرزے کا باپ اب دکان پر بیٹھنے لگا اور کچھ عرصے کے بعد وہاں سامان میں بڑھوتری ہونے لگی۔ اب محلے والوں کو قدرے مہنگے سودوں کے لیے دوسری جگہوں پر نہیں جانا پڑتا تھا، سب کچھ اُن کی اپنی دکان

میں واجبی سی کم قیمت پر میسر تھا۔

مرزے کو اب حکم ملا کہ وہ مجھ سے دور ہو جائے۔ مرزا یا میں ایک دوسرے سے دور نہیں ہو سکتے تھے۔ اُس چھوٹی سی عمر تک ہم اتنے کچھ کی ساجھے داری کر چکے تھے کہ ہمارے لیے ایک دوسرے کو چھوڑنا ممکن نہیں تھا۔ اب ہم سکول سے غائب ہو جاتے اور اپنے محلے میں گھومنے کے بجائے ساتھ والے محلے میں وقت گزارنے لگے۔ شاید یہ گلیوں میں گھومنا اور لوگوں کے بارے میں جاننا ہی مرزا کے گھر میں بپا ہونے والی مجلسوں کا پیش خیمہ تھا۔

اچانک حالات نے ایک نئی کروٹ لی۔ مرزا کے باپ نے محلے والی دکان بند تو نا کی لیکن شہر کے ایک جدید علاقے کے پلازے میں سٹور کھول لیا جس میں ہر قسم کے گاہک کی ضروریات موجود تھیں۔ اُس نے ہر وقت سر پر کروشیئے کی بنی ہوئی ٹوپی پہننا شروع کر دی اور پابند نماز ہو گیا۔ اچانک اُس کا شمار شہر کی اشرافیہ میں ہونے لگا اور مرزا کو محلے کے سکول سے اُٹھا کر ایک مشہور انگریزی سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ مرزا کے سکول کی یونیفارم ہی ایسی تھی کہ مجھے اُسے ملتے ہوئے احساس کمتری ہونے لگا لیکن اُس کے ہونٹوں پر وہی میٹھی مسکراہٹ ہوتی جو آنے والی زندگی میں اُس کا نشان بن گیا۔ ہم اب بھی پرانے تعلق کی طاقت پر ایک دوسرے سے ملتے اور ہمارے بیچ کوئی جھجک یا دوری کبھی در نہیں آئی لیکن پھر بھی مجھے ایک ایسی دوری کا احساس ہوتا جو ہمیں تقسیم کیے جا رہی تھی گو ہم دور نہیں تھے۔ وہ جب اپنے سکول کی باتیں سناتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ میں جواب میں کیا سناؤں؟ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک کے جاہ طلب لوگوں نے باہر جا کے قسمت آزمانا شروع کر دی۔ میں نے بھی اِس سلسلے میں ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیے۔ مرزا کو میری اِن کوششوں کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا اور میں سوچا کرتا کہ اگر میں کسی طور اُس کی شمولیت قبول کر لیتا تو مجھے شاید اتنی بھاگ دوڑ نہ کرنا پڑتی۔ میرے اندر شاید اُس کا مقابلہ کرنے کا مخفی قسم کا جذبہ سر اُٹھانے لگا تھا۔ میں اُسے کسی بھی طرح شکست نہیں دینا چاہتا تھا لیکن اِس کے ساتھ ہی اُس کی برتری بھی ختم کرنا چاہتا تھا۔

مرزے کے باپ کے پاس راتوں رات کہاں سے اتنا پیسہ آ گیا؟ گو لوگ قیافہ آرائی ختم کر چکے تھے لیکن سب اُسے بھولے نہیں تھے۔ میں جب یورپ گیا تو اپنے شہر کا جو بھی رہائشی ملتا تو پیچھے کے حالات پر تبادلہ ضرور ہوتا۔ میں نے کبھی کسی کو مرزے کے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں نہیں بتایا تھا لیکن میری کوشش ہوتی کہ اُن کا ذکر نہ آئے۔ اُس ذکر کو روکنا میرے لیے ممکن نہیں ہوتا تھا اِس لیے میں ہاں میں ہاں ملائے جاتا اور ذاتی علم کو افواہوں کا حصہ بنا کر اپنی رائے دیتا۔ وہاں عارضی قیام کے لیے آئے ہوئے لوگ مغرب کے احتسابی عمل کو اپنے لیے مشعل راہ بنائے ہوتے۔ میں جانتا تھا کہ یہ لوگ واپس وطن جاتے ہوئے قطار میں

لگ کے ہوائی جہاز میں سوار ہوتے ہیں کیوں کہ ایسا کرنا مغرب کا دستور تھا اور یہی لوگ اپنے ملک میں یہاں کے دستور اور رواج کے مطابق اُترتے ہیں۔ میں مرزے کے باپ کی شب بھر میں اپنے کاروبار کو بامِ عروج پر لے جانے کی حمایت نہیں کر رہا لیکن میں اُسے رد بھی نہیں کر رہا کہ جیسا دیس ویسا بھیس۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہاں جانے کے بعد بھی مجھے اپنے شہر سے گئے لوگوں کی زبانی اُن کے بارے میں خبریں ملتی رہتیں جنھیں بتانے والے اُن کے زوال کے خواست گار تھے اور میں ایسا چاہتے ہوئے بھی ایسے نہیں چاہتا تھا۔ میں جب بھی ایسی گفتگو سنتا تو میرے اندر ایک انتقامی آگ سلگنے لگتی جس میں مرزوں کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ میں اُن لوگوں کو شکست دینا چاہتا تھا جن کے اپنے معیار غیر قانونی بنیادوں پر استوار تھے۔ اُن کی اکثریت وہاں ناجائز طریقوں سے آئی تھی اور اُنھیں مرزے جیسے لوگوں کی کامیابی کھلتی تھی کیوں کہ مرزوں نے ملک میں غیر قانونی ذرائع سے اُنھیں شکست دے دی تھی۔

میں وہاں قانونی طریقے سے گیا تھا اور میری جمع کی ہوئی رقم بھی جائز تھی۔ میں جب وطن لوٹا تو میرے پاس کافی رقم تھی لیکن وہ اتنی بھی نہیں تھی کہ میں مرزے کا مقابلہ کر سکتا۔ جس گلی میں ہمارا گھر تھا وہ اتنی چوڑی تھی کہ اُس میں سے کار گزر سکتی تھی۔ میں جب یہاں سے گیا تھا تو تب اتنی چوڑی نہیں لگا کرتی تھی کیوں کہ کئی گھروں کے سامنے بھینسیں بندھی ہوتی تھیں جو اپنے حجم کی وجہ سے گلی کو تنگی دیتی تھیں۔ مرزا کا گھر اگلی میں تھا اور میں نے ایک رات کسی جاسوس کی طرح وہاں کا چکر لگایا۔ اُن کا گھر اندھیرے میں تھا اور گھر کے اردگرد سے بے آبادی کی بو اُٹھ رہی تھی۔ دکان پرانی جگہ پر ابھی تک قائم تھی اور اُس پر لگا ہو "مرزا اینڈ فیملی" کا بورڈ مجھے وہی لگا جسے میں بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔ میرے گھر کے ساتھ پانچ مرلے کا ایک گھر تھا جس کے رہائشی لاہور چلے گئے تھے اور اُنھیں ہمارے چھوٹے سے شہر میں واپس آنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے اُس گھر میں دلچسپی تھی اور میں نے کسی کی معرفت اُسے خرید کر وہاں کار پورچ اور ایک چھوٹا سا لان بنالیا جس میں امریکن گھاس لگا دی۔ جب لان مکمل طور پر سبز ہو گیا تو میں نے مرزے سے رابطہ کیا۔ وہ مجھے مل کر اتنا خوش ہوا کہ میں سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ زندگی میں اکیلا ہے اور اُس کا کاروبار ہی اُس کا ساتھی تھا۔ اور جیسے ایسی ملاقاتوں میں ہوا کرتا ہے، ہم گلیوں میں آوارہ پھرنے والے بچے بن گئے اور جو باتیں بھول چکے تھے اُنھیں یاد کر کے کبھی قہقہے لگاتے اور کبھی اشک بار ہو جاتے۔ اُس کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔ بیٹا ملک میں نہیں تھا اور اُس نے آہ بھر کے بتایا کہ وہ آنا بھی نہیں چاہتا۔ اُس نے وہیں شادی کر لی تھی اور وہ ہر سال اپنے خاندان کے ساتھ کچھ دِن ٹھہرنے کے لیے آتا۔ مرزے نے بتایا کہ اُسے بھی بیٹے میں ایسی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ اُس کے لیے اُداس ہوتا۔ بیٹیاں اچھے خاندانوں میں آباد تھیں اور اُنھیں اپنے باپ کی جائیداد

میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے ایک دن مرزے کو اپنے گھر بلایا اور وہ اُس پرانی گلی کو خاموش کھڑا کچھ دیر دیکھتا رہا۔ اُس کے ذہن میں جو طوفان وجود پا رہا تھا میں اُس سے واقف تھا۔ ہم دونوں خاموش کھڑے رہے جیسے کسی عزیز کی لاش کے پاس کھڑے ماضی میں گم ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک دم وہ ”ریوری“ سے باہر آیا اور اپنی موجودگی ظاہر کرنے کے لیے ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگایا۔ ہم جب گھر میں گئے تو ہر طرف پھیلی خاموشی اُسے اجنبی لگی۔ میرے والدین بھی اُس کے والدین کی طرح اوپر جا چکے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ ارد گرد میری بیوی یا بچوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں نے شادی نہیں کی اور نا ہی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ اُس کے لیے ایک صدمہ تو تھا لیکن تھوڑی دیر کے بعد اُس نے صرف اتنا ہی کہا کہ وہ ہمیشہ میری حقیقت پسندی کا قائل رہا ہے جس سے میری اپنے ایک ہم خیال سے ایک اہم ملاقات ہوئی۔

میرے گھر میں ہونے والی چند ملاقاتوں میں مرزا کے گھر میں برپا کی جانے والی محفلوں کا فیصلہ کیا گیا!

مرزا اکثر شام کو مجھے ملنے آتا اور ہم اندھیرا ہونے کے بعد اُن تمام گلیوں میں گھومتے جہاں ہم ایک زندگی جی چکے تھے۔ ہم اُن گھروں کو بھی دیکھتے جہاں جوانی سے آگے نکل جانے والی عورتوں کی ٹانگیں دبایا کرتے تھے اور اُن گھروں کو بھی جن کی گھنٹیاں بجا کے یا کنڈیاں کھٹکھٹا کے بھاگ جایا کرتے تھے۔ یہ معصوم یادیں ہمیں ہمیشہ اُداس کر جاتیں اور ہم دور تک اپنے ہی اندر کی خاموشی سے دست و گریباں ہوتے خاموش چلتے رہتے۔ میری زندگی میں اپنی ہی بوئی ہوئی پژمردگی تھی اور اُس کی زندگی میں حالات نے ایک پھیکے پن کی پچکاری چلا دی تھی۔ ہم شاید مختلف حالات میں سے گزرتے ہوئے زندگی کے ایسے نقطے پر آن ملے تھے جس سے آگے چلنے کے لیے ہمیں ایک دوسرے کے سہارے کی ضرورت تھی۔ اس لیے یہ مزید اہم ہو گیا تھا کہ مرزے کی اُس سوچ کو کامیابی سے ہمکنار کروایا جائے۔ شروع میں لوگوں کو وہاں کی جانے والی گفتگو سے زیادہ میز پر سجی دعوت میں دلچسپی تھی۔ شام کو طرح طرح کے لوگ وہاں آتے اور ہمیں اپنے منصوبے کی افادیت پر شک گزرنے لگتا۔ لیکن ہم نے مرزا کی محفلوں کو شہر کی منفرد بیٹھک بنانے کا تہیہ کیا ہوا تھا چناں چہ جو بھی غیر ضروری لوگ آتے ہم نے اُنھیں چلتا کرنے کا فیصلہ کر کے اُس پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ اُن کے سرپرستوں کو یہ پسند نہیں آیا لیکن ہم بھی اپنے فیصلے پر قائم رہے اور فلٹریشن کا سلسلہ جاری رکھا۔ آہستہ آہستہ وہ لوگ جو تعقلی طور پر بیٹھک کے معیار پر پورے نہیں اُترتے تھے آنا کم ہو گئے۔ مرزا وہاں سے ہر شعبے میں قائد پیدا کرنا چاہتا تھا اور ایک وقت کے بعد شہر کے منظر نامے پر ایسے لوگ سامنے آنے لگے جو وہاں کی بحثوں میں حصہ لیتے رہے تھے۔ وہ کسی نا کسی طرح اپنی کامیابی کا سہرا مرزا کے گھر میں بپا ہونے والی محفلوں کے سر باندھتے۔

وہ شروع میں جب کھانے کا اعلان کرنے آتی تو چند لفظ بولتے ہوئے ایک بھاری جھجک کو بمشکل

بتاتے ہوئے محسوس ہوتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ اُس کے اعتماد میں اضافہ ہونے لگا اور پھر جب کبھی کوئی گرماگرم قسم کی بحث چل رہی ہوتی وہ چپکے سے آ کے بیٹھ جاتی اور بہت غور سے ایک ایک لفظ سنتی۔ میرا نہیں خیال کہ کسی نے اُسے وہاں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ میرے ذمے چند ایک اہم کام دیے گئے تھے جن میں وہاں ہونے والی ہر بحث کو غیر مہذب نہیں ہونے دینا شامل تھا اس لیے میں ہر کسی کو اپنی نظر میں رکھتا اور میری اُس کے ساتھ بھی نظر ملتی رہتی۔ ایک دِن اُس نے سب کو حیران کر دیا۔ اُس وقت عورتوں کے حقوق پر بات چل رہی تھی اور کچھ لوگ عورت کی تضحیک کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہے تھے کہ وہ اچانک اُٹھ کھڑی ہوئی، اتنی اچانک کہ میں بھی نا جان سکا۔ اُس نے کوئی لمبی تقریر نہیں کی بس سب کو اپنی طرف متوجہ کر کے اتنا ہی بتایا کہ وہ وہاں موجود تھی۔ اُس کی آواز میں کسی قسم کی جھجک کا بھاری پن نہیں تھا اور اُس کے بعد بھی کبھی محسوس نہیں ہوا۔ مرزا نے بھی پسندیدگی اور ناگواری کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اُسے دیکھا اور پھر لاتعلق ہو کے اپنے معمول کے آسن میں بیٹھ گیا۔ اب اُس نے باقاعدگی سے اپنی رائے دینا شروع کر دی اور وہ کچھ ہی عرصے میں بیٹھک کا مستقل حصہ بن گئی۔ مرزا کی غیر حاضری کو کبھی محسوس نہیں کیا جاتا تھا شاید اِس لیے کہ وہ گفتگو میں کبھی حصہ نہیں لیتا تھا لیکن اگر کسی دِن وہ نا آئے تو ہر تبادلہ خیال نامکمل لگتا کیوں کہ وہ اب گفتگو کو سمیٹتی تھی۔ کیا اُس نے کسی خفیہ ذریعے سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہوئی تھی؟ میرا دعویٰ تھا کہ میں اُس دنیا کو نہایت احتیاط سے دیکھ چکا ہوں جہاں کامیابی بھی ناکامی کے خمیر میں سے اُٹھتی ہے اور جہاں عورت کو کامیاب ہونے کے لیے مختلف ناکامیاں قبول کرنا ہوتی ہیں۔ مجھے اچانک محسوس ہونے لگا کہ وہ ایک عام عورت نہیں تھی۔ مجھے اُس کے بیٹھنے کے انداز اور اپنے دلائل دیتے ہوئے آواز میں سے ہر طرح کی کم اعتمادی کو دور رکھنا اُس کی تربیت کا حصہ لگا۔

اب وہ وہاں اُسی طرح بیٹھتی جیسے اُس نے وہیں بیٹھنا ہو!

مرزا کی صحت اتنی اچھی نہیں رہنے لگی تھی۔ اُسے کسی قسم کا فوری خطرہ تو نہیں تھا لیکن اُسے پریشانی ضرور رہتی کہ وہ صحت مند نہیں تھا۔ اب اُسے اپنے بیٹے کا اتنا دور ہونا ایک کانٹے کی طرح چبھتا۔ وہ کہا کرتا کہ ہم دونوں اِسی ملک میں رہتے ہوئے کامیابی کی اپنی اپنی حدود کو چھو چکے تھے جس میں اُس کی کامیابی میں اُس کے باپ اور میری میں میری اپنی منصوبہ بندی شامل تھی۔ اُس کے بیٹے کے لیے یہاں ایک کامیاب کاروباری سلطنت تھی جس کا اُس نے سربراہ بننا تھا لیکن وہ وہیں کا ہو کے رہنا چاہتا تھا جہاں وہ تھا۔ اُس نے اپنی جڑیں وہیں مضبوط کر لی تھیں۔ مرزا اب سوچتا کہ وہ اپنی اِس سلطنت کا کیا کرے؟ یہ سب تو تھا لیکن مرزا اپنی سلطنت کو کسی طرح بھی زوال تک آنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے پورے نظام کی مکمل توجہ کے ساتھ نگرانی کر رہا تھا۔ وہ اتنا بے رحم یا اعلیٰ معیار پسند تھا کہ اپنے کسی سٹور پر اگر بلب کو بجھا ہوا پاتا تو پوری شفٹ کی ملازمت کی وہ

آخری شام ہوتی۔ وہ کسی قسم کی نااہلی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے بعض اوقات یہ بھی لگتا کہ وہ بیمار نہیں ہے اور اُس نے بیماری کا ایک ڈرامہ رچایا ہوا ہے اور یا وہ حقیقت میں بیمار ہے لیکن بیماری اُس کی زندگی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ شام کی محفل کے آغاز تک وہ اپنے کاروباری معاملات میں اُلجھا رہتا اور تھک کے سوجانے کے بجائے شام کو وہاں لوگوں کو بحث کر کے سنتے ہوئے اپنے کھچے ہوئے اعصاب کا تناؤ کم کرتا۔ میں محسوس کرتا کہ یہ محفلیں اب اُس کے لیے ایک نشہ بن چکی تھیں۔

وہ عورت کون تھی؟ میں مرزا سے پوچھنا چاہتا تھا۔ مرزا نے اپنی بیوی کا بھی کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔ مجھے تجسس ضرور تھا لیکن میں نے کبھی جاننا مناسب نہیں سمجھا۔ اُسے کسی نے کبھی دیکھا نہیں تھا اور نہ ہی کبھی ذکر ہوا۔ اتنا ضرور تھا کہ وہ زندہ تھی کیوں کہ کسی نے اُس کی نمازِ جنازہ میں شرکت نہیں کی تھی۔ مرزا کا ہر وقت مصروف رہنا اس بات کی گواہی تھا کہ وہ گھر میں کم سے کم وقت گزارتا ہے۔ اُس عمر میں اتنی محنت تب ہی کی جاسکتی تھی جب زندگی میں کوئی دل چسپی یا وابستگی نا ہو اور صرف کاروبار ہی اوڑھنا بچھونا ہو۔ مجھے مرزا پر ترس آتا اور رشک بھی کہ وہ کتنی ان تھک زندگی گزار رہا تھا۔ میں بھی اُس کی طرح مصروف رہنا چاہتا تھا لیکن پھر سوچتا کہ اگر میں بھی ویسا ہی مصروف ہوگیا تو ہم دونوں میں فرق کیا رہے گا؟ میں اُس کا قریب ترین دوست ہونے کے باوجود اُسے بیمار، غیر وابستہ اور فارغ دیکھنا چاہتا تھا، میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اُس کا کاروبار کسی کمزور عمارت کی طرح ڈھے جائے۔ میرے اندر زمانوں سے چھپی ہوئی ایک بغاوت تھی۔ میں نے جو بھی حاصل کیا اپنی محنت سے کیا جب کہ مرزا کو اُس کے باپ نے اُس چھوٹی سی بیٹھک میں سے حاصل کردہ دولت کے ایک انبار پر براجمان کر دیا تھا۔ وہ دولت کتنی تھی اور اُس نے کن لوگوں سے حاصل کی تھی؟

مرزا نے شام کی محفل کچھ دنوں کے لیے برخواست کی اور مجھے اپنے ساتھ کہیں چلنے کے لیے تیار کیا۔ مجھے ایک تجسس نے ساتھ چلنے کے لیے اُکسایا۔ ہم ایک طویل سفر کے بعد پہاڑ کی ایک بلند چوٹی پر پہنچے جہاں جنگل کا ایک سمندر تھا۔ ہر طرف درخت ہی درخت تھے؛ آسمان کو چھوتے ہوئے، چٹانی زمین سے سر نکالتے ہوئے اور جوانی کی حدوں کو چھوتے ہوئے۔ اُس سمندر میں ایک جزیرہ تھا جہاں ہم کھڑے تھے۔ اردگرد درختوں پر بندروں کے جمگھٹے تھے جو ہمیں دیکھ رہے تھے؛ کچھ کی نظروں میں حیرت تھی، کچھ کے تجسس، کچھ کے لاتعلقی، کچھ کے جارحیت اور کچھ کے مدافعت تھی۔ میں یہ سب دیکھ کے کچھ گھبرا گیا، میرے جسم میں خوف کی ایک جھرجھری دوڑ گئی؛ ایسے محسوس ہوا کہ مختلف گروہوں کے سرداروں نے اپنے اپنے قبیلوں کو قائل کر کے ہم پر حملہ کر دینا ہے۔ مجھے یہ بھی خوف تھا کہ اردگرد بندروں کے علاوہ خطرناک قسم کے درندے بھی ہو سکتے ہیں۔ مجھے مرزا کے ذہن میں ایسی پریشانی نظر نہیں آئی۔ وہ ایک پرسکون تسلی کے ساتھ، اپنے

اردگرد سے بے نیاز، وہاں ایسے کھڑا تھا جیسے وہ اُس ماحول سے قریبی مانوسیت رکھتا ہو۔ دِن بھی کافی ڈھل چکا تھا اور میں جانتا تھا کہ پہاڑوں پر شام جلد اُتر آئی ہے۔ مرزا ایک بے اعتنائی سے اردگرد دیکھے جا رہا تھا اور مجھے لگا کہ وہ نظارہ اپنی ناتراشیدہ خوب صورتی کے ساتھ اُسے اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے اور وہ میرے اندر سلگتے ہوئے خوف سے لاتعلق یا بے خبر تھا۔ اب ٹھنڈ ہونا بھی شروع ہو گیا تھا۔ تبھی وہ میری طرف دیکھ کے مسکرایا۔ مجھے اُس مسکراہٹ میں شرارت کے ساتھ ایک اسرار بھی نظر آیا۔ ہم نے چند لمحوں کے لیے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ’’تمھیں یاد ہو گا کہ ایک بار میں اپنے باپ کے ساتھ چند دِنوں کے لیے غائب ہو گیا تھا۔‘‘ مجھے اچانک اُس کا غائب ہونا یاد آ گیا۔ ایک دِن وہ سکول سے غیر حاضر تھا اور میں وجہ جاننے کے لیے اُس کے گھر گیا تو اُس کی ماں نے بتایا کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ کہیں گیا ہے اور شام تک آ جائے گا۔ میں مطمئن لیکن تھوڑا سا پریشان گھر واپس گیا کہ وہ کہیں چکر لگانے گیا ہوا ہے جب کہ میں اپنے شہر سے باہر کہیں نہیں گیا۔ میں نے سوچا کہ اگلا دِن دل چسپ رہے گا کہ اُس سے سفر کے بارے میں سوالات کروں گا لیکن مجھے مایوسی ہوئی کہ وہ کئی دِن سکول نہیں آیا اور جب آیا تو میرے کسی سوال کا اُس نے جواب نہیں دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے کئی سال پہلے والے تجسس کا اب جواب ملنے لگا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ’’ہم یہاں آئے تھے۔‘‘ وہ رکا۔ اب اُس کی آنکھوں میں ایک دوری تھی۔ چاروں طرف درختوں پر ٹکے ہوئے بندروں کو ایک نظر دیکھا۔ ’’یہ جگہ بھی اُس جوئے میں جیتی گئی تھی۔ اُن جواریوں میں ایک اِس پہاڑ کا مالک تھا۔‘‘ میرا تجسس اتنا حاوی ہو گیا تھا کہ مجھے بندروں یا دوسرے کسی خطرناک درندے کا خوف نہیں رہا تھا۔ ’’ہم نے آ کے یہ جگہ دیکھی اور اِس پر اپنے مالکانہ حقوق کا پروانہ دکھایا۔ کسی نے اعتراض نہیں کیا اور اِس خالی جگہ پر کوئی درخت نہیں لگایا گیا۔‘‘ مرزا خاموش ہوا۔ اُس نے پھر اردگرد دیکھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ جو دیکھنا چاہتا تھا اُسے نظر نہیں آیا۔ ’’میں اب اِس جگہ کو آباد کرنا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ کچھ جگہیں آباد کیے جانے کے باوجود بے آباد ہی رہتی ہیں اور یہ اُن میں سے ایک لگتی تو ہو گی لیکن میں اِسے ایسے آباد کرنا چاہتا ہوں کہ یہ آباد لگے۔‘‘ میں مرزے کی قوتِ ارادی کو جانتا تھا۔ وہ جو فیصلہ کر لیتا تھا اُس کی تکمیل اُس کی خواہش کے مطابق ہی ہوتی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا کہ وہ اپنی بات جاری رکھے۔ ’’میں یہاں اُس عورت کو آباد کرنا چاہتا ہوں جو ہماری محفلوں میں بیٹھتی ہے۔ وہ یہاں رہا کرے گی۔‘‘ مجھے زندگی میں پہلی بار مرزا اپنے دماغی توازن سے ہلا ہوا لگا۔ وہ عورت یہاں قدرت کے رحم وکرم پر کیا اکیلی رہے گی؟ مرزا اُسے کوئی سزا دے رہا تھا یا کوئی انعام؟ مجھے اچانک خیال آیا کہ وہ عورت ہے کون؟ اور اچانک مرزا نے جنگلوں کے اِس سمندر کے درمیان میں واقع ایک جزیرے میں اُس کا ذکر کیوں کیا؟ مجھے یہ جاننا ضروری لگا۔

''مرزا! تم دماغی طور پر تو ٹھیک ہو؟'' کچھ عرصے سے، یہ عمر کی وجہ سے تھا یا محض اتفاق کہ ہمارے درمیان میں سے اچانک بے تکلفی جاتی رہی تھی اور ہم پہلے جتنا قریب ہونے کے باوجود قریب نہیں رہے تھے۔ مرزے نے میری طرف ایسے دیکھا کہ مجھے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ مجھے ایک لمحے کے لیے اُس کی آنکھوں میں اجنبیت نظر آئی اور پھر اُس کے ہونٹوں پر بچپن والی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دلچسپی سے دیکھتے رہے۔

''کچھ کچھ چل گیا ہے اور کچھ کچھ نہیں چلا۔'' وہ اب ہنس رہا تھا۔ ''میں اُس عورت کو یہاں اس لیے رکھنا چاہتا ہوں کہ میرے لیے اُسے وہاں رکھنا ممکن نہیں۔ اِس لیے نہیں کہ اُس کے وہاں پر رہنے سے لوگوں کے دلوں میں سوال اُٹھیں گے، مجھے اِس کی پروا نہیں ہے؛ یہ اُس کے لیے اچھا نہیں۔'' وہ ابھی تک مجھے دیکھے جا رہا تھا اور مجھے اُس کی باتیں ایک اُلجھن میں ڈالے جا رہی تھیں۔ اُس کے وہاں رہنے سے کیا سوال اُٹھ سکتے تھے؟ کیا مرزا نے اُسے رکھا ہوا تھا؟ اگر ایسا تھا تو اُس کے پاس اتنے ذرائع تھے کہ وہ اُسے کہیں بھی رکھ سکتا تھا مگر یہ جگہ یقیناً مناسب نہیں تھی۔ مرزا یہاں مستقل رہ نہیں سکتا تھا اور اُس کے لیے مستقل رہائش رکھنا ناممکنات میں شامل تھا۔ وہ شاید بندروں سے خوف زدہ ہو کے ہی مر جائے۔

''تم کیا بات کر رہے ہو؟'' میری آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔ ''وہ ہے کون؟'' میری آواز قدرے بلند تھی؛ اتنی بلند کہ بندروں نے بھی ایک لمحے کے لیے اپنی حرکات روک کے ہماری طرف دیکھا اور پھر اپنے معمولات میں لگ گئے۔ مجھے شرمندگی بھی ہوئی۔ مرزا دھیرے سے مسکرایا۔ اِس مسکراہٹ میں ایک برتری بھی تھی اور یہی دزدیدہ قسم کی وہ برتری تھی جو مجھے اُس کا خیر خواہ ہونے کے باوجود اُس کے خلاف اُکساتی رہتی۔

''یہ بھی صرف تمھیں ہی جاننا چاہیے۔'' مرزا ایک لمبی سانس لے کے بولا۔ اُس نے چھاتی میں سانس بھر کے روک لی تھی اور پھر اُسے آہستہ آہستہ نکالا تھا۔ سانس لینے کے اِس عمل کے دوران میں مجھے وہ کسی گہری سوچ میں بھی غرق لگا تھا۔ کیا وہ اپنی بات کہنے سے خائف تھا؟ اُس نے گلا صاف کیا؛ شاید خود اعتمادی کے لیے۔ ہم دونوں لنگوٹیے تھے؛ ایک دوسرے کو پسند کرنے کے باوجود شاید ناپسند بھی کرتے تھے۔ میرے ساتھ اِس انتہا کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے باوجود مجھے اُس میں ایک جھجک محسوس ہوئی اور کسی حد تک خوف زدہ بھی لگا۔ وہ کیوں خوف زدہ تھا؟ ''ہمارے پرانے گھر کی بیٹھک میں جوا ہوتا تھا۔ یاد ہے؟'' اُس کے لہجے میں بے بسی واضح تھی۔ اِس سوال کا میں کیا جواب دیتا! میں بُت بنا اُسے دیکھتا تھا۔ اُس کی خاموشی جب طول کھینچ گئی تو میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''وہاں ایک دِن چند لوگ سب کچھ ہار گئے۔ اگر میرا باپ نا جیتتا تو وہ سب کچھ ہار بھی سکتا تھا۔'' وہ رکا اور مجھے جواریوں کی اخلاقیات پر حیرت ہوئی کہ وہ جو ہارے اُس میں بے ایمانی

نہیں کی۔ ''اگر وہ ہار جاتا تو میں ابھی تک کہیں بھیک مانگ رہا ہوتا یا مر گیا ہوتا یا مار دیا جاتا۔'' اب اُس کی آواز میں تمسخر تھا۔ ''وہ آدمی جو ہارنے کے بعد زیادہ دن نہیں جیا۔ اُس کی ایک بیٹی تھی جس نے ابھی سکول جانا شروع نہیں کیا تھا اور وہ ہمارے پاس آ گئی جو ہم نے تمھیں کیا کسی کو بھی پتا چلنے نہیں دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے حالات میں تبدیلی آ رہی تھی اور تم ہمارے ہاں آنا تقریباً ختم کر چکے تھے۔ اُسے میں نے تعلیم دلوانا شروع کر دیا۔ وہ پڑھائی میں اچھی تھی اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد میرے پاس آ گئی کہ اُس کا اور کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اُس نے آتے ہی گھر کا انتظام سنبھال لیا اور پھر شام کی محفلوں میں بھی آنے لگی۔ بچپن میں وہ ایک مرتبہ یہاں آئی تھی اور اِس جگہ کی خوب صورتی اُس کے ذہن میں نقش ہو کے رہ گئی ہے۔ اُس کے باپ کا ہم پر احسان ہے کہ وہ ہار کے دوسرے لوگوں کی جیبیں بھی خالی کروا گیا۔'' وہ خاموش ہو گیا اور میرے ذہن میں بگولے چلنے لگے اور وہیں کہیں چکر کاٹتی ہوا میں مجھے مرزا کی بیوی کا چہرہ نظر آیا۔ زردی مائل رنگ میں ہلکے سے سرخ رنگ کا چھڑکاؤ جو اُسے اُداسی میں ڈوبا ہوا چمکتا حسن دیتا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ بعض چہرے ایسے ہوتے ہیں جن پر ہر قسم کا رنگ بج جاتا ہے، وہ رنگ اُس چہرے کو نہیں سجاتے۔

''میں نے کہا.... تمھاری بیوی کو ایک عرصے سے نہیں دیکھا۔'' میں نے اپنے تجسس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور ساتھ ہی اپنی ناپسندیدگی کا دزدیدہ قسم کا اظہار کر دیا۔ اُس نے میری طرف خالی نظر سے دیر تک دیکھا جو مجھے لگا کہ وہ مجھے تول رہا ہے۔ جنگل کے اُس جزیرے میں ہوا چلنی شروع ہو گئی تھی اور پتوں میں سے گزرتی ہوئی ہوا سسکیاں لے رہی تھی؛ مجھے بندر بھی کچھ بے چین لگے۔

''میری بیوی نے مجھ سے قطع تعلق کر لیا ہے۔'' اُس نے ایک آہ بھری۔ ''اُسے کسی طور علم ہو گیا کہ ہماری دولت کا منبع غیر قانونی ہے۔ اُس نے خود کو پلید سمجھنا شروع کر دیا ہے اور اب وہ ایک کمرے میں قید ہو کے رہ گئی اور ہر وقت خود کو پھونکیں مار مار کے پاک کرتی رہتی ہے اور میرے باپ کو اور مجھے بد دعائیں دیتی رہتی ہے۔ وہ کھانا بھی مسجد سے منگوا کے کھاتی ہے۔ میں اُسے کہنا چاہتا ہوں کہ مسجد میں کھانا بھیجنے والوں کی کمائی کا منبع شاید ہم سے بھی زیادہ ناپاک ہو لیکن وہ مجھے دیکھتے ہی پردہ کر لیتی ہے، پھر مجھے خیال آتا ہے کہ ناپاکی تو ناپاکی ہوتی ہے، کم یا زیادہ نہیں۔ وہ شاید درست ہو لیکن زندگی میں ایسے ہی ہوتا ہے، جیسے وہ سمجھتی ہے ویسے نہیں۔ کامیابی کی جڑ ناپاکی ہی ہے۔'' وہ ہنسا۔ اُس کی ہنسی میں طنز اور تلخی تھی۔ اب ہوا اور تیز ہو گئی تھی اور بندر کچھ اور قریب آ گئے تھے۔ مجھے اب خوف محسوس ہونا شروع ہو گیا تھا۔ بندر غالباً سبزی خور تھے لیکن تازہ گوشت بھی اُن کے لیے شاید الگ ذائقہ رکھتا ہے۔ مجھے اپنے جسم کا ہر بال جڑوں سمیت اکڑا ہوا محسوس ہوا۔ وہاں میرے علاوہ شاید ہر چیز پر اعتماد تھی؛ ہوا میں ایک وقار تھا، بندر تجسس سے ہمیں دیکھ رہے تھے، درخت

وقار کے ساتھ آسمان کو تک رہے تھے اور مرزا اِن سب سے لاتعلق اپنی ہی کسی سوچ میں گم تھا۔ مجھے وہاں، مرزا سمیت، ہر کوئی کسی گہری سازش کا حصہ محسوس ہوا۔ میں اکیلا کیا سب کا مقابلہ کر سکوں گا؟ ”وہ اب کسی خانقاہ میں بٹھانے جوگی بھی نہیں رہی۔“ وہ ہنسا۔ مجھے اُس کی ہنسی میں ایک دیوانگی محسوس ہوئی۔ وہ شاید ایک عرصے سے خود کو اذیت دیتا آیا ہے! ”اگر اُسے میرے محسن کی بیٹی کی گھر میں موجودگی کا علم ہو جائے تو وہ گھر چھوڑ کر ہی بھاگ جائے۔ اِس لیے میں اُس عورت کو یہاں شفٹ کرنا چاہتا ہوں۔“ مجھے اُس کی سوچ منطقی اور غیر منطقی لگی۔ اُسے اپنی بیوی پسند تھی لیکن اُس کی سوچ کے ساتھ اتفاق نہیں تھا۔ اُسے اپنے محسن کی بیٹی شاید پسند نہیں تھی لیکن اُس کے ساتھ رواداری کے طور پر ہمدردی کا رشتہ تھا۔ مرزا ایک جالے میں پھنسا ہوا تھا اور وہ اُسے بھی ساتھ ہی اُلجھانا چاہتا تھا تاکہ وہ اکیلا نہ رہے۔ میں اُس کا سہارا تھا۔ میں اُس کا کیسے سہارا ہو سکتا تھا؟ وہ نتیجے کی پروا کیے بغیر مقابلہ کرنے میں یقین رکھتا تھا اور میں یقین رکھنے کے باوجود تبھی مقابلہ کرتا تھا جب کامیابی یقینی ہو۔ ”یہاں ایک چھوٹا سا گھر بنے گا جس میں زندگی کی ہر ضرورت میسر ہوگی۔ اُسے پڑھنے کا شوق ہے اور وہ جتنی چاہے کتابیں رکھ لے۔“ وہ خاموش تھا۔ مجھے اُس کی خاموشی میں اسرار کا بھاری پن لگا۔ ایک خوف کی جھرجھری پھر میرے بدن میں دوڑ گئی۔ مجھے اُس عورت پر ترس آیا جو یہاں رہے گی جب کہ اُس کے گرد بندر دیواروں کو اُکھیڑنے کی فکر میں ہوں گے۔

”وہ یہاں اکیلی رہے گی؟“ میری آواز میں بے یقینی تھی۔

”نہیں۔“ اُس نے سرگوشی سے کچھ اونچی آواز میں کہا۔ مجھے اُس کی آواز میں اعتماد محسوس ہوا۔ میں اُس کے اِسی اعتماد سے اُسے ناپسند بھی کرتا تھا۔ ”تم یہاں اُس کے ساتھ رہو گے۔“ اُسی وقت بندر اپنا دائرہ اور بھی تنگ کر چکے تھے؛ وہ اتنا نزدیک تھے کہ مجھے اُن کے جسموں سے اُٹھتی ہوئی کڑوی سی بو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ جنگل کی سرسراتی ہوئی ہوا، خاموشی اور بندروں کی آنکھوں سے لپکتے ہوئے شعلے میرا سانس دبانے لگے۔ مجھے اچانک بندر اتنا قریب محسوس ہوئے کہ اُن میں کوئی بھی چھلانگ لگا کے مجھے نیچے گرا سکتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ بندر اب آخری جست لگانے کے لیے تیار تھے۔ اُسی وقت مرزا کے جسم میں حرکت ہوئی اور اُس نے اپنے جیکٹ کی جیب سے پستول نکال کے گولی چلائی۔ اُس خاموشی میں گونجتی ہوئی پستول کی آواز میں بندروں کی چیخیں بھی شامل ہو گئیں۔ ہم تیزی سے کار کی طرف چلے تو وہ کار کو گھیرے ہوئے ہمارے انتظار میں لگے۔ اُسی وقت مرزا کا پستول والا ہاتھ اپنے سر کی طرف اُٹھا!

☆ ☆ ☆ ☆

آغا گل

بھولو

بہت دنوں سے شوق تھا کہ میرے پاس کوئی پالتو جانور ہو، جو میرے ساتھ ساتھ گھومے پھرے اور میرے ایک ہی اشارے پر میرے دشمن کا قلع قمع کر دے۔ بڑے بھائی احمد کے پاس یہ لمبی سی گردن اور خطرناک چونچ والی بطخیں تھیں۔ جوڑا یوں تو پُرامن ہی رہتا مگر کسی بھی اجنبی کو دیکھ کر اعلانِ جنگ کرتے ہوئے چونچوں کو آگے بڑھا کر ایسا خوفناک منظر پیش کرتا کہ اجنبی گھبرا کے بھگیل ہونے لگتے۔ چھوٹے بھائی آصف کے پاس جنگجو مرغ تھا۔ عام مرغوں سے کئی گنا بڑا۔ غصے میں آتا تو اس کی گردن کے پر پھول جاتے۔ قابو سے باہر نکل جاتا سنبھالے نہ سنبھلتا۔ چھتوں پہ کودتا پھرتا۔ مجھے بہت ارمان تھا کہ میرے پاس ایک بکرا ہو۔ میں ایک لیلا لے کر پالوں۔ اسے ٹکریں مارنے کی تربیت دوں۔ میرا اشارہ پاتے ہی دشمن کے چھکے چھڑا دے۔ ٹکریں مار مار کے بھگا دے۔ جو لڑکے مجھ سے لڑنے کو آئیں تو اُن کا بھرکس نکال دے۔ احمد کو بطخیں میر خوشدل خان مرغزانی نے دی تھیں۔ آصف کو مرغ تحفہ بھی میر عطا محمد ولہاری نے کچھ ولہاری میں دیا تھا۔ میں چوں کہ منجھلا تھا میں اکثر تہی دست ہی رہتا۔ کوئی بڑے بھائی کو تحفہ دیتا تو کوئی چھوٹے کو۔ چھوٹے سے لڑتا تو ڈانٹ پڑتی کہ یہ تو چھوٹا ہے، شفقت کرو، اسکا بازو بنو۔ بڑے سے لڑتا تو بھی ڈپٹ دیا جاتا کہ بڑے کا احترام کرو۔ بڑا بھائی باپ سمان ہوتا ہے۔ ان دنوں ہم ہندو محلّہ میں رہتے تھے۔ ویسے تو بٹوارے پہ ہندوؤں کا قتل عام ہوا تھا۔ اُن کی جائیداد چھین لی گئیں، ان کے مکانوں کو نذرِ آتش کیا گیا، بوڑھیوں کو قتل اور جوانوں کو ایمان کی دولت سے سرفراز فرماتے ہوئے بیویاں بنا لیا گیا۔ یہ مجاہدانہ قصے کہانیاں سن سن کر میرا خون بھی جوش مارتا کہ کاش چند برس پہلے پیدا ہوتا تو میں بھی ہندوؤں کے گھروں سے ایک بکرا ہی کھول لاتا۔ اس قتل عام میں ریاست قلات کے ہندو محفوظ رہے تھے۔ بابا کہا کرتے کہ پیسے بچایا کرو۔ جو جیب خرچ ملتا ہے، تہواروں پہ ملتا ہے۔ ان میں سے کچھ بچا بھی لیا کرو۔ چیونٹیوں کو دیکھو، گلہریوں پہ نگاہ ڈالو۔ پرندے بھی تو کچھ نہ کچھ بچاتے ہیں۔ ڈاکخانہ ہمارے گھر کے قریب ہی تھا۔ بابا ایک دن ہم تینوں کو ڈاکخانے لے گئے اور تینوں کے Minor اکاؤنٹ بھی کھلوا دیے۔ پوسٹ ماسٹر بچہ جان نے بھی حوصلہ افزائی کی۔ ان دنوں ڈاک خانے میں بچوں کے لیے کارڈ ملا کرتے۔ جس پر چار آنے والے سیونگ ٹکٹ لگتے۔ بچے جب چار چار آنے کے چار ٹکٹ

لگاتے تو پوسٹ ماسٹر ان پہ کالی مہر لگا کر منسوخ کرتے ہوئے اکاؤنٹ میں ایک روپیہ جمع کر دیتا۔ اگلی بار جو میں کاؤنٹر پہ گیا اور ہانک لگائی "پاولی کا ٹکٹ دیو" تو جواباً بچہ خان گرجا "کون ہے بھائی سامنے آؤ" میرا قد چھوٹا تھا، وہ دیکھ نہ پایا، اٹھ کے جھانکا "ارے عمو۔ تم ہے؟ اندر آجاؤ۔" یوں رفتہ رفتہ میرے سیونگ بینک اکاؤنٹ میں تین روپے جمع ہو گئے۔ میرا ارادہ تھا کہ منڈی مویشیاں کی بجائے کسی گلی (گاؤں) سے خریدوں گا۔ گاؤں بہت سستے ہوا کرتے تھے، دودھ، انڈے، مرغیاں، بھیڑیں وغیرہ گلیوں میں وافر مقدار میں ملتے۔ بلکہ انہیں خود ہی گاہکوں کی تلاش رہتی۔ انڈے وغیرہ تو تحفتہً ہی دے دیا کرتے۔

شام میں ہمارے ہاں خوب منڈلی جمتی اس وقت بابا سرکاری ملازم کو چھٹی دے دیا کرتے۔ تاکہ وہ گفتگو نہ سن پائے۔ مہمانوں کی خوش آمدی (استقبال) کرتا۔ ان کے لیے چائے لانا مجھے اور میرے بھائی احمد کو سونپا جاتا۔ ٹرے کا وزن زیادہ تھا یہ کام احمد کا تھا جبکہ کپ، پانی کے گلاس، ایش ٹرے جھاڑنا میری ذمہ داری تھی۔ بہت سے مہمان شاموں میں آیا کرتے، کرک کے دامحمد قاضی مزدوروں کے لیڈر تھے جبکہ عبدالرحمان غور خود ایک مزدور لکھاری تھے۔ ملک اللہ بخش وزیر دربار قلات مورخ میر نصیر خان احمد زئی، وڈیرہ نور محمد بنگل زئی بھی دوستوں میں شامل تھے۔ نسیم تلوی بھی چلے آتے میر غوث بخش بزنجو کے علاوہ سیوی میلے کے دوران سردار دودا خان سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ البتہ نواب خیر بخش مری کا اپنا پروٹوکول تھا۔ میں نے انہیں کبھی ہنستے مسکراتے نہ دیکھا۔ بڑا دبدبہ تھا ان کا۔ مہمانوں میں خوب بحث مباحثہ ہوا کرتا۔ 6 اکتوبر 1950 کو اذان کے وقت شاہی محل قلات پر حملے کی باتیں۔ شہزادہ محی الدین نے مینار پر مورچہ بند ہو کر بے جگری سے مقابلہ کیا۔ بنگل زئی اور کرد ناموس وطن کے لیے میدان میں کود پڑے۔ وادی جوہان زرک کے لہڑی اور رند کلوئی سر پر کفن باندھ کے دھرتی ماں کی حفاظت کے لیے نکل پڑے۔ مجھے حیرت ہوتی نہ کسی مرغ، بطخ کی بات کرتے نہ ہی بکروں کا ذکر ہوتا۔ عجیب عجیب سی باتیں کرتے رہتے۔ چائے پیتے سگریٹ پھونکتے وہ بے حد جذباتی ہو جایا کرتے۔ میں ان کے لیے پانی اور چائے لاتا، ایش ٹرے خالی کر کے دوبارہ دریوں پہ رکھتا چلا جاتا۔ اکثر ایک کونے میں دبکا رہتا۔

پھر کسی اسکندر مرزا کی بات کرتے جس کا جد امجد میر جعفر بنگالی تھا۔ جس کا نام ہی غداری اور وطن فروشی کا سمبل تھا۔ جس نے ایرانی سفارت خانے کے افسر کی بیوی ناہید سے شادی رچائی اور بلوچستان کا ایک بڑا حصہ رضا شاہ پہلوی کے ہاتھوں فروخت کر ڈالا تھا۔ براہوی ریاست کا نوحہ پڑھتے ہوئے پھر کسی لیاقت علی خان کی بات کرتے جسے سرعام تقریر کرتے ہوئے شہید کر دیا گیا تھا۔ یوں تو وہ کرنال کا نواب زادہ تھا، مگر شہادت کے وقت اس کی ایک جراب پھٹی ہوئی تھی۔ اس نے سب کچھ پاکستان پر لٹا دیا تھا۔ ایک گروہ بھی

کو مارے جا رہا تھا۔ ملک پہ قبضہ کر رہا تھا۔ Leviathan بن رہا تھا۔

بابا گرجتے برستے ''بلوچستان میں بس شکار ہی کرنے آتے ہیں۔ کبھی غلام محمد چلا آتا ہے تو کبھی خواجہ ناظم الدین جوہان میں آ کر شکار کرتا ہے۔'' آزات جمالدینی نے دانت پیستے ہوئے گرہ لگائی ''جی ہاں! بلوچستان کو ایک شکار گاہ بنا رکھا ہے، مگر محض جانوروں تک رہیں تو بات بنتی ہے یہ تو انسانوں کا شکار کرتے ہیں۔ سارے ہی بندوقچی آدم خور ہیں۔'' میر عطا محمد ولہاری سے نہ رہا گیا ''خان قلات نے غلام محمد کو اکیس توپوں کی سلامی دی تھی، میں اگر ہوتا تو ایک توپ کا رُخ غلام محمد کی طرف کر دیتا۔ ایک ہی گولے میں اس کے چیتھڑے بکھر جاتے۔'' سیٹھ دھنی چند میرے کلاس فیلو بسنت کا باپ دھیرے دھیرے بولتا ''بھولا ناتھ نے غلام محمد کی زبان ہی چھین لی۔ یہ کرم کی خاطر دھرم سے منہ موڑ لیتے ہیں مگر بچ نہیں سکتے۔ جو کرو، سو بھرو۔''

کبھی وہ ریاست قلات کے دو سو ملازمین کی بات کرتے۔ بہ یک جنبش قلم جن کی نوکریاں موقوف کر کے انہیں جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ پھر کسی بوجھ بجھکڑ دور انداز نے سوچا کہ ان پہ الزام کیا لگے گا؟ ان پہ مقدمے کس جرم میں چلائے جائیں گے۔ رات میں جیل کا پھاٹک کھول دیا گیا۔ بندی خانوں کے دروازے بھی وا کر دیے۔ جس قدر محبوس تھے انہیں کہا کہ بھائی بندوق اور توپ سے تم لڑنے کے نہیں۔ وہ تو آسمان سے بھی آگ برسانے کے قائل ہے۔ وہ تو دین و دنیا کا دشمن دجال ہے۔ ہمارا تو خیال تھا کہ ڈھال تلوار لے کر Civvies میں گدھے پہ بیٹھ کر آئے گا۔ دنیا بھر کی قومیں مل کر اس پہ فتح نہ پا سکیں گی۔ تو بھلا مٹھی بھر براہوی کہاں تک لڑیں گے۔ دجال کا نام سن کر اکثریت غم اور بے بسی سے مغلوب جیل سے نکل کر چلے گئے۔ مگر عبدالصمد خواجہ خیل جیسے مضبوط انسان یا ملک عطا محمد دھوارا اور دیگر انکاری ہو گئے کہ وہ رات کے اندھیرے میں جیل سے نکلے تو گویا اپنے موقف سے ہٹ گئے۔ لہذا وہ ایک یقینی شکست کے باوجود دجال کا مقابلہ کریں گے۔ دجال نے انہیں ڈھاڈر جیل منتقل کرا دیا اور Lynech Law کے تحت مختلف سزائیں بھی سنا دیں۔ حالاں کہ ان کا کوئی جرم نہ تھا۔ نہ اخلاقی نہ ہی مالی۔ مجھے ان بزرگوں پہ حیرت ہوئی وہ دوران گفتگو غضب ناک ہو جایا کرتے۔ کبھی ملک عبدالعلی کاکڑ اور عبدالصمد خان اچکزئی۔ میر امیر جان محمد شہی کی گرفتاری کی باتیں کرتے۔ کبھی اخبار نکالنے کا سوچتے۔ اخبار چھاپنے، بیچنے اور پڑھنے پہ چوں کہ پابندی تھی لہذا وہ سوچتے کہ کراچی سے اخبار نکال کر زیر زمین چلائیں۔ اور دنیا کو مظالم سے زیادتیوں سے قتل و غارت مار دھاڑ سے آگاہ کریں۔ مگر یہ بھی جان جوکھوں کا کام تھا۔ قدم قدم پہ خفیہ پولیس پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے ان کے ذوق سے مایوسی ہوتی۔ دنبوں، بکروں، مرغوں، بطخوں سے انہیں دلچسپی نہ تھی۔ بس وہ کہتے کہ دجال تو لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی نافذ کر رہا ہے۔

میرے پاس تین روپے جمع ہو چکے تھے۔ میرا سرمایہ آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے ایک کجا بھی خرید لیا۔ جو تھا تو کچی مٹی کا مگر اس میں ٹکہ، آنہ، دونی محفوظ رہتی۔ اسے چھنکا کے محسوس بھی کیا جا سکتا تھا۔ پھر کجا توڑ کر میں نے دو روپے نکال لیے اور بچہ خان کے پاس اپنے ٹکٹوں والے کھاتے میں جمع کروا دیے۔ بچہ خان نے بتلایا کہ یہ رقم میں خود نہیں نکال سکتا۔ دستخط والد کے ہی کرانا ہوں گے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ رقم میری ہے مگر نکالے گا کوئی اور۔ پھر خیال آیا کہ ریاست براہوی ہے حکومت کرتا ہے کوئی اور۔ یہ سوچ کر تسلی ہوئی چلو دنیا کا ایسا ہی دستور ہے۔

میں نے بچہ خان سے دریافت کیا ”دجال میرے پیسے تو نہیں لے جائے گا؟“ بچہ خان چونکا۔ پھر مسکرایا ”کیا مجال ہے دجال کی میں اسے قدم نہ رکھنے دوں گا ڈاک خانے میں۔“ اسی رات بڑوں کی جذباتی محفل میں، میں نے ڈرتے ڈرتے کہا ”بابا! بچہ خان کہتا ہے کہ دجال ڈاک خانے میں نہیں جا سکتا۔ یہ سارے لوگ ڈاک خانے میں کیوں نہیں چلے جاتے۔“ فضا یک دم بدل گئی، سبھی ہنسنے لگے۔ جس سے مجھے حوصلہ ملا، میرا اعتماد بڑھا کہ میں ان سبھی سے زیادہ عقل مند ہوں۔

بابا دور دراز علاقوں میں گھوڑوں پہ جایا کرتے۔ ایک بس سیوی سے چلتی جیکب آباد کے لیے ایک کوئٹہ سے نکلتی۔ بس یہی کُل ٹرانسپورٹ تھی۔ آس پاس کے قصبات، کلیوں میں جانے کے لیے مین روڈ پہ اترنا پڑتا۔ یہاں کرائے کی گھوڑا گاڑیاں، بیل گاڑیاں، اونٹ موجود رہتے۔ کرایہ طے پاتا تو چل نکلتے۔ البتہ جب پٹ میں سیلاب آتا تو راستے بند ہو جایا کرتے۔ سیوی والے دنیا سے کٹ کے ہی رہ جاتے۔ کسی کو کسی کی خبر نہ ہو پاتی طوفان نوح جیسی خاموشی طاری رہتی۔

ایک روز میرے ایک دوست نے جس کے والد کی حلوائی بازار میں اسٹیشنری کی دکان تھی یہ خبر سنائی کہ تحصیل دفتر کے سامنے روز ٹرکوں سے مال مویشی اتارے جاتے ہیں اور کوڑیوں کے مول بیچے جاتے ہیں۔ ان کے والد فرغانہ کے نام پہ ہی دکان کا نام تھا۔ میں نے ان سے پوچھا تو انھوں نے اثبات میں سر ہلا کر تصدیق کی۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ۔ ”تم مت خریدنا۔ خبردار! ورنہ خان سے شکایت کروں گا۔“ مجھے بہت تپ چڑھی۔ بابا تو لنڈ سے، ڈینگرہ، ڈہبولی سے ہوتے ہوئے بیل پٹ اور جھٹ پٹ جانب نکل چکے تھے۔ ایک طویل سرکاری دورہ تھا۔ اگلے ہی روز میں اسکول سے چھپت ہو گیا اور گلے میں بستہ ڈالے ہاتھ میں تختی لیے تحصیل کے دفتر جا نکلا۔ سامنے ہی ایک شامیانہ تھا جس میں سرکاری اہلکار نائب تحصیلدار روز محمد جعفر براجمان تھے، ان کے سامنے ہی میز پہ بہت سی فائلیں اور رجسٹر دھرے تھے۔ میرے بابا کے وہ دوست تھے، میں نے قریب جا کر سلام کیا۔ انھوں نے جواب دیا ”تم کہاں چلے آئے؟ تمھارا کیا کام ہے عمو۔“ ان کا بیٹا حفیظ جسے

پیار سے چھوٹو پکارا جاتا میرا ہم جماعت تھا۔ جس کے باعث وہ زیادہ دلجوئی کرتے۔

”میں نے بھی بکرے کا بچہ خریدنا ہے۔“

وہ بے حد مصروف تھے۔ انھوں نے ایک لیوز اہلکار کو اشارے سے پاس بلایا۔ ”یہ انسپکٹر اکبر خان بیٹا ہے۔ اسے ایک بکرے کا بچہ دلوا دو۔“ میں خوشی خوشی چل دیا۔ اونٹ، بھیڑ، بکریاں، دنبے غرضیکہ ریوڑ کے ریوڑ تھے یوں لگتا تھا جیسے کہ مویشیوں کا عید میلہ ہو۔ اس نے مجھے ایک بچہ ڈھونڈ دیا ”یہ لو! کیا یاد کرو گے۔“ میں نے پوچھا ”یہ کتنے کا ہے؟“ اہلکار بھی جلدی میں تھا۔ ”بس دو روپے دے دو“ رقم میرے پاس نہیں تھی ”میں لے آؤں۔ اسے اور کسی کو نہ دینا۔“ اتنا سستا بچہ؟ میں نے سپنوں میں بھی نہ سوچا تھا۔ اہلکار نے تسلی دلائی ”مگر ایک گھنٹے تک آ جانا اور ہاں ایک رسی بھی ساتھ لانا۔“ اس نے ہانک لگائی ”دیر مت لگانا“ میں دوڑتا ہوا ڈاک خانے پہنچا۔ بچہ خان کو ادب سے سلام کیا اور دو روپے طلب کیے۔ بچہ خان کو حیرت ہوئی ”خان کدھر ہے؟“

میں نے بتلایا کہ چکی کے دورے پر ہیں۔ بچہ خان نے دو روپے دیے اور ایک فارم پر نشان بھی لگا دیے کہ بابا جب آئے اس پر دستخط کرا کے لا دینا۔ دو روپے جیب میں ڈال کر میں بھاگا بھاگا تحصیل دفتر پہنچا۔ اچانک یاد آیا کہ رسی تو لایا ہی نہیں۔ وقت کم تھا کیا عجب کوئی اور خرید لے جاتا۔ میں نے بچہ خان سے جا کر رسی مانگی۔ وہ حیران ہوا ڈاک خانہ اور رسی۔ پھر اس کے اشارے پر ملازم نے ڈاک خانے کے تھیلے باندھنے والی ایک رسی مجھے لا دی۔ میں تقریباً دوڑتا ہوا تحصیل دفتر پہنچا۔ بہت سے جانور لوگ باگ لے چکے تھے۔ میں نے اہلکار کو دو روپے تھمائے تو اس نے میری رسی سے بچے کی گردن میں گرہ لگا کر ایک محفوظ پھندا لگایا۔ میں کشاں کشاں اسے گھر لے آیا۔

میری ماں کو تعجب ہوا کہ مرغی کی قیمت کا مذغوئے (لیلا) بھلا کیسے ملا ہے۔ سبھی اس کے گرد جمع ہو گئے، وہ کچھ سہما ہوا سا تھا گھبرایا گھبرایا سا پریشان سا۔ جیسے کسی ظالم ماسٹر کے قابو آیا ہو۔ ہم نے کھانے پینے کو دیا تو اس کا خوف دور ہو گیا۔ اور ہم سے کھیلنے لگا۔ اب اس کے نام کی فکر ہوئی مجھے شوق تھا کہ میری خاطر لوگوں کو ٹکریں مارے۔ طاقتور ہو۔ میں نے اس کا نام بھولو پہلوان رکھ دیا۔ کثرت استعمال سے پہلوان تو جاتا رہا۔ سبھی اسے بھولو پکارنے لگے۔ رفتہ رفتہ وہ ہمارے کنبے کا حصہ بن گیا۔ کھا پی کے زیادہ ہی چست و چالاک ہو گیا۔ تحصیل کے سامنے میدان میں سرکاری ٹرک مال مویشی لاتے رہے۔ سپاہی انہیں اتار کر اپنی راہ لیتے اور چند روز بعد ہی دوبارہ دریائے نیجی کے ساتھ ساتھ دھول اڑاتے Nari Gorge سے برآمد ہوتے۔ لیکن میرا بھولو آ چکا تھا پھر میں نے آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ ایک روز میں نے حفیظ سے دریافت کیا کہ اس کے بابا اس قدر مال مویشی کوڑیوں کے مول فروخت کر رہے ہیں وہ اپنے لیے کوئی دنبہ بکرا کیوں نہیں خرید لیتا۔ ان کا تو

گھر بھی خاصہ بڑا ہے۔ “میرے بابا کہتے ہیں کہ انھیں خریدنا گناہ ہے۔” اس نے ترت جواب دیا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی “گناہ ہے تو بیچ کیوں رہے ہیں؟” حفیظ کے پاس جواب تیار تھا “میرے چچا نے بھی پوچھا تھا، کہنے لگے کہ یہ سرکاری مجبوری ہے، ورنہ نوکری سے جاؤں گا۔ کیا عجیب قید ہی کرلیں۔” مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ مگر میں نے گھر میں کسی سے ذکر نہ کیا کہ کہیں بھولو کی محبت ہی کم نہ ہو جائے اور اسے نکالنے کا سوچا جائے، بھولو دن بھر کھیلتا رہتا۔ سکول میں بھی بے چینی سے رہتی کہ جلدی گھر پہنچوں۔ پھر بہت دنوں بعد بابا لوٹ آئے۔ سبھی کھل اُٹھے، بھولو کا تعارف کرایا وہ بھی خوش ہوئے مگر تاکید کی کہ بھولو کی خاطر تعلیم کے جانب توجہ کم نہ کروں۔ یہ خوشی پائیدار نہ رہی۔ اگلے ہی روز انھوں نے ہاتھ ماتھے پہ مارا اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔

شامت اعمال ما صورت نادر گرفت
اندریں در حیرتم ملک خدارا جابہ گرفت

“تم یہ بھولو جا کر مریوں کو واپس دے آؤ۔ ان کی معاشی تباہی کے لیے سپاہی اسلحے کے زور پر ان کے مال مویشی چھینتے جا رہے ہیں۔ یہ گناہ تم نہیں کرو گے۔” یہ نادر شاہی حکم تھا۔ میرے بھائی بھی سہم گئے۔ ملازم دادو نے جھٹ تانگہ منگوایا اور بھولو کو لے کر چلتا بنا۔ میں نے حسرت سے بھولو کو آخری بار دیکھا اور دانت بھینچ لیے۔

گھر اچانک سائیں سائیں کرنے لگا۔ ریلوے اسٹیشن سے دخانی انجنوں کی اداسیاں سیٹیاں سنائی دیتیں۔ سیوی بھائیں بھائیں کرنے لگا۔ زندگی اچانک ہی ویران اور بے معنی ہو کر رہ گئی۔ لالٹین کی ٹمٹماتی روشنی میں مجھے بھولو کے منمنانے کی آواز آتی جیسے وہ کسی مری کے گیدان کے باہر مجھے تلاش کرتا ہو۔ میں اگلی صبح بے دلی سے اسکول گیا۔ سہ پہر میں بابا نے بلوا کر تسلی دی کہ مجھے بلبل یا طوطا دلوا دیں گے۔

لیکن دل بجھا بجھا سا تھا شام میں انھوں نے دادو کو بلوایا جو مجھ سے آنکھ نہ ملاتا، چھپا چھپا پھرتا۔

“بھولو مریوں کو واپس دے آئے دادو؟” دادو ندامت سے بولا “جی نہیں۔”

بابا چونک اُٹھے “کیا مطلب؟ میں نے جو تمھیں کہا تھا۔”

دادو بھرائی ہوئی آواز میں بولا “گلو شہر سے آگے دریائے ناڑی کے راستے پہ سپاہیوں نے زنجیر لگا رکھی تھی انھوں نے مجھ سے چھین لیا۔”

بابا تڑپ اُٹھے “وہ کیوں؟” میں چھپ کے باتیں سن رہا تھا۔ دادو ہچکچاتے ہوئے بولا “کہہ رہے تھے کہ ہم وطن کے محافظ ہیں۔ یہ ہمیں دے دو ہم اسکی یخنی بنائیں گے۔”

☆☆☆☆

شعیب خالق

دست شناس

درختوں بھرے پہاڑ کا رنگ، موسمِ خزاں کے باعث، خشک اور زرد پتوں نے پیلاہٹ سے ڈھانپ رکھا ہے۔ اسی پہاڑ کی اِک غار میں دست شناس بیٹھا ایک ایسے ہاتھ کا منتظر ہے جو کائنات میں یکتا و اعلیٰ خیال کیا جاتا ہے۔ پہاڑ رینگتے ہاتھوں سے بھرا پڑا اور تمام بے کلائی ہاتھوں کی بھیڑ، اپنی انگلیوں کی پوریں زمین میں گاڑھ گرفت بناتیں اور سب ہاتھ ہتھیلی گھسیٹ آہستہ آہستہ غار ہی کی جانب گھسٹتے چلے آ رہے ہیں۔ ہتھیلیوں کے نیچے درختوں کی ٹہنیوں سے گرے خشک اور زرد پتوں کی چرچراہٹ اور سرسراہٹی آہنگ، پہاڑ کو ایک پراسرار موسیقی میں سموئے ہوئے ہے۔ اُس موسیقی کو دن کی روشنی کچھ دبائے رکھتی لیکن چاندنی رات اُس پراسراریت کو چار چاند لگا دیتی۔

دست شناس اپنے لمبے بال جھولی پر لٹکائے اور سر جھکائے کسی مراقبانہ سوچ میں گم بیٹھا ہے۔ غار کی کچی دیوار میں گڑھی مشعل اور اُس کی ہچکولے کھاتی لاٹ، اندھیرے کو اپنی ڈگمگاتی زرد روشنی سے کاٹ رہی ہے۔ باہر خشک پتوں میں ہتھیلیوں کی رگڑ اور مسلاہٹ سے پیدا ہونے والی موسیقی، غار کے اندر، اپنے دھیمے پن کے ساتھ زرد منظر کو اور بھی پراسرار بنائے ہوئے ہے۔ وہ انتظار کا طویل گھونٹ حلق سے اُتارتے اور سر اُٹھاتے ہوئے سامنے دیکھتا ہے۔

دراصل دست شناس کو غار میں اپنے گرد، قطار اندر قطار، بے قرار طواف میں مگن، بے کلائی ہاتھوں کی لکیروں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ وہ جان چکا ہے اِن ہاتھوں کی لکیروں میں خود کو جاننے کی التجائی پکار، یکسانیت کا شکار ہو چکی ہے۔ مختلف زائچوں میں بھی کوئی اچھوتا اختلاف نہیں اور تمام ہاتھ اپنی ''میں'' کی گمراہ کُن پیروی ہی کے غلام چلے آ رہے ہیں۔ ایک جیسے خواب، ایک جیسی تمنائیں، ایک جیسی خواہشیں، آرزوئیں، چاہتیں، ڈھیروں ایک جیسے وسوسے اور اندیشے اپنی لکیروں میں حیرانگی کی بھی ایک جیسی حیاتی طلب لیے ہوئے ہیں۔ اُن ہاتھوں کی لکیروں میں چھپے بے قرار جذبوں کو آس دینے کے لیے اُس کے پاس کوئی جواز نہیں رہا تھا۔ ویسے بھی دست شناس، اختلاف کی غیر موجودگی کے باعث، ایک سے زیادہ کچھ بانٹ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسی لیے اُسے کائنات کے اُس یکتا و اعلیٰ ہاتھ کے آنے کا شدت سے انتظار ہے۔

اُس نے ریشمی چوغے کے لمبے بازوؤں میں چھپے ہاتھوں کو اوپر کی جانب بلند کیا اور آستینیں نیچے گرنے کے بعد کلائیوں سمیت اُس کے ہاتھ ننگے ہو گئے، پھر سر اُٹھا سرخ آنکھوں میں اپنی طلب کا زہر بھرتے اور چیختے ہوئے بولا۔

”میرا انتظار لبالب ہوا، اب آ...... آ...... آ...... آجا“ ...... جا...... جا...... جا......“

اس کی چیخ ”آجا“ کی بازگشت بن کر غار میں ارتعاش بھرنے لگی۔ اُس گونج نے نہ صرف اُس کا اپنا بدن بھی لرزایا بلکہ زہریلے کانٹوں کی طرح ارتعاش بے کلائی ہاتھوں کو بھی ڈسنے لگا، یوں باہر سے اندر آنے والے ہاتھوں کی قطار، ارتعاشی حد دیکھ غار کے منہ سے پلٹنے لگی اور ایسے ہی اندر سے باہر جانے والے سرکتے ہاتھ بھی عجلتی انداز اپنائے ہوئے ہیں کچھ ہی دیر میں غار کے اندر دست شناس کے اپنے دو ہاتھوں کے سوا تیسرا کوئی ہاتھ موجود نہ رہا۔

اس نے سر جھکائے بغیر ہی آنکھیں بند کیں اور ننگے ہاتھ واپس جھولی میں رکھ لیے۔ داخل میں یکدم کوئی لرزاہٹ اس کی روح کو دبوچنا شروع ہوئی تو اس نے گھبرا کر آنکھیں پھر سے کھول دیں۔ اس کی اپنی طلب، غار میں اندھیرا کاٹتی زرد روشنی کو، ایک سفید روشنی سے کاٹ چکی تھی۔ سفید روشنی دیکھ اس نے اطمینان کو دل میں پہلو بدلتے ہوئے محسوس کیا اور جیسے جان لیا، اس کی تکمیل کا وقت آ پہنچا ہے۔ اُس نے دیکھا، ہوا میں معلق وہ ہاتھ اپنے گرد سفید روشنی کا ہالہ لیے غار کے منہ پر رُکا اور اندر آنے کا منتظر ہے۔ وہ ہاتھ جسے دیکھنے کی تمنا لیے، اس نے صدیوں پر محیط انتظاری گھونٹ بھرے تھے۔ اب وہی ہاتھ اس کے اجازتی اشارے کا خواہاں ہے۔ پہاڑ پر بھی تمام ہاتھ، اُس روشن ہاتھ کی چمک نہ سہار پانے اور پہاڑ سے اُتر کر میدانی جنگل کی جانب تیزی سے کھسکتے ہی چلے جا رہے ہیں۔

دست شناس نے پُر وقار انداز میں اپنی گردن ہلا اجازتی اشارہ دیا اور پھر وہ یکتا و اعلیٰ ہاتھ، ہوا میں معلق، سبک رفتاری سے اندر داخل ہو رہا ہے۔ اُس ہاتھ نے دست شناس کی آنکھوں سے کچھ نیچے پہنچ کر خود کو روک لیا مگر بدستور ہوا میں معلق ہے۔ وہ اُس ہاتھ کی ہتھیلی قریب سے دیکھ حیران نظریں چراتا، جھولی میں سر گراتا اور اپنی طلب کے قہقہے میں ڈوب جاتا ہے۔ اُس سے اپنی خوشی سنبھالی نہیں جا رہی کچھ دیر بعد ہلتا سر اور قہقہہ بھی تھم جاتا اور وہ دونوں بازوؤں کو اُوپر اُٹھا ہاتھ ننگے کرتا ہے۔ دونوں ہاتھوں کی شہادت والی انگلیوں کو کانٹا بنا، وہ ماتھے کے درمیان سے بال ہٹاتا اور انہیں کانوں کے پیچھے اُڑسا لیتا ہے۔ چہرہ اور آنکھیں ننگی کر کے وہ پہلے اپنی ہتھیلیوں کی گہری لکیروں اور پھر اُس زرد چمکیلے ہاتھ کی طرف دیکھتا ہے جو اس کی طلب کے سامنے ہتھیلی پھیلائے، اپنا آپ جاننے کا منتظر ہے۔ دست شناس ہتھیلی دیکھ مسکراتے ہوئے کچھ سوچتا اور

سوالیہ انداز بولتا ہے۔

''تیری ہتھیلی لکیروں سے عاری اور تو کائنات پر بھاری بنا بیٹھا ہے؟'' ہاتھ میں لرزشی لہر دیکھ دست شناس کے چہرے پر مزید مسکراہٹ سی آئی اور وہ دھیمی آواز میں ہاتھ کی جانب دیکھتے ہوئے بولتا چلا جا رہا ہے۔

''تیری بے لکیر ہتھیلی بتا رہی ہے تو حقیقت نہیں، بلکہ واہمہ ہے۔ ایسا واہمہ جس نے یقین کا لباس پہن کر حقیقت کا روپ دھار رکھا ہے۔ میں کیا بتاؤں تجھے تو کون ہے؟ کوئی حقیقت یا گمان۔ میری طلب تجھے میرے سامنے لے آئی وگرنہ تُو کُل ہونے کے غرور میں کہیں خود سے بھی پوشیدہ اور سمجھتا ہے جیسے پوری کائنات تیری ہی پوشیدہ کاری کا کرشمہ ہے۔''

یک دم ہاتھ کی زردی قدرے سُرخی میں ڈھلی اور آہستہ آہستہ ہاتھ ہوا میں تیرتا واپس غار کے منہ کی جانب پلٹنا شروع ہو گیا ہے۔ دست شناس ہاتھ کی ناراضی اور رنگ دیکھ چونکا اور پھر قدرے زور سے بولا:

''رُک جا، تو اپنی واہمانہ حقیقت سے نظریں مت چُرا ...... واپس آ ...... اور قریب ...... ہاں ...... یہاں''

ہوا میں معلّق ہاتھ واپس پلٹ اُس کی نگاہوں سے نیچے آ کر رُک گیا اور دست شناس نے اپنے دونوں ہاتھ اُس کی ہتھیلی پر مسلتے اور مسکراتے ہوئے محسوس کیا جیسے چٹیل ہتھیلی اُگلنے کے بجائے کچھ نگل رہی ہے۔

''تیری بے لکیر ہتھیلی، یکتائی کے سبب، تنہائی کے اُس عذاب کی کہانی ہے جو ان گنت صدیوں میں گھومتے نوری سالوں کی طوالت کاٹ چکی مگر اب آگے اُس کی سورج عمر بھی گھٹتی چلی جا رہی ہے۔'' ''ترا ایک ہونے کا خمار تجھے بیمار بنا چکا اور تیرے ہاتھ کی زرد رنگت، زنگ آلود ہوتی چلی جا رہی ہے۔''

دست شناس سونے جیسی ہتھیلی کی خفیف چپچپاہٹ سے اپنا ہاتھ جدا کرتے ہوئے گھبرایا اور قدرے توقف بعد مسکرایا، اُس کی مسکراہٹ ہنسی میں ڈھل گئی اور ہنسی کا ٹھہراؤ پھر مسکراہٹ میں ڈھال اُس نے بات جاری رکھی۔

''تیرا ہاتھ اس بات کی گواہی ہے کہ تیری یکتائی کا شعور خالی ہاتھ کی پانچ انگلیوں اور ہتھیلی سے مل کر بنا ہے۔ ابتدائی انسان نے بھی خالی ہاتھ کے انگوٹھے کو شہادت کی انگلی سے چھو کر خود کو جانوروں سے افضل بنا لیا تھا۔ یہی خالی ہاتھ انسانی شعور کو بڑھاوا دیتے چلے گئے اور انھوں نے اپنی تمنائیں، ارادے، آرزوئیں اور خواہشیں آسمان کی طرف پھینکیں جو تیرے اُس ہاتھ کو وجود میں لے آئیں، مگر تجھے شاید معلوم نہیں کہ کائنات کی گہرائی میں دکھائی نہ دینے کی سکت سے آلودہ زمین ہی تیری ابتداء اور انتہاء ہے۔''

زرد ہاتھ میں پھر جلالی سُرخی اُبھری مگر اس بار ہاتھ پیچھے نہیں ہٹا، بلکہ ہتھیلی پلٹ پشت کو سامنے کیا تو

دست شناس حیرت میں ڈوبا اور سیاہ لکیروں کے جال میں اُلجھی سونے جیسے ہاتھ کی زرد پشت دیکھتا ہی رہ گیا۔ نجانے کیوں اُس کے دل پر ہاتھ کے ساتھ ہمدردی میں لپٹا دھیان، درد کی ہلکی ہلکی دستکیں دے رہا ہے۔ وہ پشت پر ایک دوسرے سے الجھی لکیروں کی حیاتی لہر میں ڈوبا تو یکدم اُسے یوں لگا جیسے وہ خود بھی کوئی واہمہ ہے اور حقیقت اگر کوئی ہے تو وہ خود سے جدا اور پوشیدگی میں بدل چکی ہے۔

اس نے سر کو جھٹک، خود کو حاضر خیال کیا تو بالوں کی چند لٹیں بکھر کر اُس کے ماتھے پر آ گریں۔ اُس نے ایک بار پھر شہادت کی انگلیوں سے بال تقسیم کر کے بائیں اور دائیں کان کے پیچھے اُڑس لیے۔ پھر چمکیلے زردی مائل ہاتھ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"تیرا ماضی دیوی اور دیوتاؤں کی کثرت میں تقسیم رہا اور پھر اُن کی یکجائی میں تو ایک بن گیا۔ حالاں کہ تجھ جیسا نہ کبھی تھا، نہ ہے اور نہ ہوگا، تیری پشت پر گزرے سالوں کی لکیروں کے جنگل پڑے ہوئے ہیں اور ہر جنگل میں ہزاروں صدیوں کا گزرا اُلجھائے ہوئے ہے نہ ہوتے ہوئے بھی تیرے ہونے کی ہزاروں لکیریں ایک دوسرے میں اُلجھائے ہوئے ہے۔"

دست شناس نے ایک گہری سانس اندر کھینچی، آنکھیں بند کیں اور دکھ بھری آہ کے ساتھ، ہاتھ کی پشت پر بنی لکیروں کے جنگل میں اُتر گیا ہے۔

وہ لکیروں کے جس جنگل میں اُترا وہ جنگل انتہائی قدامت سے کچھ آگے، نیم قدیم زمانے تک آ چکا تھا۔ لفظ ایجاد اور اظہار کو راستہ مل رہا تھا۔ وہیں کہیں ایک شاعر بلند آواز روتے اور ہچکیاں بھرتے ہوئے اپنی نظم سنا رہا ہے۔

"او تو..... تو نے آسمان بنا کر..... اُس پر چاند سورج بھی رکھ دیے ..... ستارے بنا کر اُن سب کے راستے بھی بنا ڈالے..... اب ہمارے کرنے کو کیا بچا ہے..... او تو ہم کیا کریں ..... ہم کیا کریں"

اُس نے نظم سنی اور جب اُسے اپنے اندر پہلی بار دوہرایا تو وہ اُس التجائی راہنمائی کی پُر درد دُعا کے سحر میں ڈوب گیا۔ یوں لکیروں کے جھلک زمانوں میں چھپے لمحہ موجود نے اُسے خود میں پرو دیا اور وہ پھوٹ پھوٹ رویا۔ اُس نے آنسو پونچھ سر اُٹھا، آسمان کی طرف دیکھا اور پھر دھاڑیں مار مار نظم دوہراتا جا رہا ہے مگر وہ نظم کہیں دیوی اور دیوتاؤں کے شور اور پُراسرار و پُر آسیب زمانوں تلے دبتی چلی گئی۔ یوں آگے بڑھتے لمحہ موجود کے ساتھ ساتھ چلتا، وہ جنگل زدہ لکیروں کے زمانوں سے نکل صحرائی افسانوں کی لکیروں میں تیرتا، آئندہ کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک سونے جیسے ہاتھ کا دھیان آتے ہی، کسی آسیبی طاقت نے اسے جکڑا اور پیچ کر ہاتھ سے باہر پھینک دیا ہے۔

دست شناس جیسے ہی یکتا و اعلیٰ ہاتھ سے نکل، اپنے جسم میں واپس گرا تو اُس پر لرزا طاری ہو گیا ہے۔ اُس نے آنکھ کھول دیکھا تو غار کی دیوار میں گڑھی مشعل کی لڑکھڑاتی لاٹ نے بھی آنکھ کھول رکھی تھی۔ سفید روشنی اور زرد ہاتھ غار سے جا چکے تھے۔ دست شناس نے کپکپاتے ہاتھوں سے بال چہرے سے ہٹائے، پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو نگاہوں کے نیچے رکھ دیکھا تو اُس کے چہرے اور آنکھوں میں اپنی تکمیل کی ایک حتمی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اب اُس کی ہتھیلیاں لکیروں سے عاری اور وہ خود کائنات پر بھاری بنا بیٹھا ہے۔

☆☆☆☆

زیب اذکار حسین

حیرت آباد سے بے دخلی پر

کوششِ بسیار کے باوجود وہ لفظ گرفت میں نہ آسکا جو اس کی آنکھوں کا عیب بیان کرتا۔ وہ جو قدیم عبادت گاہ رہی تھی، اس کا نام کیا تھا۔۔۔؟

ڈلفی کا مفہوم کیا تھا۔ وہ، اس کی پیشانی پر کیا رقم کیا گیا تھا؟

وہ۔۔۔

اُس کی معنویت ہنوز فہم سے بالاتر ہے۔۔۔

مجھے اُن لوگوں میں شمار نہیں کیا جانا چاہیے جو دلوں کا بھید جانتے ہیں۔۔۔

میں مرسی کلنگ (Mercy killing) کا قائل نہیں ہوں۔

میں جاں کنی کے عالم میں مبتلا کرداروں سے حیات جاودانی کے موضوع پر بحث نہیں کرسکتا۔۔۔

میں اپنے نام کی مجبوری سے ہاتھ اٹھاتا ہوں۔۔۔

اگر ہاتھ پر آنچ آتی ہے تو میں اسے زندگی کے نام پر مسلط کردہ حواس کے سپرد کردوں گا۔۔۔

اس کردار کو میں ہی وہ مصیبت کا مارا نظر آیا، جسے یہ بپتا سنائی جاسکتی تھی۔۔۔ مگر اسے بپتا کون کہے گا اور سنانا کون سنے گا۔۔۔

وقفہ۔۔۔

جیسے کچھ حرکات و سکنات کا ایک سلسلہ سا تھا۔۔۔

محض ایک نشان۔۔

ایک آواز، ایک موہوم سا۔۔۔

ادھورا سا۔۔۔ اشارہ۔۔۔

اس کے پاس کیا جواز ہے؟

وہ اس حد تک ضدی کیوں ہے کہ دوسرا رشک کرنے لگے اس کی استقامت پر۔۔۔

اس صورت حال کو ’’دلچسپ‘‘ کیوں کر قرار دیا جاسکتا ہے۔۔۔؟

اگر کوئی وہ تمام سوالات ہی بھلا بیٹھے جو خارجی دنیا کی پیداوار ہیں تو پھر کیا ہو؟
اس امر سے کسے انکار ہے کہ زندگی کی دوڑ میں شامل رہنے کے لیے چند ایک سوالات کا سہارا بے حد ضروری ہے، یہ مجبوری ہے۔۔
یہ وہی سوالات ہیں جو زندگی کی دوڑ میں شامل رہنے پر اکساتے رہتے ہیں۔۔۔
انھی سوالات کی بدولت ذہن کو مہمیز ملتی ہے۔۔۔
ملتی ہے یا ملتی تھی، بہر حال جو بھی سمجھا جائے۔۔۔
اس بے معنی دنیا میں سرگرمِ عمل رہنے کے لیے چند ایک سوالات کا جواز ناگزیر ہے۔
وہ سوالات جو خارجی دنیا کی پیداوار ہیں، اکثر و بیشتر ذہن میں وہ تحرک پیدا کرتے ہیں۔۔
جو دماغ کو گرم رکھنے کے لیے شاید ضروری ہوتا ہے۔۔۔
اور دماغ گرم ہو تو اس بے معنی دنیا میں یوں سرگرمِ عمل ہونا پڑتا ہے، جیسے "یوں" کی ماہیت سے بے خبر۔۔۔ کوئی باخبر متحرک رہتا ہے۔۔۔
تا وقتیکہ یہ سوالات جو اپنی گنتی میں سات سے زیادہ کیا ہوں گے، صرف ایک سوال کی صورت آ موجود ہوں۔
صرف ایک سوال بھی کیا۔۔ محض ایک ہیجانی سی کیفیت، ایک ابھار، ایک نشان۔۔ خواہش۔۔۔ کو قرینے کا بدل تو نہیں کہا جا سکتا۔ دانتے (Dante) کی بیٹرس (Beatrice) ایک خیالِ محض ہی تو ہے۔
کیسی ترتیب۔۔۔؟ میں اس ترتیب کو۔۔۔ اس ترغیب کو ترتیب کیسے سمجھ لوں۔۔
فردوسی کی موت واقع ہو جاتی ہے۔۔
تب اسے انعام و اکرام کا حق دار گردانا جاتا ہے۔۔۔
گوئٹے (Goethe) کا "فاؤسٹ" اس کی زندگی میں تو نامکمل ہی رہ گیا۔۔۔۔
اس کی تکمیلیت (completion) اس کی موت کے چھبیس سال بعد واقع ہوتی ہے۔۔۔
یہ "واقعیت" ہے کیا۔۔؟ یہ ٹیڑھی میڑھی لکیریں۔۔۔
جیکب بائیڈرمن (Jacob Bidermann) کی آمد و رفت کی تواریخ تک تو بتاتی نہیں ہیں۔۔۔
یہ صدیوں پر محیط مریکل پلیز (miracle plays) فنی ضبط کی واضح مثال نہیں ہیں۔۔۔؟
موت تو میرے قریب ہی کہیں رقص کر رہی ہے۔۔۔
رقص کیسا؟

موت سفر کر رہی ہے ۔

کہیں پر خود کلامی ہے تو کہیں پتھروں کی بات چیت سنی جا رہی ہے ۔

کبھی ریت پر کچھ تحریر کیا جا رہا ہے ۔ اور کبھی مٹی پر لکھی تحریر کو پانی پر منتقل کیا جا رہا ہے ۔

وہ بھی ایک عام سا دن نکلا جس کا خاتمہ ایک معمول کے عبوری دور کے خاتمے کا سبب بنا ---

وہی عام سی باتیں ---

وہی عمومی سے اعمال اور وہی معمول کی سرگرمیاں ---

نہ ہی تو کوئی چونکنے کی بات تھی اور نہ ہی چونکانے کی ۔ ۔ کون جانتا ہے، دو چار انگڑائیوں کے بعد حیرت دوبارہ سو گئی ہو ---

کون تردید کر سکتا ہے کہ اس روز بھی نوزائیدہ چوزوں کی تعداد گزشتہ روز کی تعداد سے کچھ کم نہ تھی ---

یقیناً اس خبر پر بھی کسی کو متعجب ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ محبِ وطن شہریوں نے ضروری کارروائی کے بعد پہیہ جام ہڑتال کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا ۔

وہ بھی ایک عام سی رات تھی ----

عام شہریوں میں اس امر پر بحث جاری تھی کہ آئین پاکستان کی عام شقوں کی معطلی کے اگلے روز عام تعطیل کا اعلان بھی کیا جائے گا یا نہیں ۔

عام سے شہریوں کو ابھی تک اس تقریر کو سننے میں تاخیر کا سامنا تھا، جس میں ان کے ان بنیادی حقوق کے معطل کیے جانے کے احکامات شامل تھے، جن کی بنیادی حقیقت کا علم انھیں شاید ہی تھا ---

وہ بھی ایک عام سی رات نکلی ---

اور اس کا منتظر ایک اور معمول کا دن ---

بس یہی ایک غیر معمولی بات تھی کہ معمول کے واقعات تسلسل سے رونما ہوتے رہے تھے ---

اور ان کے بیان میں طول طویل جملے، جملہ مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے ---

بلکہ ان کا کارآمد ثابت ہونا تو درکنار، بے کار ہونا برمحل ہو گیا تھا ---

وہاں کا باوا آدم ہی نرالا نہیں تھا ---

شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی نہیں پیتے تھے ---

کبھی کے دن بڑے، نہ کبھی کی راتیں ---

ہاتھی کے دانت کھانے کے اور، دکھانے کے اور۔۔۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ ہی نہیں پکڑتا تھا، ہاتھی کے دانت جو کھانے کے، وہی دکھانے کے۔۔۔

دل کو دل سے راہ نہیں تھی۔۔۔

سنو اپنی، کرو سب کی!!

جو بویا جاتا تھا، وہ کاٹا نہیں جاتا تھا۔۔۔

قبر کا حال مردہ نہیں جانتا تھا۔۔۔

جس پر گزرتی تھی، وہ کہاں جانتا تھا۔۔۔

ساون کے اندھے کو بھی ہری ہری سوجھتی ہے؟

آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل؟

اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی، آج مرے کل دوسرا دن ہوا۔۔۔

وقت ایک سا ہی رہتا ہے۔۔۔

زمانہ کبھی بدلتا نہیں۔۔۔

گڑے مردے کون اکھاڑ سکتا ہے؟

مرے کو کیوں مارے شاہ مدار۔۔۔

ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟

چور کی داڑھی میں تنکا کہاں؟

جس کی لاٹھی اس کی بھینس!!!

بندر کیا جانے ادرک کا سواد۔۔۔

وہ جادو ہی کیا جو سر چڑھ کر بولے۔۔۔؟

جو تین میں، وہی تیرہ میں۔۔۔

مٹی کا مادھو کون ہوتا ہے؟

دل کبھی پتھر کا نہیں ہو سکتا۔۔۔

سب کو ایک آنکھ سے کون دیکھتا ہے؟

وہاں دیکھنے کو دو آنکھیں بھی کم تھیں، پر سُو بہ سُو کا عالم نہیں تھا۔۔۔۔

بس یہ تھا کہ وہ تھا۔۔۔

پہلے بولا جاتا، پھر تولا جاتا---
خامی کہاں تھی، خوبی جہاں تھی---
میرے کان پر جوں نہیں رینگتی---
میرے دماغ میں چیونٹیاں سی نہیں رینگتیں---
وہ دوسرا پہر تھا---
وہ دوسرے پہر کا وقت تھا---
وہ دوپہر تھی؟
میرے کان کی جوں نے شاید جون بدل لی تھی---
دو پہر گزر چکے تھے---
تیسرا پہر آ رہا تھا---
ڈونٹ وش می اے کوالٹی لائف(Don`t wish me a quality life)----
میرے حصے کی چیونٹیاں کہیں چلی گئی ہیں---
خس کم جہاں پاک----
ایم اے مین آف اسٹرا(Am a man of straw)---
میں توہین آمیز اخلاقیات پر یقین نہیں رکھتا''، میں ان اصطلاحات کو خاطر میں نہیں لاتا----
یہ تفاخر---
یہ اطمینان، خود فریبی کے سوا کیا ہے---
یہ اصطلاحات بھی تو توہین آمیز کلمات (contemptous remarks) کے ذیل میں آتی
ہیں---
یہ انسانی تفکر ہے یا توہین؟
یہ کس معاشرتی حالت پر دلیل کرتی ہیں---
میں اسے یہ جو میگنم اوپس (magnum opus) کا تصور ہے---
نہیں تسلیم کرتا---
یہ کس تخلیقی حالت کی دلالت ہے---
میں اس تعلق سے کسی سوفٹ امیج کو نہیں مانتا---

یہ تو ابتری کی صورت ہے، آئی ڈونٹ ہیو اینی آئی کیوز---

میں انٹیلی جنس کوشنٹ (intelligence quotient) کی گردان سے محفوظ رہنا چاہتا ہوں۔

آئی ڈونٹ ہیو اینی ڈیزائرز ٹو کریئیٹ اینی میگنم اوپس (i dont have any desires to create some magnum opus)---

اس کی خبر یا تو اس جھیل کو تھی یا اس پانی کو جس نے کبھی انھیں چاٹنے کا قصد کیا ہوگا۔ میں کس گمان پہ---؟

کس زمین پر؟؟

کس آسمان پر---

خود کو فاتح سمجھوں؟

البتہ ایک حالت میں---

آئی ہیو ٹو بی پراوڈ ٹو بی تھنگ---

ایک ترجمہ کار ابھی ایک ابتدائی زبان کے ہجے کرنے میں مصروف ہے---

میں ارینج مینٹس (arrangements) کی اس دنیا کو ڈوگمیٹک (dogmatic) حد تک اپنا کر گردنیں اڑائے جانے کے مناظر پر تالیاں نہیں پیٹ سکتا---

اب سر پیٹنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا---

میرے دماغ کی چیونٹیاں تو نکل بھاگیں---

یقیناً ان کے پر نکل آئے تھے اور وہ یوں اڑ گئیں، جیسے ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے ہیں---

جب دبستانِ دماغ سے چیونٹیاں چلیں، تو مترجم کے خلوص کو بھی کائی لگ گئی اور ظاہر ہے کہ اس کا جذبہ خیر سگالی ایک بیمار مگرمچھ کے منہ میں چلا گیا، البتہ چیونٹیاں کہاں ہجرت کر گئیں،

اس کی خبر یا تو اس جھیل کو ہوگی جس کے ایک کنارے کی نرم مٹی میں ان کا بسیرا رہا ہوگا---

یا پھر اس پانی کو جس نے کبھی انھیں نگلنے کا قصد کیا ہوگا---

اُس زبان دراز کو کیا خبر کہ ایک زیبرا، ایک زبان کا نام ہے اور ایک زبان ایک ایسے عمل کا نام ہے جس کا ایک مترجم ابھی جہاز رانی کے فوائد اور نقصانات کے کھیل سے باہر نہیں نکلا ہے---

☆☆☆☆

بلال احمد

ایک کہانی۔۔۔ ذرا پرانی

ٹرین لمبے جان لیوا انتظار کے بعد سٹیشن سے سرکنا شروع ہوئی۔ چھک چھک۔۔۔ چھک چھک۔۔۔ چھک چھک۔۔۔ ریل آہستہ آہستہ سٹیشن سے باہر نکلی مگر مسافروں کو کھڑکیاں کھولنے کی اجازت تھی نہ دروازہ۔ ان کے لیے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ کہاں سے گذر رہے ہیں۔ گاڑی سے باہر کا منظر صرف انجن ڈرائیور، اس کا عملہ یا پھر آخری ڈبے میں موجود گارڈ دیکھ سکتے تھے۔ ان کے علاوہ فوج اور پولیس کا وہ محافظ دستہ جو مسافروں کی حفاظت پر مامور تھا کھڑکیاں کھولے آرام سے بیٹھا تھا۔

انجن ڈرائیور کا نام عبدالرحمٰن تھا۔ اس کا معاون اننت سنگھ نامی ایک سکھ اور کوئلہ جھونکنے والا ایک ہندو مزدور موہن داس تھا۔ عبدالرحمٰن اور اننت سنگھ دونوں اسے صرف ”داس“ کہہ کر پکارتے تھے۔

گاڑی چلی تو اننت سنگھ نے ڈرائیور عبدالرحمٰن سے کہا ”مہاراج رائے مان جی“ اب تو خوش ہو جایئے گاڑی چلنے کی اجازت مل گئی ہے۔“ عبدالرحمٰن نے اپنا نام بگاڑ کر لیے جانے پر اننت سنگھ کو گھورا مگر خاموش رہا۔ مگر اننت سنگھ چپ نہ رہا اور بولتا رہا ”دیکھیے مہاراج رائے مان جی آپ اب اس بات پر پریشان ہیں کہ گاڑی پر کہیں حملہ نہ ہو جائے مگر ذرا ہمارا بھی سوچیں ہم پر تو صدیوں سے ظلم ہوتا چلا آرہا ہے، چاہے ہندو کرے یا مسلمان۔۔۔ ہم تو۔۔۔۔“

”فضول باتیں مت کرو اننت سنگھ“ ڈرائیور نے دانت پیستے ہوئے کہا ”میں نے تمھارے ساتھ کیا ظلم کیا۔۔۔؟“

ٹھیک بولتے ہو مہاراج آزادی تو ہندو اور مسلمانوں کو ملی ہے، ہمیں تو نہیں اور پھر ہمیں بہر حال ہندوؤں سے مل کر رہنا ہے۔ آخر کو بسنا تو یہیں ہندوستان میں ہے۔ آپ کے پاکستان تو جا نہیں سکتے۔

عبدالرحمٰن نے گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے جھنجلا کر کہا ”ہمارے لیڈروں نے تمھیں اپنے ساتھ ملانے کی دعوت دی تو تھی تم نے خود ہی اسے ٹھکرایا، اور جو ظلم ظلم کی تکرار تم کر رہے ہو تم ہمیشہ ہی ہم سے الجھتے آئے ہو، جانے دو ان باتوں کو اس وقت کو سوچو اور انسان بن کر سوچو۔“

اننت سنگھ نے کوئی جواب نہ دیا اس کی نظریں باہر کے منظر میں دور و نزدیک کچھ تلاش کر رہی تھیں۔

''کس انتظار میں ہو انت سنگھ جی، ابھی شاید تمھارے بھائی بند کہیں سوئے ہوئے ہیں اور گاڑی بھی ایسے مقام پر نہیں پہنچی کہ حملہ کرنے میں آسانی ہو۔'' ڈرائیور نے طنز سے کہا۔

''نہیں نہیں رائے مان جی ایسی بات نہیں ہے۔'' انت سنگھ کھسیانا سا ہو کر ہنسنے لگا۔

''داس کوئلے نیچے گر رہے ہیں انہیں سنبھالو۔'' عبدالرحمٰن نے کوئلہ جھونکنے والے مزدور کو ہدایت دی اور انجن کے دروازے سے باہر لٹک کر ریل کے ڈبوں کی جانب تکنے لگا۔ کسی مسافر نے کھڑکی کھولنے کی جرات نہیں کی تھی۔ وہ سرد آہ بھرتے ہوئے اپنی سٹول نما سیٹ پر ٹک گیا۔

انجن کے پیچھے والے ڈبے میں فوجی گارڈز تاش کھیلنے میں مصروف تھے۔ ان میں سے اکثر کی رائفلز سیٹ کے کنارے لاپرواہی سے پڑی تھیں۔ سکھ فوجیوں نے اپنی پگڑیاں گرمی سے گھبرا کر اتار دیں تھیں۔ کچھ ہندو محافظ برتھوں پر سوئے پڑے تھے ان میں صرف ایک گارڈ مسلمان تھا وہ کھڑکی کے پاس بیٹھا بے چین مگر محتاط نگاہوں سے باہر کی سمت دیکھ رہا تھا۔

''ایک بازی تم بھی لگا لو رانا صاحب۔'' ایک سکھ فوجی نے مسلمان محافظ کو پکارا۔ محافظ جسے رانا صاحب کہہ کر پکارا گیا تھا نے پلٹ کر ایک سرسری نظر ان سب پر ڈالی اور بولا:

''میری بازی تو لگی ہوئی ہے۔'' اس کے جواب میں ایک زبردست قہقہہ بلند ہوا اور ساتھ کے مسافروں والے ڈبے سے کسی بچے کے رونے کی آواز بلند ہوئی، یہ دبی دبی آواز کسی کے کانوں تک نہ پہنچی۔

راستے میں چھوٹے چھوٹے سٹیشن آتے رہے جہاں گاڑی کو رکنا نہیں تھا۔ عبدالرحمٰن کا بس چلتا تو وہ ان سٹیشنوں پر سے بھی گاڑی کو اڑا کر نکالتا لیکن ایسا کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

شام ڈھلنے لگی تھی اب تک کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ انت سنگھ کا منہ کچھ لٹکا ہوا تھا۔ انت سنگھ اور موہن داس نے ایک دوسرے کو مایوسی سے دیکھا۔ ان کو اس حالت میں دیکھ کر عبدالرحمٰن دل ہی دل میں مسکرایا لیکن فوراً ہی انجانے اندیشوں نے اس کا ذہن جکڑ لیا۔۔۔۔ ''ابھی تو آدھے سے زائد راستہ باقی ہے، الٰہی خیر۔'' ہندوؤں اور سکھوں کے قاتل جتھے کسی بھی مقام پر ٹرین پر حملہ آور ہو سکتے تھے۔

مغرب کا وقت ہو چلا تھا آسمان سرخ تھا کہ اچانک گاڑی ایک زبردست بریک کے ساتھ دور تک گھسٹ کر رک گئی۔ گاڑی کے ڈبوں میں عورتوں اور بچوں کے چیخنے اور سہمے ہوئے انداز میں کلمے کے ورد کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ انت سنگھ کی آنکھیں چمک اٹھیں، موہن داس بھی اپنے چہرے پر آنے والی مسکراہٹ کو دبانے میں ناکام رہا۔ ''کیا بات ہے شریمان رائے مان جی بریک کیوں لگا دی؟'' ''تمھارے بھائی بندوں نے لائن پر بھاری پتھر رکھ دیے ہیں۔'' عبدالرحمٰن نے جلے بجھے لہجے میں جواب دیا۔ ''چلو نیچے اترو پتھر

ہٹائیں۔'' ڈرائیور نے انجن سے نیچے اترتے ہوئے اپنے ماتحتوں کو پکارا۔

حفاظتی گارڈ بھی ڈبے سے اتر آئے، کسی حملہ آور کا بظاہر کوئی نشان دکھائی نہ دیا۔ سامنے درختوں کا ایک بڑا سا جھنڈ تھا۔ مسلمان فوجی جوان بندوق تھامے اسی سمت گھور رہا تھا۔ سکھ کپتان نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ مسافروں کے ڈبوں سے مردوں کو نکالیں تا کہ ریلوے لائن سے بھاری پتھر اٹھانے میں مدد کریں۔ حملے کا کوئی خطرہ نہیں، بہر حال ہم لوگ نظر رکھے ہوئے ہیں۔

ایک ڈبے کا دروازہ کھولا گیا چند مردوں کو نیچے اتارا گیا جن کی حالت مردوں سے بھی بدتر تھی۔ بہر حال آدھ پون گھنٹے کی مشقت کے بعد پتھر ہٹا دیے گئے۔ گارڈ کرپا رام نے سیٹی بجائی اور گاڑی چل پڑی۔

رات سر پہ آ گئی تھی۔ انجن کے ماتھے پہ لگی طاقتور بتی روشن کر دی گئی۔ ''معلوم ہوتا ہے انہیں ادھر آنے کی ضرورت نہیں کوئی اور تر نوالہ مل گیا ہوگا ورنہ حملہ ضرور ہوتا۔'' موہن داس نے اننت سنگھ کے کان میں سرگوشی کی۔

''کیا کھسر پھسر لگا رکھی ہے؟'' عبدالرحمٰن نے دونوں کو ڈانٹا۔

''کچھ نہیں رائے مان جی یہ داس چائے بنانے کو کہہ رہا تھا۔'' اننت سنگھ بولا۔ موہن داس نے تام چینی کی کیتلی اٹھائی اور اس میں پانی بھرنے لگا۔

''خدا کرے میرے بیوی بچے خیریت سے ہوں۔'' عبدالرحمٰن نے دکھ سے سوچا۔

تاریکی بڑھ چکی تھی پوری ٹرین میں کوئی بلب روشن نہ تھا۔ ڈبوں میں انسان بھیڑ بکریوں کی طرح قید تھے۔ پانی کی ایک بوند تک میسر نہ تھی۔ جتنا پانی تھا گرمی کی شدت کے باعث پیا جا چکا تھا۔ بدبو کی وجہ سے سانس تک لینا دشوار تھا اور سفر تھا کہ ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔

اچانک پھر ٹرین کی رفتار آہستہ آہستہ کم ہوتی چلی گئی۔ ایک بڑا اسٹیشن تھا جہاں رک کر انجن کو ایک بار چیک کرنا لازم تھا۔ ٹرین رک گئی مگر کوئی مسافر نیچے نہ اترا کہ پانی ہی پی لے لیکن حملے کے علاوہ یہ خطرہ بھی موجود تھا کہ پانی کے ذخیرے میں زہر نہ ملا دیا گیا ہو۔

سٹیشن کی عمارت نیم تاریک تھی۔ کہیں کہیں کوئی بلب روشن تھا جو اتنے بڑے برآمدے کو روشن کرنے میں ناکام تھا۔ پختہ سرخ اینٹوں سے بنا طویل پلیٹ فارم سنسان پڑا تھا کوئی چائے والا کوئی ہاکر موجود نہ تھا۔ عمارت کے خاتمے پر لوہے کا جنگلا تھا جو ٹوٹا پڑا تھا۔ کوڑے کے ڈھیر پر ٹوٹے صندوق اور اٹیچی کیس ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ پلیٹ فارم بھیگا ہوا تھا جیسے ابھی ابھی دھویا گیا ہو۔ البتہ کہیں کہیں خون کے دھبے نمایاں تھے۔

گارڈ کرپا رام بغل میں سرخ اور سبز جھنڈیاں دبائے پلیٹ فارم پر اتر آیا اور اسٹیشن کے عملے ایک دو افراد سے گفتگو کرتا ہوا اسٹیشن ماسٹر کے دفتر کی طرف چل دیا۔ عبدالرحمٰن انت سنگھ اور موہن داس بھی انجن سے اتر آئے۔ ریلوے کا ایک ملازم کانٹے والے نے عبدالرحمٰن کو دیکھا اور بغیر کسی سوال کے خود ہی بول اٹھا کراسنگ ہے بابو صاحب دوسری جانب سے ٹرین آئے گی تب ہی آپ کو راستہ ملے گا۔ ''کیا بکتے ہو'' عبدالرحمٰن سٹپٹاتے ہوئے تقریباً چیخ اٹھا۔ ''میرے علم کے مطابق اگلے تین گھنٹے تک کوئی ٹرین ادھر سے آنے والی نہیں اور ہمارا سفر بمشکل سوا دو گھنٹے کا باقی رہ گیا ہے۔''

''پتا نہیں سرکار سنا تو یہی ہے۔'' ریلوے اہلکار نے کہا اور لاپرواہی سے ایک جانب چل دیا۔

''کینٹین میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں رائے مان جی، جتنے کتنا وقت لگ جائے۔'' انت سنگھ نے کہا۔

''ہوں۔ تم چلو میں آتا ہوں اور تم موہن داس ذرا کوئلے کی پڑتال کرو۔'' عبدالرحمٰن نے کہا۔

''ابھی دیر پڑی ہے مہاراج وقت آنے پر آگ بھی لگ ہی جائے گی''۔ موہن داس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ابھی عبدالرحمٰن اسے کوئی سخت جواب دینے ہی والا تھا کہ عمارت کے باہر کسی جیپ کا شور سنائی دیا اور ساتھ ہی ''ست سری اکال'' اور جے ہند کے نعرے سنائی دیے۔

''میرا خیال ہے اب کوئلے دیکھ ہی لوں مہاراج۔'' موہن داس بولا۔ عبدالرحمٰن ابھی گومگو میں تھا کہ پھاٹک سے چند ہٹے کٹے سکھ برآمد ہوئے جو ادھر ہی آ رہے تھے۔ ''یہ تو صرف تین چار ہیں سردار جی۔'' موہن داس نے انت سنگھ کے کان میں کہا۔ وہ چاروں قریب آ کر رکے اور ان میں سے ایک سٹیشن ماسٹر کے دفتر میں چلا گیا۔ باقی وہیں ٹھہر گئے۔ عبدالرحمٰن آہستہ آہستہ چلتا ہوا اسٹیشن ماسٹر کے دفتر کی کھڑکی تک گیا اور ایسی جگہ کھڑا ہوا جہاں سے اندر کا منظر دیکھ سکے۔ اس نے دیکھا اسٹیشن ماسٹر اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ میز کی دوسری جانب کرسیوں پر انت سنگھ اور نوارد سکھ بیٹھے ہوئے تھے۔ گارڈ کرپا رام بھی وہیں موجود تھا۔ باہر سے آنے والا سکھ جو حملہ آور جتھے کا سردار تھا انگریز اسٹیشن ماسٹر سے کہہ رہا تھا ''صاحب بہادر تھوڑی سی دیر، ذرا تھوڑی دیر تک گاڑی کو روکے رکھیے۔''

''ام زیادہ دیر تک نہیں روک سکتا سردار جی ـــــ تم قانون کے خلاف بات مت کرو۔''

''اور صاحب جی قانون کو گولی ماریں، روکیں گے تو ہم آپ پر کوئی بات نہ آئے گی۔''

عبدالرحمٰن ابھی یہیں تک سن پایا تھا کہ انگریز اسٹیشن ماسٹر کی نظر اس پر پڑی۔

''یہ باہر کون اے؟'' وہ دھاڑا۔

عبدالرحمٰن فوراً وہاں سے کھسک گیا۔ کرپا رام گارڈ باہر آیا اور بولا ''آپ لوگ انجن میں چلیں گاڑی

بس تھوڑی دیر میں چلانی ہے۔ ''عبدالرحمٰن فوراً انجن میں داخل ہوا تو اس کے ماتحت وہاں پہلے سے موجود تھے۔

''رائے مان جی آپ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہیں میری رائے مان لیں بس اپنے کام سے کام رکھیں۔ ''انت سنگھ نے کہا۔

''انت سنگھ تمھیں کتنی بار سمجھایا ہے کہ میرا نام عبدالرحمٰن ہے، میرا نام نہ بگاڑا کرو۔ ''انجن ڈرائیور نے جھلا کر کہا۔

''آپ کا نام عربی میں ہے شری مان جی میری ہندوستانی زبان پر نہیں چڑھتا میں کیا کروں؟''

جوں جوں وقت گذرتا جا رہا تھا عبدالرحمٰن کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ پہلے بھی دو مرتبہ مسلمان مہاجرین کی ٹرین پاکستان لے جا چکا تھا۔ واہگہ تک بمشکل آدھے مسافر پہنچ سکے تھے۔ وہ اپنی اس بے بسی پر خون کے آنسو روتا تھا کہ کسی صورت ان کی مدد نہ کر سکتا تھا۔ وہ تو بغیر اجازت ٹرین بھی نہیں چلا سکتا تھا۔

''یہ کرپا رام گارڈ کتنا لعین ہے سیٹی ہی نہیں بجا رہا کہ ٹرین چلاؤں۔ ''وہ تنگ آ کر بولا۔

یہ ''لعین'' کیا ہوتا ہے شری رائے مان جی؟ ایسا جان پڑتا ہے کہ عربی زبان میں کوئی گالی ہے۔'' اس بار موہن داس بولا۔ ''تم ٹر ٹر بند کرو۔'' وہ ڈانٹتے ہوئے بولا۔

''مجھے لگتا ہے کہ اس سازش میں سکھ کے ساتھ اسٹیشن ماسٹر اور گارڈ کرپا رام بھی شریک ہیں۔ ''اس نے باہر جھانک کر دیکھا۔

سامنے پلیٹ فارم پر انگریز اسٹیشن ماسٹر اپنی بیلٹ تھامے رعونت کے ساتھ تنا کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ سکھ جتھے کا سردار اور کرپا رام گارڈ بھی تھے۔ اتنے میں دور سے لاریوں اور نعروں کا شور سنائی دیا۔ سکھ جتھے دار نے کرپان نکالی۔ اسٹیشن ماسٹر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ٹرین کے ڈبوں سے عورتوں اور بچوں کے رونے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ ہندوؤں اور سکھوں کا بہت بڑا ریلا اسٹیشن میں گھس آیا۔

محافظ دستے کی طرف سے فائر کھول دیا گیا لیکن ان کی گولیاں ہوا میں کہیں دور نکل گئیں۔ ٹرین کی کھڑکیاں اور دروازے توڑے جانے لگے۔ ڈبوں سے مسافروں کو کھینچ کر باہر نکالا جانے لگا۔ عبدالرحمٰن نے بے بسی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ محافظ دستہ صرف انجن کی حفاظت پر مامور تھا کہ ٹرین کو بہر حال پاکستان لے جانا تھا۔

''آپ لوگ گولی کیوں نہیں چلاتے کپتان صاحب؟'' عبدالرحمٰن نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ کپتان نے سرد نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا ''ہم کس پر گولی چلائیں؟ یہ لوگ تو آپس میں گتھم گتھا ہیں۔ ہماری گولی جتنا حملہ آور کو نقصان پہنچائے گی اتنا ہی مسافروں کو، اور آئندہ مجھ سے اس لہجے میں بات نہ کرنا ڈرائیور۔''

جتھے کا سردار اچانک چیخا ”اوئے بے وقوفو بس کرو۔ اوئے آخر کچھ ہندوستان حکومت کا خیال کرو۔ آخر کچھ مسلے تو پاکستان پہنچیں ورنہ ہماری بدنامی ہوگی ۔۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ ہاہا۔۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔

کچھ دیر بعد محافظ دستہ ٹرین میں سوار ہو گیا۔ گارڈ کرپا رام نے سیٹی بجائی اور انت سنگھ نے ٹرین چلا دی۔ کرپا رام گارڈ اپنے ڈبے میں جانے کی بجائے انجن میں گھس آیا اور بولا اپنے ڈبے تک جاتے جاتے میرے کپڑے لہولہان ہو جائیں گے۔

”لیکن مہاراج خون تو یہاں بھی ہے۔“ انت سنگھ نے خون میں لت پت عبدالرحمٰن کی طرف اشارہ کیا جو آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

”شریمان جی ابھی تو آپ کچھ فرما رہے تھے لیکن میری کرپان آپ کی زبان بند کرنا چاہتی تھی۔۔۔۔ ذرا سنیں تو یہ مسلا مرتے ہوئے کیا کہہ رہا ہے۔ انت سنگھ نے اپنے کان عبدالرحمٰن کے ہونٹوں سے لگائے تو اسے نامانوس لفظ سنائی دیے۔ لا۔۔۔ اللہ۔۔۔ الا اللہ۔۔۔۔

تیز ہوا کے جھونکوں میں انسانی خون کی بو شامل ہو رہی تھی اور گاڑی تیزی سے اپنی منزل کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆☆

ارشد مرشد

اردو ادب ڈاٹ کام

میں کافی دیر سے سوچ کی جھیل میں غوطہ زن تازہ غزل کی رندائی میں مصروف تھا۔ گرچہ غزل مکمل ہو چکی تھی لیکن دو شعروں پہ تسلی نہیں ہو رہی تھی خود کو بھی بھرتی کے لگ رہے تھے۔ یہ تخلیقی عمل بھی عجب گورکھ دھندا ہے۔ کبھی تو ڈھلے ڈھلائے اشعار موسمِ بہار میں پھوٹتے ہوئے شگوفوں کی طرح تخیل کی ڈالیوں پہ چٹخنا شروع ہو جاتے ہیں تو کبھی مشقِ سخن دماغ کی چولیں ہلا کے رکھ دیتی ہے لیکن ایک موزوں مصرعہ نہیں ہو پاتا۔ رموزِ سخن کے انہیں تانوں بانوں میں الجھا ہوا سوچ کا دھارا آمد و آورد کی مختلف کیفیات، بحر اور قافیہ ردیف کی وسعت و تنگ دامنی کے غزل پر ممکنہ اثرات کی جانب بہہ نکلا۔۔ اچانک سائیلنٹ پر لگے فون کی گھر رگھر ایک مجاز کی دنیا سے دوسرے جہانِ مجاز میں واپس لے آئی۔ کیا میں جمیل جہلمی سے بات کر رہی ہوں؟ ٹھہرے ٹھہرے مگر پر اعتماد لہجے میں سوال ہوا۔ جی میں جمیل بات کر رہا ہوں۔ فرمایئے کال کرنے کی زحمت کیسے کی۔

جی میرا نام ثناء ہے اور میں ادب کی ایک ادبی طالبہ کی حیثیت سے بات کر رہی ہوں، بہت عرصے سے اردو ادب ڈاٹ کام پر آپ کی شاعری اور افسانے بہت اشتیاق اور دوچار رے پڑھ رہی ہوں۔ اگر برا مت منائیں تو اسی ضمن میں ایک گزارش کرنا چاہتی ہوں ابتدائی چند جملوں سے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ مخاطب چھچھوری لڑکی نہیں بلکہ کوئی سنجیدہ مزاج پڑھی لکھی خاتون ہے۔

جی جو کہنا ہے بلا جھجک کہیں، مجھے یقین ہے کہ آپ تہذیب اور اخلاقیات کی حدود سے اچھی طرح واقف ہوں گی۔

میری ادبی رائے میں آپ کی نظم اور نثری تحریر بہت جاندار ہے اور آپ کے وسعتِ مطالعہ قوتِ مشاہدہ اور آج کے انسان کے معاشرتی، سماجی، نفسیاتی رویوں اور مسائل پر آپ گہری نظر کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں لیکن غزل میں بہت سے اچھے اشعار کی موجودگی کے باوجود نظم اور افسانے جیسا تنوع، پختگی اور بے ساختگی کی کمی دکھائی دیتی ہے۔ ایک لمحے کے لیے پیدا ہونے والی منہ کی کڑواہٹ کو نگلتے ہوئے میں نے زبان پر شائستگی کا ملمع چڑھا کر آہستگی سے جواب دیا! محترمہ پہلے تو میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ میری تحریروں کو اپنے قیمتی وقت کا متبادل سمجھتی ہیں۔ آپ کی رائے سر آنکھوں پر لیکن اگر مجھے کچھ عرض کرنے کی اجازت دیں تو بس

اتنا کہنے کی جسارت کروں گا کہ درحقیقت ادب کی سبھی اصناف کا الگ مزاج اور انفرادی رنگ ڈھنگ ہوتا ہے۔ جہاں تک غزل کا تعلق ہے تو اس میں شاعر کا طائرِ تخیل بحور اور قافیے ردیف کے سانچوں میں مقید ہونے کی وجہ سے پورے پر کھول کر اڑنے سے قاصر ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑے غزل گو شعرا بشمول نامور اساتذہ کا کلام لے لیں آپ کو چیدہ چیدہ ایسی غزلیں دکھائی دیں گی جن کے تمام اشعار معیار اور عمدگی کے اعتبار سے ایک جیسے ہوں۔ میں نہایت وثوق سے کہتا ہوں کہ کوئی بڑے سے بڑا شاعر ایسا نہیں ہوگا جس کے دیوان میں بھرتی کے اشعار کی اچھی خاصی تعداد موجود نہ ہو مقصد ہرگز غزل کو کم تر ثابت کرنا نہیں آج بھی اصنافِ سخن میں غزل کو اعلی مقام اور امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن آج وقت محبوب کے عارض و رخسار کے قصیدے پڑھنے اور ہجر و فراق کی ماتمی کیفیات بیان کرنے سے بہت آگے نکل چکا ہے۔ جدید موضوعات کے جبری گھسیڑ پن نے غزل کے فطری حسن اور اصل چہرے کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ میری ادنی رائے میں وقت گزرنے کے ساتھ غزل کا دامن تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ بات زیادہ طویل ہو گئی۔ آپ کے مخلصانہ جذبات کی تائید میں آئندہ ذاتی حوالے سے فکر و فن کے قدرے مضبوط شعبے پر زیادہ توجہ مبذول کرنے کی کوشش کروں گا۔

اس کی عمر بتیس تینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ متوسط جسمانی اور خاندانی پس منظر کے ساتھ آنکھوں کی گہرائی اور پتلیوں کی مسلسل گردش اس کے پرتجسس اور ذہین ہونے کا پتہ دیتی تھیں۔ اردو ادب میں ایم۔ فل کرنے کے بعد گزشتہ چند سالوں سے ایک مقامی کالج میں بطور معلّمہ تعینات تھی۔ رشتوں کی منڈی میں ابھی تک اس کا مول نہیں لگ پایا تھا۔ روایات اور دستورِ سماج کے مطابق اس کے ٹھیکے دار بھی اس کے والدین ہی تھے، مناسب وقت پر دیر کر دی۔ اب جو بھی ٹینڈر بھرتے بولی کوئی اور لے جاتا۔ حتی کہ اب صورتِ حال کسی بچھڑے ہوئے پنچھی یا رنڈوے کی تلاش تک آ پہنچی تھی۔ اردو ادب ڈاٹ کام کے توسط سے شروع ہونے والا تعلق دھیرے دھیرے ایک رشتے اور ایک بندھن میں تبدیل ہو گیا۔ سلسلہ باتوں سے شروع ہو کر ملاقاتوں اور پھر دنوں اور راتوں پر محیط ہوتا چلا گیا۔ خود کو منڈی کے بھاؤ تاؤ اور رشتوں کے شور شرابے سے محفوظ رکھنے کے لیے اس نے اوپن یونیورسٹی کے ذریعے پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ لے لیا۔ جب تحقیقی مقالے کے لیے موضوع کے انتخاب کا وقت آیا تو ہم دونوں مناسب موضوع کی تلاش میں ناول نویسی اور اس کے مستقبل، جدید تنقید کے مختلف نظریوں اردو غزل و افسانے کے جدید رجحانات جیسے موضوعات میں سے طویل بحث و تمحیص کے باوجود مقالے کے لیے کسی حتمی موضوع کا چناؤ نہ کر پائے۔ عصرِ حاضر کے حوالے سے نظم و نثر کے بہت سے نامور لکھاریوں پر عرق ریزی کے بعد بچہ بغل میں ڈھنڈورا شہر میں کا نعرۂ مستانہ بن کر اس نے استفہامیہ نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا: آئیڈیا برا نہیں آپ پر بھی طبع آزمائی کی جا سکتی ہے۔

اوے نہیں یار! من آنم کہ من دانم۔ معروف ناول اور افسانہ نگار محمد الیاس کے بارے میں کیا خیال ہے۔ واؤ! وہ ایکدم خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولی، یار کیا درویش منش آدمی ہے۔ نہ نام و نمود کی خواہش اور نہ بڑے ادیبوں جیسی تمکنت اور خود پسندی کا مرض۔ گوشۂ گمنامی میں محصور ہو کر لکھے جا رہا ہے اور کیا خوب لکھے جا رہا ہے۔ میری دیرینہ خواہش تھی کہ ادب کے اس اعلیٰ شان حرم کی غلام گردشوں میں گھوموں اور اس کے تہ خانوں کے نہاں گوشوں تک رسائی حاصل کر سکوں۔

اسے علم تھا کہ میں شادی شدہ ہونے کے ساتھ تین بچوں کا باپ بھی ہوں۔ وہ بلا شرط، اعلانیہ یا غیر اعلانیہ شادی کے لیے رضامند تھی۔ لیکن اسے یہ علم نہیں تھا کہ عورت کے لیے چاہت زندگی کی منزل اور مرد کی محبت راستے کے پڑاؤ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اور یہ کہ مرد عمر اور مرتبے کے جس مقام پر بھی پہنچ جائے عورت کو مفتوح کر کے مالِ غنیمت سمیٹنے کی فطری اور روائتی کمینگی سے خود کو آزاد نہیں کر پاتا۔ اور پھر مجھ جیسا لکھاری تو ویسے بھی عمل اور حقیقت کی دنیا سے دور تمام عمر تخیلاتی بستیوں میں خوابوں کے تنکوں سے آشیانے بنانے میں مگن رہتا ہے۔ اب صورتِ حال قابو سے باہر ہوتے دیکھ کر پسپائی اور قطع تعلق کا مرحلہ آن پہنچا تھا کسی بڑے فیصلے کی ہمت اور حوصلہ بھی نہیں تھا اور اس کی دل شکنی کا خوف بھی قلب میں کچوکے لگا رہا تھا۔ اسی گومگو کی کیفیت میں چلتے چلتے ایک دن بات داستان گوئی،، ناول نویسی، کہانی کے منزل بہ منزل مرحلہ بہ مرحلہ سفر سے ہوتے ہوئے افسانے کی ہیئت اس کی تاریخ، اجزائے ترکیبی اور کہانی اور افسانے کے درمیان فرق تک پہنچ کر ادبی بحث میں تبدیل ہو گئی۔ میں نے کئی سالوں سے ذہن میں کلبلاتا ہوا سادہ سا مگر اہم سوال اس کے سامنے رکھ دیا۔ ثنا! آپ کی دانست میں افسانے کی سادہ اور عام فہم الفاظ میں کیا تعریف ہے۔؟ وہ یہ پرکھنے کے لیے کہ کہیں میں اس کی علمیت کا امتحان تو نہیں لے رہا اپنی سپاٹ اور گہری نظروں سے میرے چہرے کے تاثرات پڑھتے ہوئے بولی، جمیل صاحب سوال بظاہر بہت آسان اور بنیادی نوعیت کا ہے لیکن اس کے جواب کے لیے شاید مجھے تھوڑا وقت درکار ہو گا۔ زیادہ تفصیل میں جائے بغیر بس اتنا سمجھ لیجیے افسانہ درحقیقت کہانی ہی کی مختصر اور سکڑی ہوئی جدید شکل ہے۔ کہانی کار کہانی کے کرداروں، ان کے تاثرات، احساسات اور مناظر کی ساری گرہیں کھول کر تمام تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ قاری کے سامنے رکھ دیتا ہے جب کہ افسانے میں بہت کچھ پڑھنے والے کی اپنی فراست اور صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ایک اور زاویہ نگاہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر افسانے کے اندر ایک کہانی ہوتی ہے لیکن ہر کہانی کے اندر افسانے کا ہونا ضروری نہیں۔ کہانی کے برعکس افسانے کو روایتی آغاز اور انجام سے استثنیٰ ہوتا ہے۔ داستان گوئی کو اگر ہم ایک لمحے کے لیے دودھ تصور کر لیں تو افسانہ ہمیں کھوئے یا برفی کی شکل میں نظر آتا ہے۔ بنیادی اجزا وہی ہیں لیکن وقت کی بھٹی پر مسلسل ہلکی آنچ پر

کڑھنے سے اس کی تاثیر زیادہ اور حجم کم ہو جاتا ہے اور یہی حقیقت داستان گوئی سے افسانے تک کے سفر کی ہے۔ آخر میں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ کہانی اور افسانے کے فرق کو پرکھنے کے لیے کوئی پیمانہ یا کسوٹی موجود نہیں۔ یہاں تک کہ منٹو جیسے عظیم لکھاری کے بھی بہت سے افسانوں پر کہانی کا گمان ہوتا ہے۔ لمبی چوڑی تقریر کے بعد اس نے داد طلب نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا، کیا سمجھے جناب؟

ہوں ں ں۔۔۔ سب سمجھ گیا۔ کہو تو دہرا دوں اس لیکچر کا خلاصہ؟ جی ضرور کوشش کریں اس نے لہجے میں استادانہ رعب اور دبدبے کا مصنوعی رنگ بھرتے ہوئے شگفتگی سے مسکرا کر کہا۔

کہانی یہ ہے کہ ایک ذہین، حساس اور پرکشش لڑکی اور زندگی کی سہ پہر کو چھوتے ادھورے، متجسس اور بکھرے بکھرے ایک شخص کا ادبی حوالے سے بذریعہ انٹرنیٹ تعلق بن گیا جو وقت گزرنے کے ساتھ احترام اور دوستی کی حدیں عبور کرتا ہوا اس مقام تک جا پہنچا جہاں ملنے کی خواہش ملنے کے بعد کسک میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اب اس کہانی کو حتمی انجام تک پہنچانے کے لیے بہت سے طریقوں سے بنا جا سکتا ہے۔ درمیان میں کوئی تیسرا لڑکا یا لڑکی آ گئی۔ کسی ایک کے والدین نے انکار کر دیا۔ دونوں بھاگ گئے آخر میں دونوں میں سے ایک محبت کی آگ میں جل کر راکھ ہو گیا یا پھر دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے وغیرہ وغیرہ۔

یہ کہانی تو کچھ سنی سنی سی لگتی ہے۔ ثناء نے پر اشتیاق اور شرارتی لہجے میں مخل ہوتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے سلسلۂ گفتگو آگے بڑھاتے ہوئے بات جاری رکھی، اور افسانہ یہ ہوتا ہے کہ اس بے ہمت اور کم ظرف آدمی کا شجرِ جنوں حقیقت کی آندھی کے زور سے زمین بوس ہو گیا۔ اور پھر ایک روز وہ آخری ملاقات میں کسی ثقیل ادبی موضوع پر گفتگو کرنے کے بعد وہ کسی کالے کچھوے کی طرح وقت کے بدبودار حوض میں ڈبکی لگا کر روپوش ہو گیا۔

☆☆☆☆

سید ماجد شاہ

گھر آباد ہیں

دھماکے نے اس کے ماں باپ کو ایسے بکھیر دیا تھا۔ جیسے تسبیح ٹوٹ کر دانہ دانہ ہو جاتی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں دشمنوں کی دہشت سے زیادہ ہمت تھی۔

اپنے ہاتھوں سے چنے تسبیح کے دانے، جب وہ اپنے آبائی گاؤں لائی تو ۔۔۔۔

پہاڑ اپنا سبز سینہ تانے کھڑے تھے۔

پگڈنڈیاں ویسے ہی آباد تھیں۔

گھر آباد تھے۔

چاند، سورج ویسے کے ویسے رواں تھے۔ جیسے بے مقصد بہتے چلے جا رہے ہوں۔

چار ماہ بعد ۔۔۔۔

اس کے آنگن میں زیتون کے درخت پر فاختہ کا گھونسلہ بن رہا تھا۔ تنکا تنکا خوشیاں پروئی جا رہی تھیں۔ سانولی سلونی ماہ نور کے فاختئی رنگ میں خوب نکھار آ گیا تھا۔ پہاڑوں کے سنہری تاج صبح کے منظر کو پہلے سے کہیں زیادہ روشن کرتے تھے۔ شام کی سیاہی ان دنوں اپنی ہولناکی کہیں بھول آتی تھی۔ وہ دیر تک سامنے کی پہاڑی کے اونچے درختوں کے مضبوط تنے اندھیرے میں ڈوب کر گم ہوتے دیکھتی تھی۔ اندھیرے کا خوف آج کل اس کے دل سے یوں ختم ہو چکا تھا۔ جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ رات دیر تک اسے اندھیرے میں رہنا بہت اچھا لگتا تھا۔

چچا، چچی اسے کچھ نہ کہتے تھے۔ چاہے وہ رات گئے تک اندھیرا اوڑھے بیٹھی رہے۔ ان کے خیال میں بم دھماکے کے بعد ماں باپ کے لوتھڑے سمیٹنے والی ماہ نور اگر رات کے اندھیرے میں اپنا غم گھول کر، خود کو خالی کر رہی ہے تو ٹھیک ہے۔ شاید اسی طرح، اس کے سینے کا اندھیرا بھی کچھ کم ہو جائے گا۔

ماہ نور کے خواب چند دنوں میں ایسے ہو گئے تھے کہ دن کی روشنی میں شرم سے اس کی پلکیں بہت تیز تیز جھپکنے لگی تھیں۔ ہر سانس پر وہ دوپٹہ ہی سیدھا کرتی رہ جاتی تھی۔

ارسلان، کو جب کراچی میں، اپنی منگیتر ماہ نور کا خیال آتا تو شہر کی وسعت سمٹ کر تنگ و تاریک بستی

سے بدتر ہو جاتی تھی۔ پورا شہر بے رونق اور ویران لگنے لگتا تھا۔ ملگجی رنگ، کے جوبن سے اس کا منہ، نمکین پانی سے بھر جاتا تھا۔

نر اور مادہ کی قربت میں نئی زندگی کی رونقیں ٹھاٹھیں مار رہی تھیں۔ دو دریا مل کر چلنے تھے۔ زمینیں سیراب ہوئی تھیں۔ زرخیزی کے ذرے چمکنے تھے۔ فصلیں لہلہائی تھیں۔ یہ کمبخت زرخیزی دن کو رات میں بدل دیتی ہے۔

زندگی کے معاملات کچھ اس تیزی سے تبدیل ہوئے تھے کہ چٹ منگنی پٹ بیاہ نے ان کی زندگیاں یکسر بدل کر رکھ دی تھیں۔ ابھی چار ماہ قبل ارسلان جب لاشوں کے ہمراہ آیا تھا تو وہ ماہ نور کو جانتا تک نہ تھا اسے صرف یہ پتا تھا کہ اس کے ابا کے دوست اور ان کی بیوی، بم دھماکے میں شہید ہو گئے ہیں اور اسے لاشیں ان کے آبائی گاؤں تک پہنچانی ہیں۔

تب اسے ماہ نور صرف دلیر لگی تھی۔ وہ پہاڑی لڑکی پہاڑوں کا سا عزم رکھتی تھی۔ اس نے ماں باپ کے لوتھڑے خود سمیٹے تھے اس عمر میں، جس عمر میں لڑکیاں پھول چنتے ہوئے ہاتھ زخمی کر لیتی ہیں۔۔۔ وہ ذرا بھی نہیں گھبرائی تھی۔۔۔ بس اداس تھی، گہری اداسی اس کی ملیح رنگت کو تھوڑا سیاہی مائل کر گئی تھی۔

ارسلان کے اماں ابا اس کی ہمت سے بہت متاثر تھے۔ کہتے تھے جس میں جتنا حوصلہ ہوتا ہے اسے اتنا ہی آزمایا جاتا ہے۔ ماہ نور حوصلے کا پہاڑ تھی۔ اسے شاید اتنا ہی آزمایا جا رہا تھا۔ سر اٹھا کر زندہ رہنا اس سے کوئی نہیں چھین سکتا تھا۔ وہ زندگی میں یوں گھل مل گئی تھی کہ دکھ اسے زندگی کے اور قریب کر گئے تھے۔

ایک ہفتہ پہلے تک اکلوتا ارسلان باپ کے فیصلے پر خوش نہ تھا۔ گاؤں آنے تک وہ خود کو بلی کا بکرا سمجھ رہا تھا۔ چپ تھا تو ترس کھا کر۔ اس کا ابا بتا چکا تھا کہ ماہ نور کا سوتیلا چچا اسے زیادہ عرصہ پاس نہیں رکھے گا۔ وہ اس وقت دنیا میں بالکل اکیلی ہے۔ نکاح، نیکی بن کر اپنا لطف کھو چکا تھا۔ وہ بے دلی سے آیا ہوا تھا۔

زندگی کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ رکنے کا نام نہیں لیتی۔ جیسے زلزلے کے بعد گھروں کے ملبے سے سبز سبز گھاس زندگی کی علامت بن کر نکل آتی ہے۔ پچھلے ہفتے ماہ نور نکاح کے روپ میں گندھی ہوئی صبح سویرے بغیر کسی غازے کے، اچانک ارسلان کے سامنے آ گئی کہ وہ سلونے رنگ کی چمک دیکھ کر نمک کا بت بن کر رہ گیا تھا۔

اسے کبھی سفید رنگت کے بغیر کچھ نظر ہی نہ آیا تھا۔ لیکن سانولے کا ڈسا کہاں پانی مانگتا ہے۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔

نکاح کے ہفتے بعد رخصتی تھی۔ سو باپ بیٹا واپس چلے گئے۔ اجڑی ہوئی بے سہارا ماہ نور میں زندگی موجزن ہو گئی۔ فاختہ کی چونچ تنکا تنکا زندگی بننے لگی۔ ماں باپ کے سرخ لوتھڑوں کے ملبے سے گھاس کے سبز

تنکے سر نکالنے لگے۔

رنگین خیالوں کی بارات آئی، رنگوں کی مہک لیے ماہ نور کو ساتھ لے گئی۔ بارات کیا تھی ماں باپ اور ارسلان، یعنی ماہ نور کی نئی کائنات۔ وہ جیسے کسی نئے سیارے پر آ گئی تھی۔ ماں باپ کا متبادل تو کوئی نہیں ہوتا لیکن ماں باپ کی سی شفقت لیے انہی جیسے دو کردار اس کے اردگرد تھے۔

واپسی پر ٹرین کی چھکا چھک نے ماہ نور کی دھڑکن سے ایک ردھم بنا لیا ہر جھٹکا وہ دل تک محسوس کرنے لگی تھی۔

ارسلان اور ماہ نور کی آنکھیں جب چار ہوتیں ہونٹوں پر مسکان پھیلتی جسم ان دیکھی لذت سے لبریز ہو جاتے۔ ٹرین منزل پر رک گئی۔

اچانک ایک تیز روشنی پل بھر کے لیے نمودار ہوئی، دھماکے کا دھواں پھیلا اور آہستہ آہستہ سب صاف نظر آنے لگا۔

دھماکے نے ان تینوں کو ایسے بکھیر دیا تھا، جیسے تسبیح ٹوٹ کر دانہ دانہ ہو جاتی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں دشمنوں کی دہشت سے کہیں زیادہ ہمت تھی۔

اپنے ہاتھوں سے چنے تسبیح کے دانے جب وہ سمیٹ چکی تو ۔۔۔۔

اس خیال سے کانپ کر رہ گئی کیوں کہ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ ان ٹکڑوں کا آبائی قبرستان کہاں ہے!

پہاڑ اپنا سبز، سینہ تانے کھڑے تھے۔

پگڈنڈیاں ویسے ہی آباد تھیں۔

گھر آباد تھے۔

چاند، سورج ویسے کے ویسے رواں تھے۔ جیسے بے مقصد بہتے چلے جا رہے ہوں۔

☆☆☆☆

سجاد بلوچ

روزے

”صاحب جی! روزے آنے میں کتنے دن باقی ہیں؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

یہ علی کا معمول تھا۔ جوں ہی میں دکان میں پہنچتا، علی پلاسٹک کی سبز ٹرے میں چھوٹی سی چینک اور پیالیاں دھرے دکان میں داخل ہوتا اور ساتھ ہی یہ سوال جڑ دیتا۔ رمضان سے دو تین ماہ قبل اس سوال کی گونج علی کی زبان پر اور میری دکان میں اکثر سنائی دیتی۔

شمال آباد قصبے کے جس بازار میں میری کپڑوں کی دکان تھی، وہ ایک چھت تلے بنی کئی دکانوں پر مشتمل لمبی سی مارکیٹ تھی، وہ لوگ اسے مارکیٹ ہی کہتے تھے۔ اس کے ایک سرے پر چھت کو جاتی سیڑھیوں کے نیچے چائے کا کھوکھا تھا۔ لوگ اسے برف کاٹھیا بھی کہتے تھے کیوں کہ یہاں گرمیوں میں برف بھی فروخت ہوتی تھی۔ علی اسی چائے والے کے پاس کام کرتا تھا۔ مارکیٹ میں سب دکانوں پر چائے تقسیم کرنا اور دکان داروں سے پیسے وصول کرنا اس کی ذمہ داری تھی۔ اس کی عمر بمشکل دس برس ہو گی۔ اس کا تایا زاد بھائی کسی اور ہوٹل پر کام کرتا تھا جس کے ساتھ وہ دوردراز علاقے سے کام کی غرض سے یہاں آیا تھا۔

اس قصبے کا نام شمال آباد کیوں پڑا؟ اس بارے میں کئی سینہ بہ سینہ چلتی روایات سننے کو ملتی ہیں۔ ایک وجہ تو یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہ قصبہ پنجاب کے میدانی علاقوں کے آخری سرے پر، شمال کے پہاڑی سلسلے کے دامن میں واقع آخری قصبہ ہے۔ کچھ لوگ یہ بھی بتاتے ہیں کہ اسے شمال سے آنے والے ایک قبیلے نے آباد کیا تھا، اسی لیے اسے شمال آباد کہا جاتا ہے۔

”صاحب جی! روزے آنے میں کتنے دن باقی ہیں؟“ علی انتہائی معصومیت سے یہ سوال پوچھتا اور میری کوشش ہوتی کہ اسے تسلی بخش جواب دوں۔ میں اسے آسان لفظوں میں سمجھانے کی کوشش کرتا اور بظاہر ایسا لگتا کہ علی کو بات سمجھ آ گئی ہے لیکن پھر وہی ڈھاک کے تین پات۔۔۔ علی چہرے پر وہی معصومیت اور لبوں پر وہی سوال سجائے کچھ دیر بعد دوبارہ میرے سامنے کھڑا ہوتا۔ البتہ وہ اتنی بات ضرور سمجھتا تھا کہ کسی گاہک کی موجودگی میں زیادہ تنگ نہیں کرنا۔ اگر کوئی گاہک پاس بیٹھا ہوتا اور کپڑوں کے تھان ادھر ادھر کھلے پڑے ہوتے تو علی سوال تو پوچھتا لیکن عدم دلچسپی سے۔۔۔ جیسے بس حجت تمام کر رہا ہو اور جانتا ہو کہ ابھی اسے اپنے سوال کا جواب نہیں ملنا۔ سو وہ چلتے چلتے پوچھتا اور جلد سے جلد دکان سے نکل جانے کی کوشش کرتا۔ کبھی

کبھار مجھے محسوس ہوتا کہ وہ یہ سب جان بوجھ کر کرتا ہے۔ بس مجھے چڑانے کے لیے۔ لیکن میں ضبط کرتے ہوئے مسکرا دیتا اور کہتا: ”بعد میں جب برتن لینے آؤ گے، تب بتاؤں گا، ابھی جاؤ شاباش“ اور علی چائے کی ٹرے کو گاڑی کا سٹیئرنگ تصور کرتے ہوئے دائیں بائیں گھماتے ہوئے جلدی سے نکل لیتا۔ وہ بازوؤں کی کمان سی بناتا اور انہیں دائرے میں گھماتا جاتا۔ مارکیٹ کے اندر یوں چلتا جیسے کسی خم دار پگڈنڈی پر چل رہا ہو۔ وہ تیزی سے راہ گیروں اور گاہکوں کے بیچ میں سے بچ بچ کر نکلتا۔ جیسے اپنے اردگرد پھیلی مشکلات اور دکھوں کے جال میں سے خود کو بچا کر نکل رہا ہو۔ وہ گاڑی کے انجن جیسی آوازیں بھی نکالتا۔۔۔ ہنگ ہنگ ہنگگگگگ۔۔۔ کسی سست رفتار راہ گیر کے ساتھ ممکنہ ٹکراؤ کے خدشے کے پیشِ نظر ہارن بھی بجاتا۔۔۔ ٹی ٹی ٹیٹ۔۔۔ ٹی ٹی ٹیٹ۔۔۔ وہ یوں ہی ہارن بجاتا اور راہ گیروں کو اپنی تصوراتی گاڑی سے بچاتا ہوا اپنے چائے کے ٹھیے کی طرف اور پھر وہاں سے ادھر ادھر چائے اٹھائے چکر لگاتا رہتا۔ وہ آتے جاتے دکانوں کے باہر پڑی چیزوں کو بھی چھیڑتا اور دکان داروں کا صبر آزماتا۔ کچھ دکان دار جو سخت مزاج کے تھے اور اس کی حرکتوں سے تنگ آ چکے تھے، اسے باقاعدہ گالیاں دیتے۔ کچھ محض بڑبڑا کر اور کچھ صرف سر ہلا کر رہ جاتے۔ شیرو کمہار نے تو ایک بار ننگی گالیاں دیں اور اسے پکڑ کر اس پر ہاتھ اٹھانے لگا تھا کہ میں بھاگ کر دکان سے باہر نکلا اور اس نے میرے سمجھانے پر علی کو چھوڑ دیا۔ میں نے بھی کئی بار پیار سے سمجھانے کی کوشش کی لیکن اسے جیسے کچھ یاد ہی نہیں رہتا تھا۔ وہ ہر دن کا بلکہ ہر پہر کا آغاز نئے سرے سے کرتا لیکن پرانی ڈگر پر۔۔۔ وہ جب بھی چائے لاتا ایک ہی سوال دہراتا۔ اس کی یہی کوشش ہوتی کہ سوال کا جواب مل جائے۔ جیسے اگر آج جواب نہ ملا تو اسے رات کو نیند نہیں آئے گی۔ ایک دن میں اپنی کسی پریشانی میں بیٹھا تھا کہ اس نے وہی سوال دہرایا اور میں نے ڈانٹتے ہوئے کہا ”یار! اس مارکیٹ میں تمھارے سوال کا جواب دینے کے لیے کیا ایک میں ہی رہ گیا ہوں؟ کیا باقی لوگ چائے نہیں پیتے؟ یا میں تمھیں کوئی امام مسجد دکھائی دیتا ہوں؟ کیا میں نے رمضان کا چاند دیکھنا ہے؟“

ایسی صورتِ حال کو بھانپتے ہوئے علی کھسیانہ سا ہو کر دکان سے نکل لیتا لیکن اسے چین نہیں پڑتا تھا۔ شام کو چائے کے پیسے وصول کرتے وقت دکان کا دروازہ پکڑ کر کھڑا ہو جاتا اور دکان میں سجے رنگ برنگے کپڑوں کو چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہتا، کبھی کن انکھیوں سے مجھے بھی دیکھتا اور حالات کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا۔ ایسی صورت حال میں اس کے چہرے پر ایک معصوم مسکراہٹ کھیلتی دکھائی دیتی اور جب مجھے گاہکوں سے فرصت ملتی تو اسے چائے کے پیسے پکڑاتے ہوئے ہنستے ہنستے اس کے سوال کا جواب بھی دے دیتا۔

علی بہت شرارتی تھا اور میں اس کی معصومانہ باتوں سے لطف اٹھانے کے ساتھ ساتھ اس پردیسی

غریب بچے کی دلجوئی بھی کرتا رہتا جو اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں سے میلوں دور یہ معمولی کام کر کے اپنے کنبے کی مدد کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کبھی کبھار میرے ڈانٹنے کے باوجود وہ اگلے دن سب کچھ بھول بھال کر پھر سے دکان میں بیٹھا کوئی چیز اٹھا کر معصومیت سے الٹ پلٹ رہا ہوتا تھا۔ اس کی ان حرکتوں پر میں صرف منہ بسور کر ناراضی کی اداکاری کرتا اور وہ کھسک جاتا۔

شام کے وقت علی کا کام بھی کم ہو جاتا، بسوں کا اڈہ بھی ویران ہو جاتا اور مارکیٹ میں خاموشی چھانے لگتی کیوں کہ زیادہ تر دکان دار دکانیں بڑھا دیتے۔ میری دکان میں بھی شام کے وقت کچھ زیادہ گاہک نہیں آتے تھے۔ دکان پر کام کرنے والے دونوں لڑکے بھی اس وقت تک چھٹی کر جاتے تھے کیوں کہ وہ علی الصبح دکان کھولتے تھے اور میرے دکان پر پہنچنے سے قبل آنے والے اکادکا گاہکوں کو بھگتاتے تھے۔ شال آباد ایک مضافاتی قصبہ تھا۔ یہاں کاروبار زندگی کا آغاز علی الصبح ہوتا تھا اور دن ڈھلنے کے ساتھ ساتھ بھیڑ بتدریج کم ہوتی چلی جاتی تھی۔ صبح سویرے آس پاس کے دیہاتوں سے ہزاروں لوگ پک اپ، چھکڑوں اور بسوں پر سوار شہر میں داخل ہوتے جن میں سے زیادہ تر دودھ، انڈے، مرغیاں، سبزیاں، اجناس اور مال مویشی بیچنے آتے تھے۔ ان میں سے بیشتر نے خرید وفروخت مکمل کر کے دوپہر تک گھروں کو لوٹنا ہوتا تھا۔ خاص کر گرمیوں کے موسم میں تو دوپہر کے وقت ہر طرف سناٹا چھا جاتا۔

مارکیٹ کے سامنے ہی بسوں کا اڈہ تھا۔ ایسی صورت حال میں دن کے وقت وہاں اکادکا بسیں ہی نظر آتی تھیں۔ کبھی کبھار تو ایک آدھ بس خالی کھڑی دکھائی پڑتی۔ ایک آدھ بھولی بھٹکی سواری آ کر بیٹھ جاتی اور وہ بھی بڑے شہر سے آنے والے لوگ ہوتے جو اپنے کام کاج نمٹا کر گاؤں واپس جا رہے ہوتے۔ دن کے وقت بسیں ہمیشہ دیر سے نکلتی تھیں کیوں کہ اکثر انہیں خالی جانا پڑتا تھا، البتہ شام کے وقت بسیں اور دوسری گاڑیاں مسافروں سے لدی ہوئی جاتی تھیں۔ ان بسوں میں دن بھر کام کرنے والے دکان دار، ریڑھی بان اور ملازمین گھروں کو واپس پلٹتے تھے۔ دن کے وقت بسوں کے ڈرائیور اور کنڈکٹر کیکر کے درخت کی ادھوری چھاؤں میں بچھی بڑی سی چارپائی پر بیٹھ کر تاش کھیلتے رہتے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک سو جاتا تو باقی چائے والے کا بینچ اٹھا لاتے اور اس پر بیٹھ کر وقت گزارتے یا کچھ اپنی گاڑیوں میں پڑے اونگھتے رہتے اور آنکھ کھلتے ہی آواز لگاتے:

”چھوٹے ذرا چائے تو لانا“ اور علی تیزی سے ان کی طرف لپکتا۔

مجھے یاد ہے جب علی یہاں نیا نیا آیا تھا تو اس کے چہرے پر کچھ رونق موجود تھی لیکن اب تو کافی دبلا پتلا اور کمزور ہو گیا تھا۔ وہ سارا دن چائے ڈھوتا اور ہوٹل کے مالک اور دکان داروں کی جھڑکیاں سہتا۔ وہ

شرارتیں بھی تو بہت کرتا تھا سواسے دکان داروں سے اکثر ڈانٹ پڑتی تھی۔ ہوٹل کا مالک اسے مارتا پیٹتا بھی تھا۔ جب بھی مالک سے مار پڑتی، وہ پریشان صورت بنا کر میرے پاس آبیٹھتا لیکن اس کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں دیکھے۔ میں نے اس ہوٹل کے مالک کو کئی بار سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ غریب بچے پر یوں ظلم کرنا ٹھیک عمل نہیں لیکن اس کا ایک ہی جواب ہوتا:

”بھاجی میری اتنی کمائی کہاں ہے کہ میں اس طرح پیسے ضائع کرتا رہوں۔ میں نے بھی حساب دینا ہوتا ہے۔ دودھ والے اور کریانے والے کو روز کے روز پیسے دینے پڑتے ہیں۔ یہ کبھی وصولیاں بھول جاتا ہے، کبھی پیسے گرا آتا ہے۔“

ایک بار اس نے اپنے جواب میں اتنا اضافہ کیا ”اور اب تو ایسا لگتا ہے اس نے چوری کرنا شروع کر دی ہے“ میں نے فوراً علی کی طرف دیکھا۔ علی نے نظریں جھکا لیں، جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

اگلے دن جب علی چائے دینے آیا تو میں نے اسے چوری کے بارے میں اچھا خاصا لیکچر دیا۔ علی خاموشی سے ساری بات سنتا رہا۔ اتنے میں ایک گاہک دکان میں داخل ہوا اور وہ موقع پا کر چپکے سے نکل گیا۔ اس پر تو کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ میں نے سوچا میں یونہی فضول تقریر کیے جا رہا ہوں۔ جس بچے کو مار کھاتے پر بھی کبھی روتے ہوئے نہیں دیکھا اس پر میری بات کا خاک اثر ہوتا ہے۔ شاید غربت انسان کی حسیات پر اثر انداز ہوتی ہے۔۔۔ ایسے بچوں کا مستقبل کیا ہوتا ہے۔ انہیں زندگی میں کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا، لیکن ان پر کبھی کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ شرارتی بچے بہت ذہین ہوتے ہیں۔ اگر یہ تعلیم حاصل کر رہا ہوتا تو کتنا ذہین ہوتا۔۔۔ کسی دکھ تکلیف کا اثر نہ ہونا یا احساس کا مر جانا بھی تو ایک طرح کی موت ہے، انسانیت کی موت۔ ہمیں معاشرے میں جو سفاکیت اور درندگی نظر آتی ہے، اس کا بڑا سبب شاید یہی ہے۔ یہی معاشرتی ناہمواری درندہ صفت لوگ پیدا کرتی ہے۔ ایسے محروم بچے ہی مجرم بنتے ہوں گے۔

خیالات کے اسی تانے بانے میں نہ جانے کہاں سے مجھے یہ بات سوجھی کہ وہ میری دکان سے بھی کچھ چرا سکتا ہے۔ لیکن وہ زیادہ سے زیادہ کیا چرا سکتا ہے؟ میں تو دن بھر کی آمدنی انگی میں رکھتا ہوں، میرا ہاتھ بے اختیار اپنی انگی کی طرف گیا اور میں خجل سا اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ لیکن وہ میری غیر موجودگی میں کوئی اور چیز بھی تو اٹھا سکتا ہے۔۔۔۔ میں کچھ زیادہ ہی سوچنے لگ گیا تھا۔ میں نے سوچوں کے اسی تسلسل میں دکان پر کام کرنے والے لڑکے کو آواز دی، جب وہ متوجہ ہوا تو میں نے کچھ سوچتے ہوئے اسے پانی لانے کا کہا اور اگلے لمحے علی سر جھکائے میرے سامنے کھڑا تھا۔

میں نے بات ہی بدل دی۔

''علی اگر روزے لیٹ ہو گئے تو کیا ہو گا؟''

علی بجائے پریشان ہونے کے کھل اٹھا، جیسے کہہ رہا ہو میں اب اتنا بھی بچہ نہیں۔ وہ میرے مذاق سے لطف اٹھاتا تھا۔

شعبان کے شروع ہوتے ہی، یعنی رمضان سے کوئی ایک ماہ قبل حسبِ معمول ایک صبح وہ دکان میں داخل ہوا۔ اس نے انتہائی رازدارانہ انداز سے دائیں بائیں دیکھا اور اچھی طرح سے اطمینان کر لینے کے بعد جیب سے ایک گیند نکالی جس کے اندر جلتی بجھتی روشنیاں گھوم رہی تھیں۔ اس نے وہ گیند میری طرف بڑھائی:

''یہ آپ سنبھال لیں۔ میں یہ گھر لے کر جاؤں گا، اپنے بھائی کے لیے۔''

میرے سوال کرنے سے پہلے ہی وہ پھر گویا ہوا:

''اور آپ کو ایک بات بتاؤں۔ میں اس بار گھر جاؤں گا تو واپس نہیں آؤں گا۔ اماں تو پچھلے سال بھی آنے نہیں دے رہی تھی۔ اماں بہت بیمار تھی، وہ کہتی تھی واپس نہ جاؤ، یہاں رہو، سکول جایا کرو۔ لیکن ابا نے کہا کہ ہم پر کافی قرضہ ہے۔ ایک سال میں قرضہ اتر جائے گا تو پھر اسے واپس نہیں بھیجوں گا، اسے سکول داخل کرا دوں گا۔''

اب اشیا لانا اس کا معمول بن گیا۔ وہ ایک بڑا سا تھیلا لے آیا تھا جس میں لائی ہوئی سب چیزیں جمع کر رہا تھا۔ اسے روز ہی نہ جانے کہاں سے کوئی نئی چیز مل جاتی تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس کا تھیلا حجم میں بڑا ہو رہا تھا۔ کہیں سے کرکٹ کی سفید گیند ملی تو کہیں منہ سے بجانے والا باجا۔ ان کے علاوہ پین، رنگوں والی پنسلیں، کلائی پر چڑھانے والی گھڑی، پتنگ اڑانے والی ڈور کا گچھا، کانچ کی گولیاں اور اسی طرح مختلف چھوٹی چھوٹی چیزوں سے اس کا تھیلا بھرنے لگا۔ اس کے علاوہ عام گیندیں، چائنہ کی روشن گیندیں، کھلونے اور کئی بے کار چیزیں بھی علی کے تھیلے میں جمع ہوتی رہیں۔ وہ چند دن بعد سب چیزیں نکال کر دیکھتا اور مجھے ایک ایک چیز دکھاتا۔ یہ کام وہ اکثر شام کے وقت کرتا۔ ساتھ ساتھ بتاتا جاتا کہ یہ گیند اس نے اپنے چھوٹے بھائی کے لیے لی ہے، پنسلیں بہن کے لیے اور یہ گڈی ظہیر کے لیے۔ اور توقف کے بعد بغیر پوچھے بتاتا کہ ظہیر اس کا چچیرا بھائی ہے جو اسے شہر لایا تھا۔

اب اسے صرف رمضان کا انتظار تھا کیوں کہ رمضان میں اس نے گھر جانا تھا۔ رمضان میں چائے کا یہ ٹھیہ مہینہ بھر کے لیے بند ہو جاتا تھا۔

کسی دن ایسا ہوتا کہ وہ کوئی چیز لانے کی بجائے دس بیس روپے لاتا اور کہتا یہ بھی وہیں جمع کر لیں۔

میرے پوچھنے پر کہ کیا یہ ٹپ کے پیسے ہیں اس نے کہا ''ہاں جی'' اور اس سے پہلے کہ میں کچھ اور پوچھتا، فوراً بول پڑا، جیسے بات بدلنا چاہتا ہو۔

''میری تنخواہ کے پیسے ہوٹل والا ہر مہینے ابا کو بھیج دیتا ہے'' اس نے بات جاری رکھی۔

''آپ کو پتہ ہے گھل والے کا بیٹا پیدا ہوا ہے۔ کل وہ مٹھائی لایا تھا۔ اس نے مجھے مارکیٹ میں بانٹنے کا کہا۔ میں نے سب کو دی، آپ کو بھی دی تھی نا؟ میں نے تھوڑی سی بچائی تھی۔ وہ استاد نے دیکھ لی اور مجھے ڈانٹا اور کہنے لگا زیادہ مٹھائی کھانے سے بندہ بیمار پڑ جاتا ہے اور وہ مٹھائی اپنے گھر لے گیا۔''

اس کے چہرے پر مٹھائی چھن جانے کا افسوس نمایاں تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میں بھی تو اسے ہمیشہ اشیائے خورونوش ہی دیتا ہوں۔ جب وہ گھر جائے گا تو اسے کپڑے دوں گا۔ رمضان میں زکواۃ بھی تو نکالنی ہے۔ میں نے زکواۃ میں سے کچھ رقم علی کو دینے کا فیصلہ کیا اور اب تک دی گئی زکواۃ کا حساب کتاب کرنے میں گم تھا کہ علی نے جیب سے کچھ پیسے نکال کر چپکے سے میری طرف بڑھائے اور میں نے جب وہ لفافے میں ڈالے تو گیند روشن ہو گئی۔ علی کے تھیلے میں کوئی بھی چیز ڈالی جاتی تو وہ گیند اس حرکت سے خود بخود جگمگانے لگتی۔ جوں جوں رمضان کا مہینہ قریب آ رہا تھا، علی کا چہرہ بھی ان روشنیوں کی طرح جگمگانے لگا تھا۔ وہ خوشی سے ہواؤں میں اڑتا پھرتا تھا۔ اس پہ مار پیٹ کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا لیکن خوشی میں کس طرح سرشار پھر رہا تھا۔ شام کے وقت گھروں کو لوٹتے پرندے انسانی دماغ یا احساس نہ رکھتے ہوئے بھی کتنے خوش ہوتے ہیں۔ دیہات میں سارا دن جنگلوں میں چرنے والے ڈھور ڈنگر شام ڈھلے خود بخود واپسی کے رستوں پر چل پڑتے ہیں۔ ان میں کئی تو کان لٹکائے خاموشی سے جگالی کرتے ہوئے چل رہے ہوتے ہیں لیکن نسبتاً نو عمر بچھڑے وغیرہ اچھل کود رہے ہوتے ہیں۔ شاید بڑوں کے اندر یہ احساس پختہ ہو چکا ہوتا ہے کہ ان کی منزل وہی جگہ، وہی کھرلی اور وہی غذا ہے یعنی وہی معمول کی زندگی ہے اور کم عمروں کو ان باتوں کی سمجھ نہیں ہوتی۔۔۔

''بس اب تین دن رہ گئے رمضان آنے میں'' میں نے علی کے لفافے میں اپنا وزٹنگ کارڈ ڈالتے ہوئے کہا:

''جب کوئی ضرورت پیش آئے مجھے فون کر لینا۔''

میں نے اسے کچھ تحائف دیے۔ اس کی ماں کے لیے کپڑوں کا ایک جوڑا اور کچھ رقم اور اسے اچھی طرح سمجھایا کہ یہ جا کر اپنی ماں کے ہاتھ میں دینا۔ علی نے میری بات سنی ان سنی کرتے ہوئے تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''مجھے وہ تصویر چاہیے'' وہ دیوار پر لگے فریم کی طرف اشارہ کر رہا تھا:

”ہاں کیوں نہیں، وہ بھی دوں گا۔“

علی بہت خوش تھا۔ وہ بازار میں ادھر ادھر بھاگ رہا تھا۔ آج اس کی رفتار بھی تیز تھی اور چہرے پر رونق بھی لوٹ رہی تھی۔ وہ چائے کی ٹرے کو اسٹیرنگ کی طرح گھماتے ہوئے بہت تیز بھاگ رہا تھا۔ میں نے علی کے لیے خانہ کعبہ اور روضہ رسول کی تصویر والی پینٹنگ خریدی۔ علی نے بتایا کہ یہ تصویر اس کی ماں کو بہت پسند ہے، ”ہمارے گھر میں ایسی ایک تصویر ہے لیکن وہ بہت پرانی ہو گئی ہے۔“

رمضان شروع ہو گیا اور وہ خوشی خوشی گھر چلا گیا۔ رمضان گزر گیا۔ عید کے بعد کچھ دنوں تک دکان بند رہی۔ کپڑوں کے کاروبار میں عید کے بعد کچھ دن مندا ہی رہتا ہے۔ لوگ عید بقرعید پر ہی کپڑے خریدتے تھے یا شادی بیاہ کے دنوں میں دوبارہ کاروبار زور پکڑتا تھا۔ میں نے دکان پر کام کرنے والے لڑکوں کو بھی ہفتہ بھر کی چھٹی دے دی تھی۔

جب عید کے بعد پہلی بار دکان کھولی تو تھوڑی دیر بعد وہ حسبِ معمول پلاسٹک کی سبز ٹرے میں چائے کی چینک اور پیالیاں دھرے دکان میں داخل ہوا، میں نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا:

”ارے تم واپس آ گئے“

علی کچھ نہ بولا، وہ گم صم مجھے دیکھے جا رہا تھا:

”تم تو کہہ رہے تھے واپس نہیں آؤں گا تو پھر کیا ہوا؟“

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں حیرت میں مبتلا اسے دیکھے جا رہا تھا: وہ جو ایک پل میں ڈانٹ ڈپٹ بلکہ مار پیٹ تک بھول جاتا تھا، وہ رو رہا تھا۔

”کیا ہوا، خیر تو ہے نا، واپس کیوں آ گئے؟“

اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسائی ہوئی تھیں، جنہیں تھوڑی دیر بعد الگ کرتا اور قمیض کی آستین سے آنسو پونچھتا۔ میں یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک ماہ میں اس کا بچپن رخصت ہو گیا ہے یا حقیقی بچپن لوٹ آیا ہے۔ وہ بمشکل کہہ پایا۔

”روزے آنے میں کتنے مہینے باقی ہیں؟“

☆☆☆☆

عثمان عالم

اپنے جسم کا خدا

اُسے پہلی بار احساس ہوا کہ خوف اُس کے اندر نہیں بلکہ یہ خارج میں کہیں موجود ہے۔

وہ غیر مانوسیت اور اجنبیت کے خوف سے تو پہلے ہی آگاہ تھا۔ آج اس پر عقدہ کھلا کہ دماغ میں اشیا کے موجود امیجز اگر اپنے اصل سے بڑھ جائیں تو خوف کی ایک وجہ یہ بھی بنتے ہیں۔

اُسے پہلی مرتبہ خوف نے اُس وقت آ کر دبوچا جب وہ ٹیرس میں رکھی آرام کرسی پر بیٹھا کسی گہری سوچ میں تھا کہ اُسی اثنا میں ایک ہوائی جہاز اُڑان بھرتا اُس کے سر پر آ پہنچا۔ جہاز کی اُڑان اتنے نیچے تھی کہ جہاز کا پیٹ گھر کی چھت کو چھوتے محسوس ہوا۔ وہ لمحہ بہت اہم تھا جیسے وقت رک سا گیا ہو اور جہاز کا نچلا حصہ اُس کے وجود پر آ پڑا ہو۔ جہاز کے نیچے اُسے اپنا وجود بے وقعت اور بے بس محسوس ہوا۔

دوسری بار خوف ریڑھ کے اختتام میں جا ٹھہرا، اُس رات کے ایک پہر، پیدل چلتے ہوئے ویران سڑک پر اُسے یوں محسوس ہوا کہ یہ سڑک زمین پر موجود نہیں ہے۔ اگر زمین پر نہیں ہے تو پھر کہاں ہے؟ اس کہاں کے لیے اُس نے سر اوپر اُٹھا کر دیکھا تو زمین آسمان پر ایک چمکتا سیارہ دکھائی دی۔ یہ کیا؟ اسی لمحے اس پر انکشاف ہوا کہ یہ خوف نہیں ہے بلکہ یہ وحشت ہے جو اس کے پورے جسم پر تھور کے کانٹوں کی طرح اُگ آئی تھی۔

اُس سے اگلے دن کا واقعہ ہے۔ جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ پودوں کی نرسری سے اِن ڈور پودے لے کر آیا۔ ایک پودا اس کی بیوی کو خاصا پسند آیا۔ عجیب پودا تھا جسے زمین یا مٹی کی ضرورت نہیں تھی۔ اُس نے اپنی مطابقت پانی کے ساتھ پیدا کر لی تھی ور جن کے قریب وہ ڈیڑھ فٹ اونچی مضبوط ٹہنی نما قلمیں تھیں جن کے ایک سر پر جڑیں اور دوسرے پر گہرے اور ہلکے سبز پتے تھے۔

وہ جب رات کے دوسرے پہر پانی پینے کے لیے اُٹھا تو ڈائننگ ٹیبل پر رکھا یہ پودا، درخت بن چکا تھا جو نہایت تیزی سے پورے گھر میں پھیل رہا تھا۔

اُس کے دماغ میں لگا خوف کا اسکیل اپنے آخری نقطے پر پہنچا اتنے میں یہ پودا نما درخت کمرے اور کچن کی مشرقی دیوار کو گراتے ہوئے باہر کی جانب نکل گیا۔ اُس کی نظر اسی پودے نما درخت کے اوپر والی ٹہنی

پر پڑی جس پر اُس کا اپنا وجود کسی بوزنے کی طرح جھول رہا تھا۔

اب خوف اُس کے لیے مستقل پریشانی کا باعث بننے لگا ایک دن وہ اپنے شہر کی ایک معروف مائنڈ سائنس ایکسپرٹ کے پاس گیا۔ ایکسپرٹ نے میڈی ٹیشن کا طریقہ اُس پر آزمایا۔ جب وہ میڈی ٹیشن کے عمل سے باہر آیا تو اُس نے ایکسپرٹ کو بتایا کہ اُس کے اس عمل کے دوران اُس نے ایک خواب دیکھا لیکن خواب سے پہلے اُس کی ریڑھ کی ہڈی میں مسلسل ایک برقی رو چلتی رہی پھر اس برقی رو نے ہلکے نیلے رنگ کا لبادہ اُوڑھ لیا جس میں کبھی کبھی آگ جیسی چنگھاڑی بھی پیدا ہو جاتی کبھی دماغ والی طرف کو جاتی اور کبھی ریڑھ کی اختتامی طرف کو۔ آخر میں جب ریڑھ کی اختتامی طرف کو پہنچی تو ریڑھ کی ہڈی اپنے اختتام پر ایک پھول کی شکل میں تبدیل ہونا شروع ہو گئی جس کی پانچ پتیاں گہرے نیلے رنگ کی تھی اور بنیاد پر ہلکے سرخ رنگ کی۔ اُسے لگا جیسے یہ کنول کا پھول ہو۔ کنول کا پھول؟

اس نے اتنا کہہ کر ایکسپرٹ کو دیکھا جو اُس کی بات کو پوری یکسوئی کے ساتھ سن رہی تھی۔

اِسی لمحے اُسے لگا کہ یہ پھول تو ایکسپرٹ سے ملتا جلتا تھا۔۔۔۔شاید نہیں۔۔۔اُس کی خوبصورتی یا شاید اُس کا نیلا رنگ جو ایکسپرٹ کی شرٹ سے ملتا جلتا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ ایکسپرٹ کی تحیشن کے دوران اُسے ایک مخصوص خوشبو بھی آ رہی تھی تو کیا وہ اُس کے باطن کی خوشبو تھی؟ یا ایکسپرٹ کی؟

وہ اُس خواب کی طرف آیا جو اُس کے دماغ کی سکرین پر تحیشن کے دوران نمودار ہوا تھا عجیب خواب تھا۔ کم از کم رات کو دیکھے جانے والے خوابوں سے تو مختلف تھا یا شاید انھیں جیسا تھا؟ پتا نہیں۔

شاید اُس نے ایک ہی لمحے میں وہ خواب دیکھا تھا۔ خواب کیا تھا بس ایک گیارہ سال کا بچہ تھا جس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور سر پر نماز والی ٹوپی۔۔۔ایک مسجد تھی شاید، شاید نہیں، وہ کسی خانقاہ کا منظر تھا۔۔۔شاید۔۔۔یہ خواب بھی بہت عجیب ہوتے ہیں۔ اپنے ساتھ ابہام کے کبوتر لے آتے ہیں۔ یاد آیا کبوتر بھی تھے ایک بڑا سا صحن تھا جس کے ایک طرف پانی کا حوض تھا جیسے یہ حوض وضو کے لیے مخصوص کیا گیا ہو اس حوض کے پیچھے قطار میں کمرے تھے۔

اُس کو اتنا ہی یاد تھا شاید خواب بھی اتنا ہی تھا اُسے لگا کہ یہ خواب نہیں بس ایک فلیش تھی جس کے اندر اُس نے یہ دیکھ لیا۔

وہ جب خاموش ہوا تو ایکسپرٹ نے اُس سے کچھ نجی سوالات پوچھے جن کے اُس نے اپنے طور پر تسلی بخش جوابات دیے۔

نیکسٹ اپائنٹمنٹ لے کر وہ واپس لوٹ آیا۔

اس تحفظ سے اُس کے اندر چیزوں کا خوف کم ہو جائے گا؟

اُس کا ذہن مسلسل سوچ رہا تھا اتنا مسلسل کہ سوچ باقاعدہ ایک شبیہ کی شکل میں اُس پر حاوی ہونا شروع ہو گئی اتنی حاوی کہ اُس کے نیچے اُس کا اپنا وجود ایک چیونٹی کی مانند ہو گیا۔

اُس کو احساسات یا محسوسات کا مسئلہ نہیں تھا وہ اجسام کے ادراک اور عدم ادراک کے درمیان اُلجھ کے رہ گیا تھا اُس کے دماغ نے شاید اپنا کام کرنا چھوڑ دیا تھا بس ذہن ہی دماغ کا کام کر رہا تھا۔۔۔ شاید۔۔۔ کیا ذہن دماغ کا کام کر سکتا ہے؟

وہ بستر پر آ کر لیٹ گیا گہرے گہرے سانس کھینچنے لگا اتنا گہرا سانس کہ اُسے باقاعدہ محسوس ہوا کہ اُس کے دونوں پھیپھڑے ہوا سے بھر گئے ہیں اور ناف سے نیچے کا حصہ قدرے پھول گیا ہے یا شاید کہنا چاہیے کہ باہر کو نکل آیا۔

وہ یہ عمل کچھ وقت تک مسلسل دہراتا رہا۔

دماغ پر جمی گرد کم ہونا شروع ہوئی تو کچھ دیر تک اُس کو اچھا محسوس ہونے لگا اُس کے بعد پھر اُس کا دماغ خالی ہو گیا اتنا خالی کہ خلا بن گیا۔

وہ سو جانا چاہتا تھا۔۔۔ مگر نیند نجانے کہاں تھی؟

اس نے لیٹے لیٹے ریموٹ سے ایل ای ڈی آن کی سیکنڈ یا سیکنڈ سے کم یا پھر سیکنڈ سے زیادہ۔ سکرین نیلے رنگ سے پُر ہو گی شاید پُر لفظ ٹھیک نہیں کیوں کہ جگہ خالی ہوتی تو پُر ہوتی خالی نہیں تو پھر پُر کیسی؟

خیر!

سکرین پر ایک اسلامی چینل ظاہر ہوا اُس کی انگلیاں اگلے چینل کی طرف حرکت میں تھیں کہ ایک دم رک گئیں ایک مولانا کسی کے سوال کا جواب دے رہے تھے کہ اگر استنجے کے لیے گھر میں پانی دستیاب نہ ہو تو پاک مٹی کو استعمال کیا جائے۔

کیا ٹشو پیپر حرام ہے یا مکروہ؟ اُس نے اپنی تئیں سوچا۔

اُس کا خوبصورت ٹائلوں والا واش روم پانی کی عدم دستیابی کی وجہ سے پاک مٹی سے بھرنے لگا مٹی ہی مٹی پاک مٹی کہ اُس کا اپنا وجود اُس مٹی کے نیچے دبتا چلا گیا۔

اُس کے بدن پر ایک لرزہ طاری ہوا۔۔۔ یہ کیا سوچ رہا ہے میرا ذہن۔

اُس نے چینل تبدیل کیا تو نیوز چینل کسی بچی کے ریپ کی خبر آن ایئر کر رہا تھا اسے دلچسپی پیدا ہوئی یہ کہاں کا واقعہ ہے وہ بیڈ سے اُٹھ کر بیٹھ گیا ریپ!

کتنا پر لطف لقظا ہے!

یمم۔

یہ کیا۔۔۔ ریپ پھر مار دیا گیا۔ یہ کیا کتنے وحشی لوگ ہیں بدن پر اگلے ہی لمحے ایک جھرجھری طاری ہوگئی۔

اُس نے جلدی سے چینل تبدیل کیا ایک دو تبدیلیوں کے بعد اینمل پلینٹ پر اُس کی انگلی رُکی۔ بن مانس بہت سے تھے۔

کیمرا ایک جگہ ایک جوڑے کو فوکس کرتا ہے جو جنسی اختلاط میں مبتلا ہوتا ہے۔ پھر کیمرا کا رخ تبدیل ہوتا ہے تو اس جوڑے کے آس پاس بہت سے بن مانس آرام سے اپنے اپنے کاموں میں لگے ہیں۔

اُس نے سوچا ہم سے تو یہ جانور ہی اچھے ہیں۔

ایک بڑے بن مانس کی آنکھوں پر کیمرا فوکس ہوتا ہے۔ اُس کی آنکھیں، آنکھیں۔۔۔ یہ آنکھیں تو میں نے کہیں دیکھیں ہیں۔ کہاں؟

اُس نے سکرین کے اس لمحے کو فریز کیا۔

یہ آنکھیں کہاں دیکھیں ہیں؟

اسے یاد آیا دوسرے کمرے میں اُس کے دادا کی ایک تصویر لگی تھی وہ جا کر لے آیا۔ بن مانس اور دادا کی آنکھوں میں کتنی مماثلت ہے۔

پھر وہ شیشے کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اُس کی آنکھیں بھی تو دادا پر ہیں تو کیا میری آنکھیں اور بن مانس کی آنکھیں ایک ہیں۔

کیا میرا وجود اور اُس کا وجود دونوں ایک ہیں؟

کیا جس طرح میں سوچتا ہوں، کیا اُس طرح وہ بھی سوچتا ہے؟

اُسے محسوس ہوا کہ فریز کیا ہوا لمحہ سکرین سے باہر نکل رہا ہے۔ پورے کمرے میں آنکھیں ہی آنکھیں پھیل گئیں تھیں۔ وہ خوف میں مبتلا ہونا شروع ہوا اور بن مانس کی آنکھیں بند کر کے سوگیا، سوگیا کیوں کہ نیند اُس پر طاری ہوگئی۔

☆☆

وہ آرام کرسی پر قدرے جسم کو ڈھیلا چھوڑے بیٹھا تھا۔

میرے اندر خوف نے کسی مکڑی کی طرح جال بُن رکھا تھا جس سے میں باہر نہیں نکل پا رہا تھا۔

کچھ ایسا ہو کہ میں اس خوف، اس اذیت سے باہر نکل آؤں۔

ایکسپرٹ اُس کے سامنے ایک اسٹول پر بیٹھی تھی۔

خوف تجریدی شکل میں ہے یا ٹھوس حالت میں ہے؟

اُس نے سوال کیا۔

وہ ایک لمحہ سوچتا رہا کہ اُس کے اندر کا خوف جس نے مکڑی کا جال بنا رکھا ہے وہ ٹھوس ہے یا تجرید!

نہیں نہیں یہ تجرید نہیں۔ اگر یہ تجریدی شکل میں ہوتا ہے تو مجھے یہ مسائل نہیں ہوتے یہ ٹھوس شکل میں ہے جیسے میرے جسم میں دل، دماغ، جگر، آنتیں، معدہ، پھیپھڑے۔ ویسے ہی یہ بھی کسی جگہ موجود ہے۔

اب یہ نہیں رہے گا۔ ایکسپرٹ نے اطمینان سے کہا۔

آج کا سیشن بہت اہم ہے، امید ہے اس سیشن سے آپ بہتری محسوس کریں گے۔

اُس نے سیشن شروع کیا۔

اور نجانے کب ختم ہو گیا، اُسے کچھ خبر نہ ہوئی۔

وہ جب رستے میں تھا تو اُسے کچھ کچھ یاد آیا کہ سیشن کے دوران اُس کا ذہن مکمل طور پر ایکسپرٹ کے تابع تھا۔

اُس نے پھر اپنے بازوؤں کو دیکھا، وہ ساتھ تھے، پھر ٹانگوں کو دیکھا وہ بھی ساتھ تھیں، منہ، گردن، سر دھڑ، ہر چیز تو اُس کے ساتھ تھی۔ وہ مکمل تھا۔

اُسے یاد آیا کہ سیشن کے دوران ایکسپرٹ نے اُس کے جسم کا ایک ایک حصہ الگ کیا تھا، کیا؟

الگ، بالکل الگ۔۔۔۔

جیسے آپریشن تھیٹر میں سرجن دل نکال کے جسم سے باہر رکھ دیتا ہے ویسے ہی اُس کی ایکسپرٹ نے اُس کے جسم کا ایک ایک حصہ اُس سے الگ کر دیا تھا۔

یعنی میں اجزا میں تقسیم ہو گیا تھا؟

پھر

اُس کی یادداشت ریفریش ہو چکی تھی۔

شاید اس واقعے کے کچھ حصے ابھی بھی اُس کی یادداشت میں باقی تھے۔

اگر میرا سارا جسم حصوں میں ایسا تقسیم ہو گیا تھا جیسے قربانی کے جانور کے حصے بخرے کیے جاتے ہیں تو پھر مجھے جوڑ کے مکمل کیسے کیا گیا؟

اور وہ خوف کہاں گیا؟

وہ تو ایک ناسور کی مانند تھا۔۔۔ مجھے یاد آ رہا ہے ہاں ہاں مجھے یاد آ رہا ہے اُس نے مجھے دکھایا تھا کہ یہ خوف تمھارے اندر تھا۔

یہ تو واقعی ناسور بن چکا تھا پورے جسم میں پھیل رہا تھا۔ شکر ہے اُس نے نکال باہر کیا۔

پھر میرے حصوں کو کس نے جوڑا؟

کیا میں نے خود ہی ایک ایک کر کے اپنے جسم کے حصوں کو جوڑا؟

ہاں، ہاں۔۔۔ یاد آ گیا۔

اُسی نے کہا تھا کہ اب تم اپنے جسم کو دوبارہ سے جوڑ کے مکمل کرو گے خود زندہ ہونا ہے۔

اووووو۔۔۔ مگر میں تو انسان ہوں خدا نہیں!

تم اپنے جسم کے خدا ہو۔

اور خدا کی صفت ہے مردے کو زندہ کرنا۔

تو کیا میں اپنے جسم کا خدا بنا؟

شاید ہاں۔ یقیناً ہاں۔

کیوں کہ میں زندہ ہوں، خوف کے ناسور سے باہر۔

☆ ☆ ☆ ☆

شیخ فاروق احمد

دوسرا دودھ

سہیل اور امبرین تیار ہو کر ناشتے کی میز کی طرف بڑھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ شادی کا تیسرا ہی دن ہوا تھا۔ دونوں کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے محبتوں کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔

”سہیل بیٹا چھوٹے بڑوں کے کچھ آداب ہوتے ہیں“ سہیل کی والدہ نسرین بیگم کو ان کا یہ انداز ایک آنکھ نہ بھایا۔ صفدر علی بھی حیران ہو گئے۔ ان کے الفاظ ان کے۔

دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ساتھ ساتھ میز پر بیٹھنے کے باوجود دونوں نے برائے نام ناشتہ کیا۔ جس کو صفدر علی نے بری طرح سے محسوس کیا۔ چند منٹوں کے بعد دونوں اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیے۔ نسرین نے کوئی توجہ نہ دی۔

امبرین نے میکے سے آئے کپڑوں میں سے انتخاب کیا اور سہیل نے بھی۔ انھوں نے آج ایک دعوت میں جانا تھا۔ اور جب وہ تیار ہو کر اجازت لینے آئے تو نسرین کے چہرے سے تھوڑی بہت ناگواری ہویدا تھی۔

”دعوتیں کم ہی رکھو۔ روزانہ بن ٹھن کے نکلنا کچھ مناسب نہیں“ نسرین کے دل کی کدورت لہجے سے ٹپک رہی تھی۔

”بیگم کچھ خیال کرو۔ جو منہ میں آتا ہے کہہ دیتی ہو۔“

صفدر علی کی تنبیہ کے باوجود نسرین بیگم کے تیور میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ دونوں بجھے دلوں کے ساتھ باہر چل دیے۔

”بہت ہو چکا اب تمھاری شادی کو ہفتہ عشرہ گزر چکا، کچن سنبھالو۔“ صبح ناشتے کی میز پر تحکمانہ لہجے میں نسرین بیگم کے احکامات تھے۔ انتہائی ناگواری کے ساتھ نفرت بھی شامل تھی۔ خبر نہیں، اپنی پسند کی بہو لانے کے باوجود اور کوئی بھی کسی طرح کی شکایت نہ ہونے کے باوجود ان کا دن بدن تلخ سے تلخ رویہ گھر کے ماحول کو کشیدہ کر رہا تھا۔ صفدر علی نے کئی بار مداخلت کی لیکن نسرین بیگم نے تو جیسے قسم کھائی تھی کہ کسی کی بات نہیں سننی۔

''امی مجھے خبر نہیں آپ کا رویہ اتنا سخت اور کرخت کیوں ہے۔''

سہیل نے ڈرائینگ روم میں امبرین کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھایا۔

''تم خاموش رہو۔ میں جو کر رہی ہوں گھر کی بہتری کے لیے کر رہی ہوں'' وہی لہجہ۔

کتنے دنوں تک ناگوار فضا چھائی رہی۔ امبرین اور سہیل تو ہر طرح اپنی کوششوں کے باوجود ماحول کو خوشگوار نہ بنا سکے۔

''آج دونوں ناشتے پر نہیں۔'' نسرین بیگم کی تشویش اور غصے سے بھری آواز گونجی۔

''دونوں گھر سے جا چکے ہیں'' ناشتہ کرتے ہوئے صفدر علی نے مختصر جواب دیا۔

''میں سہیل کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ اس کی یہ جرات آپ کی وجہ سے ہوتی رہی ہے۔'' سخت تلخ لہجہ۔

''یہی سمجھو'' پھر مختصر جواب۔ نسرین بیگم جل کر رہ گئیں۔

''میں کبھی سہیل کو دودھ نہیں بخشوں گی۔'' انتہائی بے بسی بھی غصہ بھی۔

''جب ماں کا دودھ چھوٹ جائے تو اُسے بخشوانے کی فکر کسے ہوتی ہے۔'' زیر لب صفدر علی مسکرائے اور تصور میں امبرین کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے سہیل میں اپنے آپ کو دیکھا اور اپنی ماں کو بھی جو انتظار کرتے کرتے ایک روز بچھڑ گئی تھی۔

☆☆☆☆

محمد جمیل اختر

خواب میں لکھی گئی گُمشدہ کہانی

ہاں میں کہہ رہا تھا کہ کہانی گُم ہو گئی ہے ابھی مکمل نہیں لکھی تھی لیکن مجھے یاد پڑتا ہے کہ کہانی کا کافی حصہ میں لکھ چکا تھا اب سوچتا ہوں تو یاد نہیں آ رہا کہ کہاں رکھ کر بھول گیا ہوں لیکن میں اگر پُرسکون ہو کر کچھ دیر سوچوں تو شاید مجھے یاد آ جائے کہ کہاں رکھ کر گم کر دی، وہ کہانی شاید کسی انقلابی نوجوان کا قصہ تھا جو بعد میں محبت میں گرفتار ہو گیا تھا، ہاں ہاں مجھے کچھ کچھ یاد آ رہا ہے کچھ ایسا ہی تھا تو کیا وہ نوجوان کامیاب ہو گیا تھا؟

معلوم نہیں، مجھے اپنے سرہانے کے نیچے دیکھنا ہو گا میں عموماً کہانیاں اپنے سرہانے کے نیچے رکھ دیتا ہوں، یہ دیکھو کچھ صفحات پڑے ہیں لیکن یہ تو کچھ مضامین ہیں جن کے عنوان کچھ یوں ہیں کہ ''کیپٹلیزم کی برائیاں''، ''غریب مزدوروں کے حقوق''، ''انقلاب'' ہاں، ہاں یہ سارے مضامین اُسی نوجوان کی کہانی کے سلسلے میں لکھے اور پڑھے تھے لیکن وہ کہانی کہاں ہے؟

''صاب جی کچھ مدد کر دیں، صبح سے بھوکی ہوں'' ایک فقیرنی گلی کی طرف کھلتی ہوئی کھڑکی سے جھانک کر کہتی ہے۔

''معاف کرنا۔''

''صاب جی قسم سے بہت بھوک لگی ہے۔''

''معاف کرنا میں کسی الجھن کا شکار ہوں میرا کچھ سامان گم ہو گیا ہے وہ ڈھونڈنا ہے تم پھر کسی وقت آ جانا۔''

''صاب بھوک ابھی لگی ہے۔''

''یہ لو دس روپے اور باہر سے کھانا کھا لو۔'' میں کھڑکی کی سلاخوں سے دس روپے کا نوٹ اُسے دیتا ہوں۔

نوٹ تلاش کرتے ہوئے کوٹ کی اندرونی جیب سے چند کاغذ بھی میرے ہاتھ میں آ جاتے ہیں، اوہ یہ کیا! یہ کاغذ تو اُسی کہانی ہی کا حصہ ہیں۔ اِن پر بھی اُسی انقلابی نوجوان کی باتیں لکھی ہوئی ہیں، کہانی گم ہو جائے تو اُسے جوڑنا کتنا مشکل کام ہے اب یہ چند کاغذوں پر لکھے پیراگراف کو میں ایک ترتیب میں یہاں لکھ

دیتا ہوں، ہوسکتا ہے کہانی کا کوئی سرا مل جائے۔۔۔

’’گھپ اندھیری رات تھی ، سڑک کنارے گاڑی گزر رہی تھی اور دور چاردیواری کے اندر ایک بلب جل رہا تھا یہ گرمیوں کے دن تھے اور اُس صحرائی علاقے میں لوگ اُن گرم راتوں میں صحن میں چارپائیاں بچھا کر سوتے تھے ۔ سارا دن جو ریت وہ صحرا میں دیکھتے تھے یوں لگتا تھا وہ سارے ذرے رات کو آسمان پر چمکنے لگے ہیں دن میں جن ذروں پر پاؤں رکھنا ممکن نہیں ہوتا تھا رات کو وہ آسمان پر چمک چمک کر اپنی روشنی سے دلوں کو ٹھنڈک پہنچاتے تھے ۔‘‘

’’سڑک کنارے گاڑی گزر رہی تھی اور چاردیواری کے اندر بلب کے نیچے ایک نوجوان نے باپ کے پاؤں پکڑ رکھے تھے ۔‘‘

’’ابا مجھے شہر جانے دو، میں وکیل بن کر آؤں گا اور وڈیرے کے خلاف مقدمہ لڑوں گا، اُس نے ہم پر ظلم کیا ہے۔‘‘

’’ان کے خلاف کون لڑ پایا ہے میرے بچے، ہم کمزور کمی کمین ہیں ہم اِن کے خلاف نہیں لڑ سکتے تو نے میٹرک کر لی ہے یہ بھی تیری ضد تھی ، وڈیرے سائیں نے بہت منع کیا تھا کہ تمھیں نہ پڑھاؤں پر میں نے کہا بچہ ہے ضد کرتا ہے اب میں تمھیں شہر کیسے بھیجوں میرے پاس کہاں سے رقم آئے گی؟‘‘

’’ابا مجھے شہر جانے دے، میں مزدوری کرلوں گا پر مجھے ایک بار شہر جانے دے۔‘‘

پتا نہیں آگے کیا ہوتا ہے کافی پیراگراف یہاں نہیں ہیں کیوں کہ اب ایک پیراگراف میں لکھا ہے کہ وہ لڑکا شہر کے کسی سرکاری کالج میں پڑھنے لگ جاتا ہے اور کالج کی سیاسی تنظیم کا رُکن بن جاتا ہے جگہ جگہ انقلابی تقریریں کرتا دکھائی دیتا ہے۔

اب اس سے آگے کیا ہوتا ہے؟

آہ! مجھ سے اُس انقلابی نوجوان کی کہانی گم ہوگئی ہے افسوس اب سونا چاہیے کہ کہانی تو گم ہوگئی ہے اور مجھے نیند آرہی ہے اور میں سوجاتا ہوں۔۔۔۔

دروازے پر بے تحاشا دستک ہوتی ہے۔

اِس وقت بھلا کون آسکتا ہے؟

کہیں کوئی چور ڈاکو تو نہیں آگئے؟

لیکن چور ڈاکو دستک دے کر تھوڑی آتے ہیں۔

’’کون ہے؟‘‘

''میں ہوں۔''

''کون میں؟''

''میں وہ نوجوان جس کی کہانی تم لکھ رہے ہو۔''

''کون؟ میں سمجھا نہیں۔''

''میں وہ انقلابی نوجوان جس کی کہانی تم سے گم ہو گئی ہے۔''

''تم؟''

''تم یہاں کیسے؟''

''سوال کم کرو اور دروازہ کھولو، میرے پیچھے پولیس لگی ہے۔''

''پولیس؟''

''پولیس کیوں؟''

''میں بتا دوں گا لیکن تم دروازہ تو کھولو۔''

''نہیں پہلے بتاؤ۔''

''وہ مجھے پکڑ لیں گے، دیکھو دروازہ کھولو۔''

''نہیں میں دروازہ نہیں کھولتا، تمھارے پاس پستول بھی ہو گی۔''

''میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں، اب کھولو۔''

''لیکن پولیس نے میرے گھر کی تلاشی لی تو میں پکڑا جاؤں گا۔''

''تم کتنا ڈرتے ہو۔''

''ہاں ڈرتا ہوں۔''

''ڈرپوک آدمی پھر انقلابی لوگوں کی کہانیاں کیوں لکھتے ہو؟ نکالو مجھے اُس کہانی سے، میں نہیں آتا تمھاری کہانی میں۔''

''وہ کہانی ویسے بھی مجھ سے گُم گئی ہے۔''

''دروازہ کھولو، وہ مجھے پکڑ لیں گے اور میں شاید پھر تمھیں کبھی نہ ملوں آج کل ہر انقلاب پسند گم ہو جاتا ہے اُسے پہاڑوں کے پیچھے بہتے دریا میں پھینک دیا جاتا ہے وہ مجھے بھی پھینک دیں گے تم دروازہ کھولو۔''

''نہیں، نہیں میں نہیں کھول سکتا پولیس مجھے بھی پکڑ لے گی۔''

''آہ! تم کتنے ڈرپوک ہو، بہت دکھ کی بات ہے کہ یہاں زیادہ تر لوگ تمھاری طرح ڈرپوک ہیں،

مجھے افسوس ہے اور وہ دیکھو پولیس اس گلی میں پہنچ گئی ہے انسپکٹر صاحب ادھر دیکھیے میں یہاں ہوں مجھے گرفتار کرلیں۔"

"صاب جی، سنتے ہیں، دس روپے والی روٹی بارہ کی ہوگئی ہے مجھے دو روپے اور دیں۔"

"صاب جی۔"

"صاب جی آپ سو رہے ہیں؟"

"کون ہے؟ کون ہے؟" میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

"تم کون ہو؟"

"جی میں فقیرنی، جس کو آپ نے دس روپے دیے تھے۔"

"وہ پولیس کدھر ہے؟"

"کونسی پولیس صاب؟"

"وہ جو ایک لڑکے کو پکڑ کر لے جا رہی تھی۔"

"وہ تو جی پچھلی گلی میں کسی کو پکڑ کر لے جا رہے تھے۔"

"روکو انھیں۔"

"صاب پیسے دے دیں روٹی لینی ہے۔"

"یہ لو تم دس روپے اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

"ٹھہرو وہ کس طرف کو جا رہے تھے؟"

"وہ جی تین نمبر گلی میں تھے۔"

میں بھاگتا ہوا وہاں پہنچتا ہوں وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔

کہانی اور کردار دونوں کہیں گم ہو گئے ہیں----

☆☆☆☆

ابن آس محمد

نئے اِنسان کی لَو اِسٹوری

دسمبر کی سرد رات تھی۔

میں کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا ...... مسلسل ٹائپنگ میں مصروف تھا۔

یکے بعد دیگرے ...... دھڑا دھڑ اپنی پوسٹیں اَپ لوڈ کر رہا تھا۔ ایک پوسٹ لگاتے ہی دوسری ٹائپ کرنے لگتا ...... ایک کے بعد ایک ...... لگا تار ...... میری انگلیاں رُک ہی نہیں سکتی تھیں اور نظریں مسلسل کمپیوٹر سکرین کی طرف تھیں۔

کچھ لوگ سمجھ رہے ہوں گے کہ یہ عجیب بات ہے۔

ہاں ...... کچھ ایسے عجیب لوگ اَب بھی باقی ہیں دنیا میں، جو ایسا سمجھتے ہیں، باقی سب نارمل ہیں، میری طرح ......

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

میں نے ٹائپنگ جاری رکھی، اپنی انگلیوں کو روک لینا آسان کام نہیں تھا ...... کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

دستک مسلسل ہونے لگی ...... ہوتی ہی رہی۔

پوسٹ اَبھی پوری نہیں ہوئی تھی ...... اُنگلیاں چل رہی تھیں، پوریں، کی بورڈ کے بٹنوں پر برس رہی تھیں۔

دستک کی آواز اَب اُونچی اور مسلسل ہوگئی ...... مجھ پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی ...... میں ہاتھ نہیں روک سکتا تھا۔

پوسٹ کی ٹائپنگ بھلا کیسے اَدھوری چھوڑ دیتا۔

دروازہ جنونی انداز میں دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ اتنی دیر میں پوسٹ مکمل ہوگئی۔ آخری لفظ ٹائپ کرتے ہی میں کھڑا ہوگیا۔ پلٹتے پلٹتے اِنٹر کے بٹن پر اُنگلی ماری اور پوسٹ اپ لوڈ ہوگئی۔

نہایت بےزاری اور عجلت کے عالم میں دروازے تک گیا ...... پیپ ہول میں جھانکا۔

عین سامنے ایک عجیب سی وحشت زدہ عورت کھڑی تھی۔ مگر وہ دروازے کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اُس کا سر جھکا ہوا تھا ...... اور وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا سیل فون تھامے مسلسل اپنی پوسٹ ٹائپ کرنے

میں مصروف تھی۔

"پھر یہ دروازہ کون بجا رہا ہے......" میں نے ایک لمحے کو سوچا۔ پھر احساس ہوا کہ وہ اپنے ایک پیر سے دروازہ بھی مسلسل بجا رہی تھی......اور دونوں ہاتھوں سے پوسٹ بھی ٹائپ کر رہی تھی۔

"کیا ہے......؟" میں نے اونچی آواز میں کہا۔

اس نے چہرہ اٹھائے بغیر مسلسل ٹائپ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں......یہ میں ہوں مرجینا......میں اپنی انٹرنیٹ ریسرچ میں مصروف رہتی ہوں......بڑی مشکل سے معلوم ہوا کہ تم یہاں ہو......"

"میں پولیس کو بلا رہا ہوں......" میں نے گھبرائے لہجے میں کہا۔

اس نے اب بھی چہرہ نہیں اٹھایا، ٹائپ کرتے کرتے جلدی سے بولی۔ "نہیں نہیں......پولیس کو بلانے کی ضرورت نہیں......میں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتی......میں تو......میں تو تم سے بات کرنے آئی ہوں......"

"بات کرنے......" میرے حلق میں کوئی چیز پھنسنے لگی۔ خوف کی ایک شدید لہر پورے بدن میں سرایت کر گئی۔ تمام جسم کانپ کر رہ گیا، دل بے طرح دھڑکنے لگا۔

"ب......ب......بات کرنے......" میں بری طرح ہکلایا۔

"ہاں......بات کرنے......" وہ اب بھی سر جھکائے ٹائپ کر رہی تھی۔

"یہ......یہ......کک......کیا کہہ رہی ہو تم......احساس بھی ہے تمھیں......؟"

"ہاں......کہا نا......بات کرنے آئی ہوں......"

میں نے اپنی سانس بحال کرتے ہوئے جلدی جلدی کہا۔

"دیکھو......میں بہت مصروف ہوں......بہت زیادہ......شدید مصیبت میں ہوں......مجھے اپنی پوسٹس اَپ لوڈ کرنی ہیں......میں رُک نہیں سکتا......ایک منٹ کے لیے بھی نہیں......میری پوسٹوں پر مسلسل ریپلائی آ رہے ہیں......ان سب کو ریپلائی کرنے ہیں......مزید پوسٹس ابھی باقی ہیں......مصروفیت اتنی ہے کہ میں سو بھی نہیں پا رہا......کھانے کے لیے بھی جیسے تیسے بہت کم وقت نکال پاتا ہوں......ٹھیک سے کھا بھی نہیں پا رہا......تمھیں شاید اندازہ نہیں......مجھے لگتا ہے کہ میں بہت جلد مرنے والا ہوں، وقت بہت کم ہے میرے پاس......اور پوسٹس بہت زیادہ......جلد سے جلد مجھے یہ سب کام نمٹانا ہیں......سب اپ لوڈ کرنی ہیں......تم تو سمجھ سکتی ہو......تمھاری اپنی بھی حالت یہی ہے......تم سمجھتی تو ہو کہ مصروفیت کی وجہ سے جینا کتنا کٹھن ہو گیا ہے......"

اب اس نے پہلی بار سر اٹھایا۔ اس کے ہاتھ رک گئے ۔ وہ عجلت میں بولی جیسے ۔ ”میرا خیال ہے ......ہمیں ......ایک دوسرے سے بات کرنی ......چاہیے ......کوئی بات ......“

میں خوف زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

”ہاں، کوئی بات ......کوئی ......ٹی وی شو دیکھنا چاہیے ......ساتھ بیٹھ کر ......یا ......تم ......تم یہ بتا سکتے ہو مجھے کہ تم مجھے کہاں کھانا کھلانا چاہتے ہو ......اور یہ بھی بتا سکتے ہو ......کہ جینا اتنا مشکل کیوں ہو گیا ......اور میں یہ بتا سکتی ہوں ......کہ مجھے کھانے میں کیا پسند نہیں ......“

میں نے پورا دروازہ کھول دیا ۔ ۔ اکھڑے اکھڑے سانس لینے لگا۔

دروازے کے سامنے ملگجی روشنی میں وہ پہلے سے بھی زیادہ عجیب دکھائی دے رہی تھی ۔

جیسے لمحے تھم سے گئے تھے ......

کیا عجیب وقت تھا۔

نہ وہ ٹائپنگ کر رہی تھی ......اور نہ میں ......

میں نے چور نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

اس کی انگلیاں کچھ ٹائپ کرنے کو بے چین تھیں، ایک تڑپ تھی ان انگلیوں میں بے تابی سے مڑی جا رہی تھیں ......اور میرا کی بورڈ ......میرا کی بورڈ مجھے آوازیں دے رہا تھا۔

میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی جانے کیوں دروازہ پورا کھول دیا اور بڑی مشکل سے بولا۔

”ایسا کرو ......اندر آ جاؤ ......اور مجھے سمجھاؤ ......بات کرنے جیسا عجیب خیال تمھارے ذہن میں آیا کیوں کر ......؟

میری بیوی بغیر کچھ کہے کھلے دروازے سے اندر آ گئی۔

☆☆☆☆

طیب عزیز ناسک

بیسمنٹ

سردیوں کی ایک شام، وہ شہر کے مشہور پارک کی طرف چل پڑا، دور تک فٹ پاتھ خالی تھا۔ ہوا خنک تھی، اس کی چال میں آج بڑھاپے کے آثار نمایاں تھے، وہ زندگی کے ساٹھ سال جی چکا تھا اور اس خاموشی کے ساتھ کہ اس کے سایے کو بھی اس کی زندگی کی چاپ سنائی نہ دی تھی۔ ماں تو پیدا ہونے کے ساتھ ہی چل بسی اور باپ کو بھی مرے ہوئے زمانہ ہو گیا تھا۔

وہ ایک تاریک بیسمنٹ میں گزشتہ چالیس سال سے رہ رہا تھا۔ وہ صبح آفس جاتا اور پورا دن کام میں لگا رہتا۔ شام کو بیسمنٹ میں آ جاتا، جہاں نمی کی سرانڈ بارہ مہینے ہی ڈیرہ جمائے رہتی تھی۔ وہ ایک عرصے سے یہاں رہتے رہتے، اس کا عادی ہو گیا تھا۔ اس نے یہاں اپنی ضرورت کی چیزوں کو ایسے ترتیب دیا تھا کہ اندھیرے میں بھی ان کو با آسانی استعمال کر سکتا تھا۔ اس کا نوار کا پلنگ ایک کونے میں رکھا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ایک کشادہ میز جس پر ضرورت کی اشیا ترتیب سے رکھی ہوتیں۔ یہاں ہمیشہ وقت ایک سا رہتا تھا۔ ایک لمبے عرصے سے وہ یہی کرتا چلا آ رہا تھا۔

وہ چلتے چلتے پارک سے آگے مارکیٹ تک آ گیا۔ ہر طرف اندھیرا تھا اور درختوں پر بامعنی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جسے وہ پڑھ سکتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا یہ سناٹا باہر نہیں اس کے دل کے اندر کہیں کنڈلی مارے بیٹھا ہے اور اسے ڈستا رہتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے بارے میں سوچتا تو چند ہی باتیں، اسے اپنی پوری زندگی کا خلاصہ نظر آتیں۔

اسی دوران میں وہ ایک دکان میں داخل ہوا، وہ پہلے یہاں کبھی نہیں آیا تھا اور نہ ہی اسے یہاں آنے میں کوئی دلچسپی تھی۔ نہ جانے اسے آج کیا سوجھی کہ ادھر آ نکلا۔ روشنیوں نے یہاں کی ہر چیز کو مزید خوبصورت بنا دیا تھا۔ بچوں کے پہننے کے لیے عمدہ کپڑے، ساتھ ہی کھلونوں اور دوسری ضروریات کا سامان بڑی نفاست سے دکان میں رکھا گیا تھا۔ اسے ان چیزوں کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی تھی۔ اسے چار سال کے بچے کے کپڑے دیکھتے ہوئے خیال آیا۔

دکان دار اس کی طرف متوجہ ہو رہا تھا اور اس سے پوچھنے کی کوشش کر رہا تھا اسے کس ڈیزائن میں

کتنے سال کے بچوں کا ڈریس چاہیے؟

آج اس کے اندر ایک کسک تھی، ایک خالی پن تھا۔۔۔

اسے آج پہلی مرتبہ شدت سے احساس ہوا، بیوی بچوں اور ایک خوبصورت گھر کا!!! اس نے ایک عمر سے ان سب خیالات سے کنارہ کشی کر لی تھی، کیا ہر انسان کے لیے ضروری ہے ایسی ہی زندگی گزارے؟

اس نے وہاں کھڑی ایک عورت کو دیکھا، جو اپنے بچوں کے لیے کپڑے خرید رہی تھی، اس کا قد عام عورتوں سے لمبا تھا، وہ دو بچوں کے ساتھ کپڑوں کی خریداری کر رہی تھی، بچے اسے خوب تنگ کر رہے تھے۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ شاید یہ میری بیوی ہے۔۔۔ یہ دونوں میرے بچے!!

میری تو ابھی شادی ہی نہیں ہوئی تو پھر یہ میرے بچے کیسے ہو سکتے ہیں!!!

وہ خود ہی سوال کرتا جاتا۔۔۔ اور پھر ان کے جوابات بھی دیتا چلا جاتا۔

وہ چلتے چلتے دکان سے باہر آ گیا۔

آج وہ اپنے معمول کے اوقات کا خیال کیے بغیر بے سود گھوم رہا تھا۔

اس نے اپنی زندگی کے اس پہلو پر کبھی نہیں سوچا تھا، وہ اپنی کم آمدنی میں کھانے پینے کے علاوہ بہ مشکل اس بیسمنٹ کا کرایہ ادا کر سکتا تھا۔ وہ اس عورت کے بارے میں سوچنے لگا۔۔۔ جسے اُس نے دکان میں دیکھا تھا۔

ایک لذت اور سرور کا احساس اس کی رگ و پے میں سرایت کرنے لگا۔ وہ واپس مڑا۔۔۔ دکانیں، شاپنگ پلازے، فوڈ پوائنٹ اس نے ہر جگہ دیکھا لیکن وہ دوبارہ کہیں نظر نہ آئی۔ کئی عورتیں اپنے بچوں کے ساتھ دکانوں میں شاپنگ کر رہی تھیں۔ اسے بہت سی عورتوں پر اسی عورت کا گماں ہوا، آج اس کے احساسات کی لگام اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ اچانک اسے وہی عورت سامنے سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ قریب آئی تو معلوم ہوا یہ کوئی اور ہے۔ اس کے ساتھ دو بچے تھے جبکہ اس کے ساتھ ایک۔۔۔ وہ چکرا کر رہ گیا۔

اچانک اسے محسوس ہوا شاید اسے ایسی کوئی عورت ملی ہی نہ ہو اور یہ صرف اس کا وہم ہو۔۔۔؟

اس نے اپنے دماغ پر زور دیا اور سوچنے لگا۔۔۔ ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ بالکل اسی کے جیسی تھی۔ میں خود اسے دکان میں دیکھ چکا ہوں، آج اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی کا ڈھنگ بدل سا گیا ہے۔

اچانک اسے واپسی کا خیال آیا۔۔۔

”وہ آج ہرگز واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔“

اسے لگا۔۔۔!!

وہ بیسمنٹ نہیں قبر ہے، جس میں جیتے جی اس نے کئی سال گزار دیے ہیں۔

ایک لمحے کے لیے وہ بیسمنٹ کی تنہائی اور گہرے سناٹے سے ڈرنے لگا---اس کا دم گھٹنے لگا---اور کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ اس کے ناک اور آنکھوں سے پانی بہنا شروع ہو گیا۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا---سردی مزید بڑھ رہی تھی۔

اسے لگا جیسے یہاں سب کچھ ان دیکھا سا ہے---اسے اپنی آنکھوں پر حیرت ہونے لگی---اس کے ارد گرد جو کچھ ہے سب وہم ہے، حقیقت نہیں!!!

شاید حقیقت کچھ بھی نہیں ہے۔

ایسا کیسے ممکن ہے؟

بہت دیر تک وہ خود سے مکالمہ کرتا رہا اور سوچتا رہا----

زندگی اک وہم ہے---رات مزید گہری ہو رہی تھی۔

وہ چلتا چلتا شہر کے مشہور پُل تک آ گیا۔ نیچے ہائی وے پر تیز رفتار ٹریفک رواں تھی۔ ہوا تیز ہو رہی تھی اور خنکی مزید بڑھنے لگی تھی---اس کے ذہن میں ایک خلفشار تھا!

وہ سوچ رہا تھا!

مسلسل سوچ رہا تھا---!!!

آج ایک عمر کے بعد اس نے خود کو تیار کر لیا تھا۔

وہ پُل کی دیوار پر چڑھ گیا---اور بازو پھیلا دیے۔

ٹریفک رکی ہوئی تھی۔ لوگ اکٹھے ہو رہے تھے

تھوڑی ہی دیر میں ایمبولینس آ گئی۔

گاڑیوں کے نیچے کچلی ہوئی لاش کا چہرہ بگڑ چکا تھا اور اہلکار اسے سٹریچر پر ڈال چکے تھے

دوبارہ ہائی وے پر ٹریفک رواں ہو گئی تھی۔

وہ دوبارہ بیسمنٹ میں جانے کے لیے تیار تھا۔

☆☆☆☆

شاہین کاظمی

ایک ادھورا گیت

”ٹوٹی دیواروں کے اُس پار سے جھانکتے تمام خونی لمحوں کو آنکھ کی پتلیوں سے گرا دو ورنہ وہ بصارت چاٹ جائیں گے۔“

مگر شاید وہ نہیں جانتا تھا کہ کچھ منظر بصارت نہیں روح چاٹ جاتے ہیں۔

میری نظریں میرے پہلو میں گڑی ہیں۔ میرے چار سالہ بچے کی بھوری آنکھوں میں کیا ہے میں پڑھ نہیں پاتی۔ شاید مجھے پڑھنا بھول گیا۔ جلے ہوئے کھیتوں میں بدن پر اَن کہی کہانیاں لپیٹے ڈنٹھلوں سے الجھی ہوئی گرم ہوا کھنڈر ہوتی بستی کے شکستہ در و دیوار پر دستک دے رہی ہے مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ خاموشی نہیں ٹوٹی۔ میں اپنے بچے کی طرف دیکھتی ہوں۔ اُس کے لب بھی ساکت ہیں۔ کھلی آنکھوں میں حیرانی اور درد منجمد ہے۔ در و دیوار سے ٹکرا کر پلٹنے والی ہوا اس کے نرم بالوں کو چھوتی ہے۔

”نیہان۔“

میری خون آلود انگلیاں اُس کے ننھے ننھے ہاتھوں سے مس ہوتی ہیں۔ لیکن آنکھیں نہیں جھپکتیں۔

کیا ہم نصیب کے لکھے تمام آنسو رو چکے؟

”سنو۔“ میری سانسوں میں اُترتی کسیلی ہوا اچانک سرگوشیاں کرنے لگی۔ اُس کے بدن میں مردہ جسموں کی باس تھی۔

ایک نرم ہاتھ میرے شانے پر آ ٹکا۔ دھوئیں کے بادلوں سے کہیں بہت پرے سرسبز کھیتوں کے اُس پار تازہ پانیوں کے کنارے وہ میرے سامنے ہے۔

”سنو سفر کبھی تمام نہیں ہوتا۔“

وہ میری آنکھوں میں دیکھتا ہے۔ اُس کی سیاہ آنکھوں میں اُمڈی محبت مجھے سرشار کر دیتی ہے۔

”محبت اور نفرت، نیکی اور بدی، ندی کے دو کنارے ہیں اور یہ میرا اختیار، کہ مجھے کس کنارے کا انتخاب کرنا ہے۔“

اُس کی بھاری آواز میری سماعتوں میں گھلتی ہے۔ میرے ہاتھ میری کوکھ پر ہیں اور زندگی کی نبضیں

میری نبضوں سے ہم آہنگ۔

"اے محبت میں نے تمھارا انتخاب کیا ہے۔"

اُس کے عنابی ہونٹوں کا خفیف سا خم، زندگی کتنی سہل ہے، کتنی دلکش۔ میری آنکھیں جھک گئیں۔

"اِدھر میری طرف دیکھو۔" وہ میرا چہرہ اپنی طرف موڑتا ہے۔

"محبت زمینی اور زمانی بندشوں سے ماورا ہے۔" اُس کے لہجے کا یقین میری روح میں اتر گیا۔

"اور میرا عشق بھی۔ میں اپنی آخری سانس تک تجھ سے محبت کرتا رہوں گا۔ بلکہ اُس کے بعد بھی۔"

اور میں روح میں بسا ایک سا احساس لیے اُسے تکتی رہی۔

احمد الکریم کو دوسری بار عشق ہوا تھا۔ اپنی تمام تر شدت اور وحشت کے ساتھ۔ ایک عشق سنبھالنا مشکل۔ مگر احمد الکریم دونوں عشق اُسی شدت سے سینے سے لگائے سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ مجھے کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں اُس کا دوسرا عشق تھی۔

مجھے بند آنکھوں پر دستک دینی ہے
سے کا تیز رفتار سوار بستیاں تاراج کر رہا ہے
آؤ اپنے اپنے عبادت کدوں سے باہر نکلیں
عقیدتوں کے چولے اتار کر دیکھیں
کہ ہماری زمینوں کے سودے ہو چکے
مجھے اُن پتھر کے خداؤں کے لیے
ایک تیشے کی تلاش ہے

ہاں اُس کا پہلا عشق اُس کی زمین تھی۔ وہ زمین جو صدیوں کا تہذیبی ورثہ سنبھالے ہوئے تھی۔ شانت اور زندگی کے چہچہوں سے بھرپور۔ مگر ایک دن اچانک سورج لہو رنگ ہو گیا۔ ہواؤں میں زہر گھل گیا اور موت ہر جگہ دندنانے لگی۔ احمد الکریم کا قلم تلوار بن گیا۔

زندگی کو اُس کے اصل کے ساتھ قبول کرو
رنگریز ہو یا چاک گھمانے والا کوزہ گر
اصل سے دور ہو تو رنگ پھیکے پڑ جاتے ہیں
اور
شکلیں معدوم

انسان ہوں یا زمین
اپنے مدار سے ہٹیں تو کائناتی توازن میں خلل بڑھ جاتا ہے
خواہشات کی بھٹی میں
زندہ ایندھن مت جھونکو

مگر خواہشات کی تابع داری کم نہ ہوئی۔ موت کے آنگن میں چھوٹے بڑے بدن غنچوں کی طرح کھلتے رہے۔ وہ لکھتا رہا۔ وہ لکھتا رہا۔ ذہنوں سے روٹھی سوچوں کو آواز دیتا رہا۔ بھٹکے قدموں کے لیے صحیح راستے کی منادی کرتا رہا۔

تیز ہوا کا شور مجھے پھر سے ڈرانے لگا۔ فضا میں موت برساتے طیاروں کی گھن گرج سنائی دیتی ہے۔ زمین پر زندگی کی سانسیں اُکھڑ رہی ہیں۔ کبھی نہ تمام ہونے والا یہ شور میری سماعتوں کو مفلوج کر دیتا ہے۔

”کیا کوئی اور قیامت ہو گی؟“ درد اپنی انتہا پر ہے۔ میں اپنے کٹے پھٹے ادھورے بدن میں موت کی سرسراہٹ محسوس کرتی ہوں۔ گھر کے ملبے سے نکالتے وقت میرے بدن کا بہت سارا حصہ وہیں رہ گیا۔ اِن شکستہ دیواروں کے بیچ جس کی بنیاد محبت تھی۔ میری رگوں میں دوڑتا سرخ سیال تیزی سے زمین میں اترنے لگا۔

صدیوں سے اِس سرزمین پر قائم زندگی کے تسلسل میں تعطل آنے لگتا ہے۔ ابتدا سے اتار چڑھاؤ دیکھنے والا وقت بھی دم بخود ہے۔ بستیاں کھنڈر بنتی جا رہی ہیں۔ لیکن میرے اپنوں کی نیند ٹوٹتی ہے نہ کسی اور کی۔ میں گرد آلود آسمان کے اُس پار دیکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔

مگر میری نظریں دھندلانے لگتی ہیں۔

”تمھیں زمین کے دکھ نظر نہیں آتے۔“ میں اُس خالق سے مخاطب ہوں جسے اُس کی مخلوق نے اپنی اپنی خواہشات کے رنگ میں رنگ کر عقیدت کے بت کدے میں سجا رکھا ہے۔

کوئی جواب نہیں آتا

آسمان سے جواب اترنے بند ہو جائیں
تو جان لو کہ آسمان اور دلوں کے رابطے کمزور ہی نہیں پڑے
ٹوٹ بھی چکے ہیں۔
روزِ الست کو کیا گیا عہد فراموش ہو چکا
لیکن یہ مت بھولنا خاموشی جرم تھی
خاموشی جرم ہے

ناقابلِ معافی جرم
اے میری دنیا کے اندھے خداؤ
ڈرو اُس وقت سے
جب وقت کا شہ زور ہاتھ اپنے تیشے سے
تمھارے بدن کو کاٹ ڈالے
اور تم اپنے پہلوں کی طرح فراموش کر دیے جاؤ۔

اُڑتی دھول اور آگ کے درمیان موت سے بھاگتے لوگوں کا شور۔ کراہیں، چیخیں، بین اور دھڑ دھڑ زمین بوس ہوتی عمارتیں۔

''یا رب کریم''

زمینوں سے امن روٹھ جائے تو موت کی نوکیلی انگلیاں دھرتی کا سینہ ادھیڑنے لگتی ہیں۔ میری دھرتی کا سینہ سالوں سے اُدھڑ رہا ہے۔ ایک ایک کر کے کتنی بستیوں کی زندگی اُس کی کوکھ میں جا سمائی۔

''گھبرانا نہیں۔'' اچانک وہی نرم ہاتھ پھر سے میرے شانے پر آ ٹکا۔

درد کی آتش میں جھلتے بدن میں ایک شیریں احساس بیدار ہوتا ہے۔ ٹوٹتی سانسوں میں قرار آنے لگتا ہے۔

احمد الکریم کو اِس دھرتی سے عشق تھا۔ کہساروں سے اُترتی ہوا شاید ہے اُس کی دیوانگی کی۔ اُس کے عنابی ہونٹوں پر تھرکتے رسیلے گیتوں میں ڈھلے لازوال جذبوں کی۔ اُس کی سیاہ آنکھیں جب میری طرف اُٹھتیں تو میں اُلجھ جاتی۔ مجھے سمجھ نہیں آتی وہ کس سے زیادہ محبت کرتا ہے مجھ سے یا اِس دھرتی سے۔ وہ ہنس دیتا۔

''محبت تو بٹوارے سے چنپتی ہے، بہاؤ روک دیا جائے تو پانی گدلا ہو جاتا ہے۔''

اُس کی طرح اُس کی باتیں بھی عجیب۔

شاید بہاؤ روک دیا گیا۔ گلاب لہو رنگ ہونے لگے۔ دھرتی پر تھوہر اُگ آیا جس نے زندگی کا حسن نچوڑ لیا۔ موت گھل کر کھیلتی رہی۔ مائیں بچے جن کر موت کی گود میں سلاتی رہیں۔ اور باپ ہاتھوں پر اٹھائی ننھی ننھی لاشوں کو زمین میں اتارتے اتارتے بے دم ہونے لگے۔

''اے محبت یاد رکھنا میں نے تمھارا انتخاب کیا ہے۔'' وہ نرم اور شیریں لب میری پیشانی پر ثبت تھے۔

''میں ہمیشہ تمھارے ساتھ رہوں گا۔'' اُس نے میرے چہرے پر لکھی بے یقینی پڑھ لی۔

''تم کبھی اکیلی نہیں ہوگی۔'' اُس کا دوسرا بوسہ اپنے بچے کی پیشانی پر تھا۔

اُس کے لکھے لفظ روحیں برمانے لگے تھے۔ وہ شام کے ہر گلی کوچے میں پڑھا جانے لگا۔ ذہنوں میں سوچیں بیدار ہوئیں تو زمینی خدا بگڑنے لگے۔ اُس دن بندوقوں کے سائے میں چلتے احمد الکریم کے پیروں میں لرزش نہیں تھی۔

"میں لوٹ کر آؤں گا۔"

کیا دھرتی سے عشق بھی جرم تھا؟

"جب خواہشات کی منڈی سجی ہو اور بولی لگائی جا رہی ہو تو پہچان گم ہو جایا کرتی ہے۔"

وہ چلتے چلتے لمحہ بھر کو رکا۔ بندوق کا بھاری بٹ اُس کے کندھے سے زور سے ٹکرایا۔ ہڈی تڑخنے کی آواز میرا کلیجہ چیر گئی۔ لیکن احمد الکریم کے سکون میں رتی برابر فرق نہیں آیا۔

"محبت کبھی نہیں مرتی۔ تم انتظار سے اُکتا مت جانا۔"

"کبھی کبھی نیند ٹوٹنے میں وقت لگتا ہے۔"

"کیا موت مہلت دے گی؟" میری آواز میں جانے کیا تھا وہ پھر سے رک گیا۔

"ایسا نہ ہو نیند ٹوٹے تو موت زندگی کی ساری فصل برباد کر چکی ہو۔"

"پانیوں میں زہر گھول دیا جائے تو جنت کھوجنے میں زمانے لگ جاتے ہیں۔ آنکھیں وہ سب رنگ نہیں دیکھ پاتیں۔ وہ سب رنگ جو زندگی کا استعارہ ہوتے ہیں۔ نظر آتا ہے تو فقط سراب جو بصارت ہی نہیں بصیرت کو بھی کھا جاتا ہے۔"

اُس کی آواز دھیمی تھی۔ میں اُس کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔

"زمانہ سنبھلے گا یہ میں جانتا ہوں۔ بس تم انتظار سے اُکتا مت جانا۔"

بندوق برداروں کی کڑی نگاہوں اور اُس کی التجا نے میرے قدم روک دیے مگر وہ چلتا رہا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں انتظار کا دامن تھامے دھویں اور بارود کی مسلسل بلند ہوتی دیوار کے اُس طرف لاشوں میں الجھی رہی۔ بین بڑھتے گئے۔ نالے فلک چھونے لگے مگر نہ سکوت ٹوٹا نہ انتظار میں اکتاہٹ اتری۔ لوگ روز اپنی محبتیں مٹی کے سپرد کرتے ہوئے ہواؤں کو سندیس دیتے رہے۔ اُجڑی بستیوں کے شکستہ در و دیوار اور اڑتی دھول بلاوے بھیجتی رہی مگر آنکھیں تماشائی بنیں دیکھتی رہیں اور گِدھ احمد الکریم کا پہلا عشق بھنبھوڑتے رہے۔

دن ہفتوں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ احمد الکریم کی کوئی خبر نہیں آئی۔ انتظار طویل ہوتا گیا۔ شاید وہ بھی "انا الحق" کہنے کے جرم میں مصلوب کر دیا گیا تھا۔ میں انتظار سے اکتائی نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا وہ لوٹ کر آئے گا۔ لیکن میرا یقین آنے والی یقینی موت کو نہ روک سکا۔ الغوطہ میں آسمان سے برستی موت کا

نقارہ بجا تو دھیمے سُروں میں گنگنایا گیا محبت کا گیت ادھورا رہ گیا ۔ ۔

میرا بچہ مر چکا ہے اور میں اکیلی موت سے لڑ رہی ہوں ۔

ایک داغستانی شاعر نے کہا تھا ۔

”اور اگر تم تنہا ہو، اکیلی ہو
اور کوئی بھی تمھاری محبت میں مبتلا نہیں ہے
تو یقین کر لینا کہ بلند پہاڑوں میں کہیں
رسُول حمزہ مر گیا ہے“

میں سانسیں ٹوٹنے سے پہلے جاننا چاہتی ہوں ۔

کیا رسول حمزہ واقعی مر گیا ہے؟

☆☆☆☆

مافات رضا

زندگی کا کوئی مکاں

رنگ---کینوس---کاغذ---تصویریں---زندگی۔
عدد---جمع---نفی---تقسیم---موت۔

دوگردانیں اس کی سانس کی دوگردانیں اور ان کے درمیان دفتر میں بیٹھا خود سے الجھتا وہ اس کشمکش میں مبتلا کہ پچھلا لمحہ جو اس نے پوری ہمت سے گزارا تھا اس میں جیا تھا یا مرا تھا---اس کے نزدیک زندگی سانسوں کا تسلسل نہیں تھی---زندگی کچھ اور چیز تھی جس کے بارے میں وہ بحث نہیں کرتا تھا اس کا ماننا تھا جن چیزوں کو وہ کبھی جیا ہی نہیں ان کے متعلق بحث خالی اور بے ثمر ہوتی ہے---شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اکثر سانسوں کے تسلسل کو موت کی علامت گردانتا تھا۔ مسلسل موت اس کا پسندیدہ موضوع---مسلسل موت جسے وہ نجانے کب سے جی رہا تھا---ہاں مگر اس بات کا ادراک اسے چند برس پہلے ہی ہوا تھا، ادراک بھی ایسا جس نے کئی معنی بدل دیے تھے۔ رات سے اسے محبت سی تھی اسے یہ ساحرہ بے لباس کی واحد اوڑھنی محسوس ہوتی اور دن کی روشنی وہ داشتہ جو مفلس کو بے لباس کرنے پہ تلی رہتی---سیاہ رنگ سے محبت شاید اس کی یہیں سے شروع ہوئی تھی---پھر تو جیسے تمام رنگ اسی رنگ میں ضم ہو گئے تھے وہ گھنٹوں سیاہ رنگ پر بحث کرتا---اسے سیاہ رنگ کی کئی اقسام کا علم تھا جیسے ماند پڑتا سیاہ رنگ---چمکتا ہوا سیاہ رنگ اور بھی نجانے کیا کیا مجھے تو اب یاد بھی نہیں---ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ ہر طرح کا سیاہ رنگ اس نے مجھے دکھایا ضرور تھا---بعض اوقات تو اس کا دل چاہتا کہ کوئی جادوئی برش پکڑے اور آسمان زمین پہاڑ پرندے سب کو سیاہ رنگ سے رنگ دے---یہی وجہ تھی کہ اس کی تمام تصویریں سیاہ رنگ کی نمائندگی کرتیں---ایک بار تو اس نے ایسی تصویر بنائی جس میں درخت، پتے، گھاس، سورج سب سیاہ رنگ کے تھے اور ان کے درمیان ایک دھندلا سا شخص جس کے ہاتھ میں ایک سیاہ سگریٹ تھی اور اس سگریٹ سے سیاہ دھواں ہوا میں تحلیل ہونے کو تھا---میں نجانے کیوں اس تصویر کو دیر تک تکتا رہا حالاں کہ اس کی تصویریں اب مجھے چونکاتی نہیں تھیں کچھ چونکاتا تھا تو اس کا چہرہ جس پہ ضبط کی تہہ تھی یا کچھ بے نیازی سی---مجھے اس کے پراسرار چہرے کی کبھی سمجھ نہیں آئی---وہ ہمیشہ میری نظروں کو بھانپ کر کچھ ایسا بے معنی ادھورا سا جملہ کہہ دیتا جس کے معنی مجھے دیر سے سمجھ آتے اور میں سوائے اسے کسی

اور سیارے کا باشندہ جاننے کے کچھ نہیں سوچ پاتا۔۔۔

ایک بار میں نے اس سے کہا تھا۔

اگر تمھارے کپڑے پھٹے ہوتے اور تم کسی روڈ کے کنارے ملتے تو میں تمھیں ضرور کوئی درویش سمجھتا۔۔۔ کپڑے تو اب بھی پھٹے ہوئے ہیں اور میں اب بھی ویرانوں میں سفر کر رہا ہوں۔۔۔ وقت کی حد کے اس پار کھڑا، میں حمیت کی خواہش کو دبانے کا عذاب بھگت رہا ہوں۔ حمیت موت ہے۔ اس نے کہا؛ میں کچھ سمجھ نہ پایا۔ اب چونکنا معمول سا تھا۔۔۔

وہ چند دن پہلے ہی میرے آفس میں آیا تھا میرا جونیئر تھا پہلے دن سے کام میں گم اعداد و شمار فائلوں کے درمیان چپ چاپ اپنا کام کرتا رہتا۔۔۔ میں اکثر اسے کام میں مدد کرتا کیوں کہ یہاں سب سے پرانا کام کرنے والا میں تھا اور میں ہی سب میں کام تقسیم کرتا تھا۔۔۔ مجھے اپنی برتری کا احساس تھا اس لیے اس پر زیادہ غور کبھی نہیں کیا۔۔۔ ایک دن میں نے نوٹ کیا کہ وہ ہر شخص کی طرف ایسے دیکھتا ہے جیسے اس کے اندر تک جھانکتا ہو۔ اس دن میں نے پہلی بار جانا کہ یہ شخص اس سے کچھ بڑھ کر ہے جو نظر آتا ہے۔۔۔

یار ایک بات بتاؤ تم اس سے پہلے کیا کرتے تھے۔۔۔ میں نے کھانے کے وقفے کے دوران میں اس سے پوچھا۔۔۔ کہنے کو تو کالج میں تھا مگر شاید کچھ نہیں کر رہا تھا سوائے اس بے معنی زندگی کے دلدل میں دھنسے جانے کے۔۔۔ اس نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا۔۔۔ میں پہلی بار چونکا تھا۔۔۔ بے معنی زندگی۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔؟ میں نے کہا۔

معاف کیجیے۔۔۔ بے معنی زندگی میں غلط استعمال کر گیا بے معنی ہونے کے لیے بھی زندگی کا وجود ہونا ضروری ہے۔۔۔ مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا میں زندگی سے واقف نہیں ہوں۔۔۔ بس یوں سمجھ لیجیے سانسوں کا تسلسل قائم رکھے ہوئے تھا اور کچھ نہیں کیا اب تک۔ اس نے پھر سے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے چوٹ کی۔۔۔ یار میں کچھ نہیں سمجھا تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔۔۔ خیر تم دلچسپ انسان ہو میں صحیح سمجھا تھا جو تم دکھتے ہو وہ تم ہو نہیں۔۔۔ میں نے اس کو چونکانے کے لیے کہا۔

میں اکثر اپنی باتیں سمجھا نہیں پاتا اسی لیے کیٹس کا سہارا لیتا ہوں کاش میری باتیں اثر رکھتیں تو میں یوں آزاد۔۔۔۔۔ وہ بات کو ادھورا چھوڑ کر اپنے اپنے اندر کے خلا کو سگریٹ کے دھویں میں ٹٹولتا رہا اور پھر بولا؛ ہاں میری رنگت گندمی ہے۔۔۔ میں اندر سے سیاہ ہوں بالکل سیاہ۔۔ آپ ٹھیک سمجھے ہیں۔۔۔ اس نے جواب دیا اور میں اس بار بھی کچھ سمجھ نہیں پایا۔۔۔ وہ اپنی بے اثر باتوں سے مجھے مسلسل حیرانی میں مبتلا کر رہا تھا۔۔۔

میں آج پہلی بار اس کے کمرے میں آیا تھا شاید وہ بھانپ گیا تھا میں اسے مزید جاننا چاہتا ہوں اس

لیے اس نے اتوار کے روز مجھے اپنے کمرے میں آنے کی دعوت دی تھی۔۔۔

اس نے کمرے کا دروازہ کھولا تو اندر بے ترتیب صاف ستھرے بستر، ریک میں لگی گرد سے اٹی کتابیں اور ایک کونے میں پڑی اس کی بنائی کچھ تصویریں پڑی تھیں۔ پیچھے دیوار پر ایک شعر لکھا تھا جس کی طرف میں نے زیادہ دھیان نہیں دیا مجھے اس کی تصویروں میں زیادہ دلچسپی تھی یوں بھی شعر اکثر میرے سر کے اوپر سے گزرتے تھے۔

یار معاف کرنا سب بے ترتیب پڑا ہے یہاں اب کوئی نہیں آتا اس کی رونق جاتے جاتے میرے اندر سیاہی بھر گئی ہے مجھے اس سیاہی سے نکلنے کی فرصت نہیں ملتی یا یوں کہہ لو میں خود قید ہوں اس سیاہی میں۔۔۔ قیدی کا حوصلہ قفس کی چابی ہوتا ہے مگر میرے حوصلے نے تو اس قفس کو مکان کر دیا ہے جو میرا مستقل ٹھکانہ ہے۔۔۔ اس نے سکون سے کہا اور میں اس کی بنائی تصویروں میں گم ہو گیا۔

یار اچھی تصویریں ہیں مگر کچھ سے شاید میرا اختلاف ہو میں شاید ان میں بکھرے جذبات اور رنگوں سے مختلف سوچتا ہوں۔۔۔ میں نے تمام تصویروں میں سیاہ رنگ اور دھندلے چہرے دیکھتے ہوئے اس سے کہا

اختلاف اچھی چیز ہے۔۔۔ اس لیے تو تم زندہ ہو۔۔۔ اس نے فوراً جواب دیا جیسے وہ اس اختلاف کے لیے پہلے سے تیار تھا۔

اختلاف سے میری زندگی کا کیا رشتہ ہوا۔۔؟ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

بھائی اختلاف اور تضاد کا خمیر ایک ہی مٹی سے گوندا گیا ہے تضادات پر دنیا قائم ہے۔۔۔ سیاہ سفید، زمین آسمان خدا اور ابلیس دیکھو سب تضادات اس دنیا کا توازن ہیں۔۔۔ اس نے پرسکون لہجے میں کہا اگرچہ اس کا چہرہ کبھی پرسکون نہ تھا۔

تضادات کے سوا کچھ ہوتا ہے کیا؟ میں نے سوال کیا۔

ہاں۔۔۔ صحیح اور غلط تضادات ہیں یا یوں کہو دو انتہائیں ہیں اور ان کے درمیان جو کشمکش میں مبتلا ہے اسے معاشرہ کہتے ہیں اور انسان اسی کا حصہ ہیں۔ اس نے وضاحت کی اور پانی کا گلاس بھرنے لگا۔

تمھاری تصویروں سے اختلاف قائم ہے میرا اگرچہ تمھاری باتوں کا کوئی جواب نہیں میرے پاس۔۔۔ میں نے اسے کہا میری سوئی ابھی تک اس کی تصویروں پہ اٹکی تھی۔

جناب کیجیے اختلاف اور یہ تصویریں نہیں کہانیاں ہیں اور میں ان کے ساتھ رہ کر خود ایک کہانی بن چکا ہوں اور ضروری نہیں کہ آپ ہر کہانی سے اتفاق کریں سب کہانیاں مختلف ہوتی ہیں، میں وہی کہانیاں کینوس کی نذر کرتا ہوں جن کو میں نے جیا ہو۔

میں اس کی باتوں کو سنتا رہا اور پھر اس سے سوال کیا۔ یار تم ایسے کب سے ہو؟ زندگی سے دور۔ تم ایسے کب تک رہ سکتے ہو۔ زندگی کی طرف لوٹنا ہی پڑے گا۔۔۔ کب تک جلتے رہو گے یوں۔۔۔

اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا سگریٹ اپنے بائیں ہاتھ کی پشت پر پہلی انگلی کے جوڑ کے نیچے بجھایا اس کے فنکار ہاتھوں کی جلد فورا جل گئی اور چند لمحوں بعد ہی اس پر ایک آبلا نمودار ہو گیا۔۔۔۔ دیکھو میں نے ہاتھ جلا دیا مگر یقین جانو میرے اندر کی جلن مجھے اس جلن کو محسوس تک نہیں ہونے دے رہی مجھے ذرا بھی درد محسوس نہیں ہو رہا۔ میں نے کہا تھا میں اندر سے سیاہ ہو چکا ہوں۔۔۔ میں اس کا جواب سن کر اسے عجیب نظروں سے گھورتا رہا وہ چپ چاپ بیٹھا رہا جیسے ہاتھ جلنے سے اسے سکون مل رہا ہو۔۔۔

جانتے ہو اندر سے مسلسل جل رہا ہوں ایک مسلسل بے چینی ہے شاید میں اس کا حق دار تھا۔۔۔ چند سال قبل میں ایسا نہ تھا میں انتہائی غصیلہ، مغرور اور گھٹیا انسان تھا میں نے کئی لوگوں کے دل دکھائے ہیں جن میں سے بعض سے تو میں واقف تک نہ تھا۔۔۔ جانتے ہو میں اس قدر غصیلہ تھا کہ بچپن میں ایک لڑکے کے سر پر چاکو دے مارا تھا اور پھر ان لوگوں کا تو کوئی حساب ہی نہیں جن کو شہر سے گاؤں جانے والے رستے پر سخت سرد راتوں میں ہم اسلحے کے زور پر درختوں سے باندھ دیا کرتے تھے۔۔۔ ایسا کرنا صرف ہمارا ایڈونچر تھا اور کچھ نہیں۔۔۔ ہر دن کوئی نہ کوئی ہمارے اس ایڈونچر کی نذر رہتا۔۔۔ سوچتا ہوں کاش ایسا کبھی نہ کیا ہوتا۔ کتنے دل دکھائے ہیں میں نے۔۔۔ یہ سب تو وہ قصے ہیں جن کو سناتے ہوئے میں سب سے کم شرمندہ ہوں۔۔۔ میں اس بے چینی کا حق دار ہوں۔۔۔ پھر ایک دن میں نے کسی کے جوتوں پہ سر رکھ دیا قید مانگی مگر اس نے مجھے آزاد کر دیا اور مجھے وہ تمام لوگ یاد آئے جن کے دل میں نے دکھائے تھے۔۔۔ جب مجھے اس بات کا احساس ہوا تو میں مسلسل پانچ دن سو نہیں پایا۔۔۔ اور چھٹے دن میری حالت بہت عجیب تھی میں کچھ محسوس نہ کر پا رہا تھا بس ہر چیز انتہائی سست رفتار سے چل رہی تھی مجھے اب بھی یاد ہے جب مجھے وہ ہاتھوں میں اٹھا کر گاڑی میں ڈال رہے تھے تو مجھے میرے جسم پر لمس کا احساس تک نہ تھا مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ہوا میں معلق ہو گیا ہوں اور جب ڈاکٹر انجیکشن لگا کر مجھ سے کچھ کہہ رہا تھا تو مجھے اس کی آواز اس کے منہ سے نکل کر عقبی دیوار سے ٹکرا کر کسی غیر مرئی گیند کی طرح میرے کانوں کے درمیان سے ہوتی ہوئی دوسری دیوار سے ٹکراتی محسوس ہو رہی تھی۔۔۔ مجھے یاد ہے وہ اذیت جس کا میں واضح حق دار تھا۔

میں اس کی بات سن کر فیصلہ نہیں کر پایا کہ اس پر ترس کھاؤں یا ان لوگوں پر جن کا دل اس نے دکھایا۔ اس کی آواز میں ایک عجیب سی کھنک جاگ گئی تھی۔۔۔

میں نے یہ سب تمھیں اس لیے بتایا کہ کہیں تم مجھ پر ترس نہ کھاؤ میں جس حالت میں ہوں اس کا

حق دار ہوں۔۔۔ میں خود پر ترس کھانے کا حق کھو بیٹھا ہوں اگر چہ میں بعض اوقات خود کو قابلِ رحم سمجھنے لگتا ہوں۔ جانتے ہو جن دنوں مجھے نیند نہیں آتی تھی میں نے کئی بار کوشش کی کہ خودکشی کرلوں مجھے جینا ہی نہیں تھا مگر میں بزدل تھا سخت بزدل۔۔۔ میری بزدلی یہ نہیں تھی کہ میں خودکشی کرنا چاہ رہا تھا بلکہ میری بزدلی یہ تھی کہ میں ہر بار ڈر گیا میں خود کو مارنے سے ڈر گیا میں اندر سے اس قدر بزدل تھا کہ میں خود کو مار نہیں پایا۔۔۔ اپنی جان لینا کیا آسان کام ہے؟ مجھے نہیں لگتا۔ میں اس سانسوں کے تسلسل کو صرف اس لیے توڑ نہیں پا رہا کہ میں انتہائی بزدل ہوں صرف دوسروں کے دل دکھانے والا بزدل۔۔۔۔ جانتے ہو ندامت میں جان دینا بزدلی نہیں ہوتی بہادر لوگ معافی نہیں مانگتے بلکہ ندامت سے مر جاتے ہیں۔۔۔ اور میں نے۔۔۔ میں نے تمام لوگوں سے معافی مانگی سب کے پاؤں پکڑے اور سب نے مجھے قابلِ رحم سمجھا، مجھ پر ترس کھایا ان سب نے جن پر میں نے کبھی ترس نہیں کھایا تھا۔۔۔ میں ان میں سے کسی سے نظریں ملانے کے قابل نہیں۔۔۔

اب سوچتا ہوں اس کی باتیں اس موت کی تصدیق تھیں کیوں کہ اس کے نزدیک سانسوں کے تسلسل کا نام زندگی نہیں تھا۔ چند منٹ کی خاموشی مناسب الفاظ کو ڈھونڈنے میں صرف کی اور ناکامی کے بعد میں اس کے بک ریک کے اوپر رکھی ایک پینٹنگ کی طرف گیا۔ یہ پینٹنگ مختلف رنگوں سے بھرپور تھی اس میں چمکتا سیاہ رنگ صرف بالوں کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔۔۔ واحد ایسی تصویر جس کا چہرہ دھندلایا ہوا نہ تھا اس کے نقوش بہت خوبصورت تھے۔۔۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔۔۔ میں نے تصویر دیکھنے کے بعد اس کے بنانے والے کی طرف دیکھا اس کے چہرے پہ مسکراہٹ تھی۔

یہ میری بنائی گئی پہلی تصویر تھی۔۔۔ اس کو بنانے میں مجھے ایک سال لگا تھا۔۔۔ پہلی بار ایک افسانوی سا چہرہ دیکھ کر دل نے چاہا کہ اس کو قید کر لیا جائے مگر قید میں خود ہو گیا تھا۔۔۔ مگر پھر اس نے مجھے آزاد۔۔۔ اتنا کہہ کر وہ پھر سے اپنے اندر کی خلا کو سگریٹ کے دھویں میں تلاش کرنے لگا۔۔۔ خیر اس آزادی نے میرے اندر کی سیاہی سے مجھے آشنا کروایا۔۔۔ اور میں نئی قید میں گرفتار ہو گیا۔۔۔

اس نے بہت پیار سے کہا اور میں نے بات کا رخ بدلتے ہوئے ایک اور سوال کیا شاید اس کے چہرے کی بڑھتی ہوئی اذیت سے میں خائف تھا۔

ایک تصویر بنانے میں ایک سال کیسے لگ گیا؟

میں نے تم سے کہا میری تصویریں کہانیاں ہیں اور وہی کہانیاں لکھتا ہوں جن کو میں جیتا ہوں۔۔۔

میں نے پہلے اس تصویر پھر سامنے موجود کہانی کی طرف نظر دوڑائی اور مجھے لگا کہ کبھی زندگی تھی اس میں۔۔۔

کنزیٰ خالق

کہانی

کہانی انسانی زندگی کا لازمی جزو ہے---کوئی کہانی سن کر سوتا ہے تو کوئی کہانیوں کی سی زندگی جیتا ہے---کوئی بنتا ہے تو کوئی سنتا ہے۔

کچھ کہانیاں رسالوں کی زینت بنتی ہیں---اور کچھ بمشکل اخبار کے کسی کونے میں جگہ بنا پاتی ہیں کچھ کاغذ کے صفحوں پہ اتر آتی ہیں اور کچھ کو صفحوں پر اترنے کی سعادت کے باوجود ردی کی ٹوکری نگل لیتی ہے---ان سب سے ہٹ کر کچھ کہانیاں ’’ان کہی‘ ‘ان سنی رہ جاتی ہیں---کسی آہٹ کی آس میں جیتی---کسی آنکھ کے آنسو میں ٹھہری---کسی ہونٹ کی چپ میں پھڑ پھڑاتی---ان کہی---ان سنی کہانیاں---اس کی کہانی بھی ایسی ہی تھی---

کہنے کو وہ ایک لڑکی تھی جیسی بہت سی کہانیوں میں ہوتی ہیں---لیکن ادھوری لڑکی---اس نے جب دنیا میں آنکھ کھولی تو اس کا استقبال عام بچوں سے ہٹ کر ہوا---لیکن اسے معلوم ہی کب تھا کہ ’’عام بچوں‘‘ اور اس کے استقبال میں کیا فرق تھا؟ اس نے دنیا میں آنکھ کھولی اور رو کر اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہا تو اس کی دنیا کو خوش آمدید کہتی پکار پر سب رو پڑے---اسے لگا یہ خوشی کے آنسو ہیں---لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اسے خوشی اور غم کے آنسوؤں میں فرق پتہ چلا---اور پھر وہ آنسو ’’غم کے آنسو‘‘ جیسے اس کی ماں کی آنکھ کا لازمی جزو بن گئے---اسے اپنے اردگرد موجود دوسرے بچوں سے الگ ہونے کا احساس بہت دیر سے ہوا---اس کی ٹانگیں اس کے جسم کا بوجھ اٹھانے سے قاصر تھیں .. لیکن ماں ہمیشہ اسے دوڑنے کے سپنے دکھاتی---اس کی ماں نم آنکھوں کے ساتھ اس سے ڈھیروں باتیں کرتی---اور آخر میں کہتی ’’میں بھی جھلی ہوں---تجھے بھلا میری باتیں بھلا کب سمجھ آتی ہیں---لیکن میں کیا کروں---میں کسی اور سے یہ باتیں نہیں کر سکتی---دیکھنا ایک دن تو اٹھ کے چلنے لگے گی---اڑنے لگے گی---باتیں کرنے لگے گی---اس دن میری ممتا جیت جائے گی---‘‘ اپنی عمر کے دوسرے بچوں کے برعکس وہ ماں کی باتوں کے جواب میں بستر پر لیٹی ہاتھ پاؤں چلاتی تو ماں کی باتوں سے اسے لگتا کہ ابھی اس کے بازو پنکھ کا روپ دھاریں گے اور وہ اڑنے لگے گی---وہ ماں کو بتائے گی کہ وہ سب سمجھتی ہے---ماں کے دکھ سمجھتی ہے---لیکن یہ

اس کی خام خیالی تھی۔۔۔ وہ دن کبھی نہیں آیا اور نہ کبھی آنا تھا۔۔۔

جب اس کے چلنے کا وقت آیا تو اسے چار پہیوں والی گاڑی پر ڈال دیا گیا۔۔۔ وہ دنیا والوں کے مطابق ذہنی اور جسمانی طور پر معذور تھی۔۔۔ وہ چلنے اور بولنے سے قاصر تھی۔۔۔ دنیا والے اس کی کمیاں گنواتے اور اٹھتے بیٹھتے اس کی ماں کو کوستے یہ بھول گئے کہ بھلے ہی وہ بول نہیں سکتی لیکن سب سنتی ہے۔۔۔ سب دیکھتی ہے۔۔۔ اور خوش قسمتی سے یا شاید بدقسمتی سے عام لوگوں کی طرح سینے میں گوشت پوست کا ایک ٹکڑا رکھتی ہے۔۔۔ جسے دل کہتے ہیں۔۔۔ وہ دل دھڑکتا ہے۔۔۔ محسوس کرتا ہے۔۔۔ دکھتا ہے۔۔۔

ایک ماں تھی جو اس کے لیے لڑتی تھی۔۔۔ اس کے الفاظ بن کہے پڑھ لیتی۔۔۔ ماں "سپیشل سکول" میں اس کے داخلے کے لیے بہت لڑی۔۔۔ لیکن اس کے لیے لڑی جانے والی ہر لڑائی کی طرح یہ لڑائی بھی ہار گئی۔۔۔ اور بہتری کی واحد امید بھی دم توڑ گئی۔۔۔ سو یوں ہی خاموش، بے جان وہیل چیئر پر بغیر کسی "بہتری" کے زندگی کی گاڑی سرکنے لگی۔۔۔ اور عمر اٹھارہ کا ہندسہ عبور کر گئی۔۔۔ تو ماں کو نئی فکر لاحق ہوئی۔۔۔ اس کی شادی کی۔۔۔ نجانے مائیں اتنی خوش فہم کیوں ہوتی ہیں۔۔۔؟ پتہ نہیں کیسے کیسے خواب سجا لیتی ہیں۔۔۔؟ وہ جو ماں کی دی زندگی جیتی۔۔۔ ماں کی آنکھوں سے خواب دیکھتی تھی۔۔۔ ماں کی تھمائی امید کے سہارے یہ خواب بھی آنکھوں میں سجا بیٹھی۔۔۔ گو کہ جانتی تھی کہ اس خواب کے مقدر میں بھی ٹوٹنا لکھا ہے۔۔۔ لیکن دیکھنے میں کیا مضائقہ تھا۔۔۔ سو چار آنکھوں میں سوتے جاگتے نئی زندگی کا خواب پنپنے لگا۔۔۔ اور یوں ایک نئی اذیت کا آغاز ہوا۔۔۔ آنے والے گھر سنبھالنے کے لیے ایک سو ایک خوبیوں والی بہو۔۔۔ بھابی ڈھونڈنے کی ٹوہ میں آتے۔۔۔ لوازمات پہ ہاتھ صاف کرتے۔۔۔ اس کی ماں کی شبانہ روز محنتوں سے سکھائے گھرداری کے پیچیدہ پیچیدہ کاموں میں ہزار نقص نکالتے اس کی ذات میں نئی کمیاں گنواتے منہ کے زاویے بگاڑتے رخصت ہو جاتے۔۔۔ اور وہ جو مہمانوں کی آمد سے پہلے ماں کو گھن چکر بنے گھر میں دوڑتے تیاریاں کرتے دیکھتی تھی۔۔۔ رات لحاف میں ماں کی دبی دبی سسکیاں سنتے خود بھی رو پڑتی۔۔۔ اور سوچتی کہ "کاش وہ اپنی ذات سے ماں کو کوئی خوشی۔۔۔ کوئی راحت کا لمحہ دے پائے۔۔۔" لیکن اذیتوں کا سفر طویل ہونے لگا۔۔۔

اور پھر ایک دن ایسا طلوع ہوا جس کا آغاز بہت سے عام دنوں کی طرح عام سا تھا۔۔۔ اسے دیکھنے کچھ "نئے" لوگ آئے تھے۔۔۔ اور اسے دوسری منزل سے سیڑھیوں کے ذریعے نیچے جانا تھا۔۔۔ سیڑھیاں اترنا وہ واحد موقع ہوتا جب وہ وہیل چیئر سے الگ ہوتی۔۔۔ ماں اپنی معصومانہ موہوم امید کے سہارے ہر روز اس کا پہلا قدم خود اٹھنے کا انتظار کرتی۔۔۔ اور امید ٹوٹنے پر اسے سیڑھیوں سے دو لوگوں کی مدد

سے نیچے لے کر جاتی تھی ---

وہیل چیئر گھسیٹتی وہ سیڑھیوں تک آ گئی۔ اسے ماں کا انتظار کرنا تھا ---لیکن جانے اس کے دل میں کیا سمایا ---اس نے بازو پھیلائے اس یقین کے ساتھ کہ وہ اڑنے لگے گی ---اس نے پوری قوت سے خود کو آگے کی جانب دھکیلا ماں کی باتیں سچ ہونے لگیں ---بازو کھلے جیسے پنکھ پرواز کے لیے کھلتے ہیں ---پہلی سیڑھی سے اوپر آنے کا ارادہ کرتی ماں نے حیرت سے اسے دیکھا ---اور جب تک وہ کچھ سمجھ پاتی گوشت کا وہ وجود قلابازیاں کھاتا چند لمحوں میں ماں کے قدموں میں ڈھیر ہو چکا تھا ---وہ اڑی لیکن یہ پرواز مختصر تھی ---پہلی اور آخری پرواز ---وہ بولی ---اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی ---پہلی اور آخری چیخ ---ماں کا خواب پورا ہوا ---اس نے ایک الوداعی نظر ماں پر ڈالی اور آسودگی سے آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆☆

امتیاز احمد

برفی

یہ خوشی کی بات تھی یا پھر اس کی دنیا لٹ چکی تھی؟ لوگ اس کے ساتھ اظہار افسوس کر رہے تھے، بظاہر محمد شریف بھی ان کا ساتھ دے رہا تھا لیکن دل ہی دل میں وہ اللہ کے سامنے سجدہ ریز تھا۔ نا جانے کیوں وہ متاع زندگی لٹانے کے بعد خود کو دنیا کی فکروں سے آزاد محسوس کر رہا تھا۔ یہ راز اس پر آج کھلا تھا کہ فکریں ان چیزوں کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں، جن کو ہم اللہ کی نعمتیں سمجھتے ہیں، جن کی خاطر ہم تیز آندھی کی ساتھ اڑنے والے ہزاروں کاغذوں کی طرح بستیوں سے نکل کر بیابانوں اور ویرانوں کی طرف سفر کرتے رہتے ہیں۔ یہ حقیقت شریف پر آج کھلی تھی کہ خواہشوں اور ضرورتوں کے ریتلے راستے اُسے اُس صحرا میں لے آئے تھے، جس کی گلیاں قبر کے بند اور اندھیرے کمروں میں آ کر ختم ہوتی ہیں۔

جیسے ہی قبر پر مٹی ڈالی جا رہی تھی، شریف کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے سر کا بوجھ ہلکا ہوتا جا رہا ہے۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جسے صدیوں سے یہ منوں مٹی اس نے دیمک لگے شہتیروں کی طرح اپنے کمزور اور لاغر کندھوں پر اٹھا رکھی تھی۔ برسوں سے یہ بوجھ اس کے سر پر تھا۔ شریف سارا دن مزدوری کرتا، جون جولائی کی سخت دھوپ میں تین منزلہ عمارتوں تک سولہ سولہ اینٹیں دابڑے میں ڈال کر لے جاتا، ہر روز شام کو سیمنٹ، بجری، ریت، گاڈر اور پھٹے اٹھانے کا بوجھ ختم ہو جاتا لیکن یہ عجیب بوجھ تھا، نہ دن کو ہلکا ہوتا نہ رات کو۔ ہر رات کسی حقے میں جلتے بجھتے کوئلے کی طرح شریف کی آنکھیں گھنٹوں نیند کا انتظار کرتیں لیکن دماغ اپنی ہی جمع تفریق میں مصروف رہتا۔ جہیز کہاں سے آئے گا؟ لال گوٹے والا سوٹ، ٹرنک، بستر، کھیس، سلائی کی مشین، ایسی درجنوں چیزیں گھنٹوں تک کسی درزی کی قمیض کے ساتھ لٹکے ہوئے رنگ برنگے دھاگوں کی طرح اس کا پیچھا کرتی رہتیں۔

پچھلے سال نکلنے والی کمیٹی سے ابھی تک ایک چھت والا پنکھا اور ایک ڈنر سیٹ ہی تو خرید پایا تھا، باقی سامان کیسے بنے گا۔ کوثر کو کہا بھی تھا کہ ڈنر سیٹ نہ خریدو، فضول خرچی کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ اس کی جگہ رضائیاں بنالی ہوتیں تو زیادہ اچھا رہتا لیکن آج کل کی اولاد تو ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتی ہے۔ جتنا چاہے سمجھا لو، مرضی آخر کار ان کو اپنی ہی کرنا ہوتی ہے۔ سردیوں، گرمیوں، بادلوں، ہوا، آندھی سے بے نیاز شریف

کی ہر رات ایسے ہی سوالوں کے ستاروں سے سجی رہتی اور وہ گھنٹوں تک کسی سرکاری سکول میں چوتھی جماعت میں پڑھنے والے بچے کی طرح ان کو گنتا رہتا۔

قاری صدیق ابھی فجر کی نماز سے پہلے درود وصلوۃ پڑھ رہا ہوتا کہ شریف کی آنکھ کھل جاتی۔ چارپائی پر لیٹے لیٹے موٹی موٹی بلغمی تھوکیں دائیں بائیں پھینکنا شریف کے لیے ایسا ہی ضروری فعل تھا، جیسے قاری صدیق کے لیے اذان دینا۔ کوثر روزانہ جھاڑو دیتے ہوئے دبے دبے لفظوں میں کہتی کہ ابا پورے صحن کو گندا نہ کیا کر۔ بلغمی تھوکیں ایک ہی جگہ پھینکا کر۔ ابا روزانہ "اوٹھیک ہے" کی ہلکی سی آواز نکالتا اور یوں کبھی نہ ختم ہونے والا یہ فعل اس دن کے لیے ختم ہو جاتا۔ شریف اندھیرے کی نمازیں ہمیشہ گھر پر ہی پڑھتا۔ اندھیرے میں اسے ہمیشہ اس خزانے کے لٹنے کا ڈر رہتا، جس کو وہ خود کسی کی جھولی میں ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ نمازیں مسجد میں پڑھنے کے بجائے بیٹی کی حفاظت کو اولین فریضہ سمجھتا تھا اور اپنے اس فریضے کی ادائی میں اس نے آج تک کوتاہی نہیں کی تھی۔ شریف کام پر جانے سے پہلے چولہے سے چار گز کے فاصلے پر بیٹھ کر اپنے موٹے موٹے تھوکوں کی صورت میں مرغیوں اور چوزوں کو غذا فراہم کرتا رہتا، جبکہ کوثر ابا کے لیے ڈالڈا گھی میں تلے ہوئے پراٹھے بنانے میں مصروف ہو جاتی۔

چوڑے سینے اور سپاٹ چہرے والا مستری یوسف شریف کا پرانا دوست تھا۔ شریف جب بے روزگاری کے مارے اپنا آبائی گاؤں نیازپور چھوڑ کر نوشہرہ ورکاں آیا تھا، تو اس کی پہلی دیہاڑی مستری یوسف کے ساتھ ہی لگی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ سرخ گالوں والا مستری یوسف، ٹھیکیدار یوسف کہلانے لگا لیکن شریف اپنے عہدے پر ہی فائز رہا۔ شریف نے کئی بار سوچا کہ وہ بھی مزدوری چھوڑ کر مستریوں کا کام سیکھ لے لیکن اس کے لیے اسے کسی کی شاگردی اختیار کرنا پڑتی اور شاگرد ہمیشہ مفت میں کام کرتے تھے، جو شریف کے لیے ناممکن تھا۔ ٹھیکیدار یوسف کی جب بھی لین دین پر اپنے بھائیوں سے لڑائی ہوتی تو وہ شریف ہی کو ساری داستانیں سناتا تھا اور شریف اس کی ہر ناجائز بات پر بھی یہی کہتا تھا کہ قصور تمھارے بھائیوں کا ہے اور شاید یہی وجہ تھی کہ شریف اسے اچھا لگتا تھا۔ مستری یوسف کو جہاں بھی ٹھیکہ ملتا وہ شریف کو مزدوری کے لیے اپنے ساتھ لے جاتا۔ جن دنوں یوسف کو کام نہ ملتا شریف بھی بس گھر ہی پڑا رہتا۔ اس کو معلوم تھا کہ وہ کسی اور ٹھیکیدار کے ساتھ کام نہیں کر سکتا۔ اس کو تو ہر آدھے گھنٹے کے بعد سگریٹ کے وقفے کی ضرورت ہوتی تھی۔ برسوں سے گاؤں کے کچے پکے راستوں پر چلنے والے تانگے کی طرح اس کی ہڈیاں بھی ڈھیلی پڑ چکی تھیں۔ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر جب بھی وہ اٹھتا اس کی ہائے ضرور نکلتی۔ کے ٹو سگریٹ کی چار روپے والی ڈبیا اس کا آخری سہارا تھی، انتہائی کڑوے تمباکو والے سگریٹ کے لمبے لمبے کش اس کے لیے آکسیجن کا کام کرتے تھے۔ لاہور کے گنگا رام

ہسپتال کی ایمرجنسی وارڈ میں داخل کینسر کے مریض کی طرح اُسے پکا یقین تھا کہ جس دن وہ آکسیجن بھرے سگریٹ چھوڑ دے گا، اسی دن اس کی موت واقع ہو جائے گی۔

شریف آج پھر کام سے گھر واپس آتے ہوئے صدیق حلوائی کی دکان سے آدھ کلو برفی لایا تھا۔ کوثر دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ آج پھر اسے کوئی دیکھنے کے لیے آ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی بے بسی اور غم تھا، بالکل ویسا غم جیسا کسی میلے میں ماں سے جدا ہو جانے والے تین سالہ بچے کی آنکھوں میں ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں وہ ماں کے گلے لگ کر اور ہچکیاں باندھ کر رونا چاہتی تھی، پتہ نہیں کیوں وہ پاؤں زمین پر رگڑتے ہوئے کوئی بات منوانا چاہتی تھی۔ کوثر دس برس کی تھی کہ اس کی ماں دمے کی بیماری کی وجہ سے چل بسی۔ تب سے لے کر آج تک ہزاروں ایسی راز و نیاز کی باتیں تھیں، جو اس کے دل کے قبرستان میں دفن تھیں اور یہ ساری باتیں وہ رو رو کر اپنی ماں کو بتانا چاہتی تھی۔ ماں کی وفات کے بعد اس کا کئی بار دل چاہا کہ وہ ابا سے کہے وہ بالیاں لینا چاہتی ہے لیکن نہ کہہ سکی اس کا کئی بار دل چاہا کہ وہ پلاسٹک کی پھولوں والی چپل کے بجائے تلے والی جوتی پہنے مگر وہ خاموش ہی رہی، اس نے کئی بار سوچا کہ چھوٹی عید پر فیروزی کپڑوں کے ساتھ میچنگ والی فیروزی چوڑیاں پہنے لیکن ایسی عید کبھی بھی نہ آئی۔ اب تو بھولے سے بھی کوئی خواہش اس کی زبان پر نہیں آئی تھی۔ شاید مقدروں کا کھیل اُسے سمجھ آ چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اور اس کا ابا مل کر بھی ستارے نہیں گن سکتے۔ وہ جانتی تھی کہ ابّا کو رات بھر نیند کیوں نہیں آتی، ابّا کے سفید بالوں اور کیکر کی لٹکی ہوئی سخت ٹہنیوں کی طرح جھکے ہوئے کندھوں کی وجہ شاید وہ جان چکی تھی۔ اُسے پتہ تھا کہ کوے روزانہ منڈیر پر بیٹھ کر اسے کیا پیغام دیتے ہیں۔ وہ جان چکی تھی کہ ابّا جس خزانے کی حفاظت پر مامور ہے، اس کی چوری کے لیے کوئی بھی نہیں آئے گا۔

کبھی کبھی کوثر ماں کے بارے میں سوچتی تو اسے وہ دن بھی یاد آتے، جب اماں اپنے ہاتھوں سے سرمے کی لمبی لمبی سلائیاں اس کی آنکھوں میں ڈالتی تھی۔ کوثر کو آج تک وہ دن بھی نہیں بھولا، جس دن ماں اس کے لیے ایک روپے کا جامنی رنگ والا ہیئر پین لے کر آئی تھی۔ اس دن وہ کس قدر خوش تھی۔ ہر دو منٹ بعد پلاسٹک کے فریم میں جڑے ہوئے چھ روپے والے شیشے میں اپنے بال اور چہرہ دیکھتی اور پھر اپنی سہیلیوں کے ساتھ اسٹاپو کھیلنا شروع کر دیتی۔ اس دن کتنی چمک تھی کوثر کی آنکھوں میں۔ لیکن آج اس کی آنکھوں میں دسمبر کی دھندلی، ٹھنڈی اور یخ بستہ راتوں جیسی خاموشی اور اندھیرا تھا، جن سے کبھی کبھار کوئی پتھریلا آنسو گرتا تو پتہ چلتا کہ ان میں کوئی رہتا ہے اور ان خشک آنکھوں کا یہ مکین بھی کوثر کے مہرون رنگ کے کوکے تک پہنچتا پہنچتا دم توڑ دیتا۔ وہ ایک ہی ڈرامے کا ایک ہی سین پچھلے سات برسوں سے دیکھتی آ رہی تھی۔ شاید اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس ڈرامے کا کوئی منطقی انجام نہیں ہے۔ شاید وہ مقدروں کا کھیل سمجھ چکی تھی۔

شریف نے کھنگارتے ہوئے موٹا سا بلغمی تھوک دیوار پر پھینکا، یہ لے دھیئے مٹھائی رکھ لے، آج میرے کچھ جاننے والے آرہے ہیں اور تم بھی منہ پر ٹھنڈے پانی کے چار چھینٹے مار لو، مہمان ایسے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ کوثر نے اخبار کا بنا ہوا کاغذی لفافہ پکڑتے ہوئے بوڑھے باپ کی سیاہ و سفید داڑھی اور سلوٹوں والے چہرے پر نظر ڈالی اور جی ابا جی کہہ کر خاموش ہو گئی۔ وہ ابے کو بتانا چاہتی تھی کہ اندر سے یہ مٹھائی کتنی کڑوی ہے، وہ بتانا چاہتی تھی کہ صدیق حلوائی اس میں میٹھا نہیں کڑواہٹ ڈالتا ہے اور جو کوئی بھی کھاتا ہے، اسے پسند کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ پتا نہیں اسے کس چیز نے روکا ہوا تھا اور وہ خاموش ہی رہی۔

شریف نے اپنی میلے سے آسمانی رنگ والے کرتے کی بغل والی جیب سے کے ٹو سگریٹ کی ڈبیہ نکالی، سگریٹ منہ میں رکھتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے پیالی بناتے ہوئے ہاکی ماچس کی تیلی سے سلگایا اور نیم کے درخت کے نیچے پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ کر لمبے لمبے کش لگانے لگا۔ برسوں سے بارش اور دھوپ میں پڑی رہنے والی یہ میلی کھسیلی چارپائی شریف کا وزن بھی خاموشی سے برداشت نہ کر پائی اور ایک دم شریف کی ہڈیوں کی طرح اس سے بھی چوں چراں کی کئی آوازیں نکلی، شریف کے بیٹھتے ہی اس پر پڑی چڑیوں کی سوکھی ہوئی بیٹھیں الٹ بازیاں کھاتی ہوئی اس کے بے ترتیب انگلیوں والے پیروں کے قریب اکٹھی ہو گئیں۔ لیکن شریف ان چھوٹی چھوٹی چیزوں سے بے نیاز لمبے لمبے کش لینے اور گرمی دور کرنے میں مصروف رہا۔ آج واقعی بڑی گرمی تھی۔ آج اسے کئی بار کام چھوڑنا پڑا، وہ تو اللہ بھلا کرے یوسف مستری کا، جو یاری بیلی میں کام پر ساتھ لے جاتا، ورنہ آج کل بوڑھوں کو کون کام دیتا ہے۔ ابا کوئلے سے چلنے والی ٹرین کی طرح کبھی ناک اور کبھی منہ سے دھواں نکالتا رہا اور کوثر نیم کے گرے ہوئے تیکھے نیبوں والے پتوں کو گم سم دیکھتی رہی۔

کوثر اس دن کتنی خوش تھی، جب پہلی مرتبہ اس کا رشتہ دیکھنے کے لیے کچھ لوگ آرہے تھے۔ مہمانوں کے آنے سے ایک دن پہلے اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ گھر کے بیرونی دروازے کے کلیجی رنگ کے پردے سے لے کر چارپائیاں تک اس نے دھو ڈالی تھیں۔ نلکے اور غسل خانے کی لال رنگ کی اینٹوں والا پکا فرش رگڑ رگڑ کر صاف کیا تھا۔ ٹوٹی نالیوں والی تنگ گلی میں کھلنے والے داخلی دروازے کے سامنے لگی سرکاری اینٹیں بھی باقی گلی کی اینٹوں سے الگ نظر آ رہی تھیں۔ ساری رات خوشی کے مارے اسکی آنکھوں نے ایک پل کے لیے بھی سونا گوارا نہ کیا تھا۔ اس رات اس نے کیا کیا نہیں سوچا تھا۔ میں کل کونسے کپڑے پہنوں گی۔ پچھلی عید پر نیلے رنگ کے پھولوں والا، جو کاٹن کا سوٹ لیا تھا، وہ ٹھیک رہے گا۔ اس پر لیس بھی تو لگی ہوئی ہے اور ابھی نیا ہی تو لگتا ہے۔ پتہ نہیں میرے وہ دیکھنے میں کیسے ہوں گے۔ میں ان کے ساتھ ساتھ چلوں گی تو بھلا کیسی لگوں گی۔ میرا قد بھی تو ان سے بڑا نہیں ہونا چاہیے، بھلا لمبی قد والی لڑکیاں چھوٹے قد والے لڑکوں کے ساتھ کہاں جچتی

ہیں۔ شادی والے دن لال رنگ کے گوٹے والے سوٹ کے ساتھ سلمہ ستاروں والا دوپٹہ ٹھیک رہے گا۔ اور لال رنگ کی سرخی بھی تو لینی پڑے گی۔ رضیہ کو ساتھ لے کر بازار جاؤں گی۔ مجھے تو کچھ کہتے ہوئے بھی بہت شرم آئے گی۔ پہلی رات وہ مجھے منہ دکھائی پتہ نہیں کیا دیں گے۔ اگر دو ماشے کا سونے والا لاکٹ ہو تو پورے محلے کی لڑکیوں کو بتاؤں گی۔ اگر میری بچی ہوئی تو میں اسے ضرور فیروزی رنگ کے سوٹ کے ساتھ میچنگ والی چوڑیاں ہی لے کر دوں گی اور عید پر تو اسے ہیل والی جوتی ضرور لے کر دوں گی۔ یہ پلاسٹک کی چپل بھی بھلا کوئی عید پہ پہنتا ہے؟ آغاز اور انجام سے بے نیاز اسی طرح کے ہزاروں خیال اس کے ذہن میں آئے تھے۔ اس روز اس کی پکی سہیلی رضیہ خاص طور پر اسے مہندی لگانے آئی تھی۔ اس رات دیر تک وہ دونوں آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے کان میں کچھ راز کی باتیں کرتی اور پھر ہنستی رہی تھیں۔ لیکن آج تو رضیہ بھی نہیں تھی، جو اسے مہندی لگاتی اور راز کی وہ باتیں کرتی، جو صرف دو سہیلیاں ہی ایک دوسرے سے کر سکتی ہیں۔ رضیہ کی شادی کو بھی دو سال بیت چکے تھے لیکن کوثر کی خواہشوں نے ابھی بھی اپنے خیالوں اور کیکر کے دروازے کی دہلیز سے باہر قدم نہیں رکھا تھا۔ اسے دیکھنے کے لیے درجنوں مہمان آئے لیکن صدیق حلوائی کی مٹھائی کا جادو کسی پر نہ چل سکا۔ کسی کو گھر اچھا نہ لگا تو کسی کو لڑکی پسند نہ آئی، کسی کو برادری میں منہ دکھانے کے لیے جہیز چاہیے تھا تو کسی کو آٹومیٹک واشنگ مشین کی شدید ضرورت تھی، کسی کو ہمسائے اچھے نہ لگے اور کسی کو تنگ گلی میں بارات لانے میں دشواری تھی۔

آج بھی کوثر کو یقین تھا کہ ہمیشہ کی طرح یہی کچھ ہوگا لیکن اس کے باوجود وہ اٹھی اور بغیر صابن کے منہ ہاتھ دھونے چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد چوٹیا بنا کر واپس آئی اور اپلوں کی جان لے لے کر سیاہ ہو جانے والے مٹی کے چولہے کے سامنے دوبارہ بیٹھ گئی۔

محمد شریف بھی اٹھا اور نلکے سے پانی نکال کر ہاتھ منہ دھونے لگا۔ شریف کے ہاتھوں اور بانہوں کے سنہری بال اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ کڑکتی دھوپ میں مستریوں کے ساتھ وہ ایک عرصے سے کام کر رہا ہے۔ اس نے سرمئی رنگ کی میلی کچیلی تہمد کو ایک ہاتھ سے تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور مٹی سے اٹے ہوئے پیروں کو فرش پر لگی اینٹوں کے ساتھ رگڑ رگڑ کر دھونے لگا۔ اس کی ایڑیوں میں ایسی دراڑیں پڑ چکی تھیں، جیسے زلزلہ آنے کے بعد کچے مکانوں کی دیواروں میں پیدا ہو جاتی ہیں۔

مغرب کی اذان کے بعد شریف نماز پڑھ رہا تھا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، وہ سمجھ گیا کہ کون ہو سکتا ہے۔ شریف نے فورا سلام پھیرا اور دروازے کا کواڑ کھولنے کے لیے بھاگا۔ شریف اندر سے پکا مسلمان تھا۔ اس نے کبھی بھی نماز نہیں توڑی تھی لیکن اس مرتبہ معاملہ کچھ اور تھا۔ مہمانوں کی خاطر مدارت کرنا تو آخر ضروری

ہوتا ہے ۔ وہ آدھا کلو مٹھائی بھی تو لایا تھا ۔ آدھے گھنٹے بعد مہمان رخصت ہوئے تو شریف ٹوٹی ہوئی پلاسٹک کی چپل پہن کر گلی کی نکڑ تک انھیں چھوڑنے کے لیے بھی گیا ۔

چائے کی پیالیاں سمیٹتے ہوئے کوثر کی نظریں ان پر بنے ہوئے رنگ برنگے پھولوں پر جمی رہیں ۔ ابا ان لوگوں سے کہو کہ وہ اب ہمارے گھر پر نہ آیا کریں ۔ آج کوثر میں اتنی ہمت پتہ نہیں کہاں سے آئی تھی ۔ وہ تو ابا کے سامنے کبھی بولی ہی نہیں تھی ۔ وہ تو اسے بے ادبی سمجھتی تھی، جہنم کا سامان سمجھتی تھی ۔ آج پتہ نہیں وہ کیوں یہ بے ادبی کر رہی تھی ۔ کیا وہ دوزخی ہونا چاہتی تھی؟ اپنی آخرت کو بھلا ایسے کون خراب کرتا ہے؟

دھیئے ایسا نہیں کہتے، مہمان تو رب سچے کی رحمت ہوتے ہیں ۔ اس طرح کہنے سے اللہ جی ناراض ہوتے ہیں ۔ منہ سے نکلی ہوئی بات کسی وقت بھی قبول ہو سکتی ہے ۔ لیکن شاید یہ قبولیت ہی کی گھڑی تھی ۔

کوثر کو پتہ چل چکا تھا کہ ابے کو نیند کیوں نہیں آتی اور ڈنر سیٹ خرید کر اس نے کتنی بڑی غلطی کی تھی ۔

کوثر کی چارپائی ابا سے تو قریب تھی لیکن وہ باتیں اپنی اماں سے کر رہی تھی ۔ آج وہ اپنی اماں کے گلے لگ کر سارے دکھڑے سنا رہی تھی ۔ آج واقعی قبولیت کی گھڑی تھی کہ اسے گندم میں پڑی گولیاں صدیق حلوائی کی برفی سے زیادہ میٹھی لگی تھیں ۔

☆☆☆☆

نین الٰہی میمن

محبت کو رخصت کر دیا

اس نے اپنی آنکھوں کو سکیڑا، اس کے چہرے پر زیست کی کہانیوں کے کئی عکس آئے اور گئے، ماتھے کی شکنیں مزید گہری ہو گئیں۔ پھر جب کچھ دماغ میں نہ آیا تو اس نے یادداشت کی الماری کا تالا کھولا اور در وا کیا۔ اس نے اس الماری میں موجود فائلوں کے انبار کی طرف نگاہ کی تو تمام فائلوں کو سالہا سال کی گرد نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس چادر کی اوٹ میں چھپ کر وقت کی دیمک نے نہ جانے کتنی یادداشتوں کی فائلوں سے اپنا پیٹ بھرا تھا۔ وہ بار بار مطلوبہ فائل تلاش کرنے کی کوشش کرتا۔ ایک ایک فائل اٹھاتا گرد جھاڑتا، فائل کھولتا اس کے فرنٹ پر فائل کی ہر یادداشت کا نام پڑھتا صفحات پڑھتا پھر اسے پھینک کر دوسری پھر تیسری نہ جانے اس نے کتنی ہی فائلیں چھانٹ ڈالیں۔ کچھ فائلوں کے عنوان تو وہ پڑھ لیتا تھا مگر کچھ کے عنوان دیمک نے چاٹ لیے تھے جس سے انھیں پڑھنا مشکل ہو جاتا۔ وہ بار بار فائلوں کو اِدھر سے اُدھر رکھتا لیکن وہ اس مطلوبہ فائل کو تلاش کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔ تھک جاتا تو سر پکڑ کر بیٹھ جاتا۔ تھوڑی دیر بعد پھر سے سعی کرتا۔ اب کی بار اس نے ایک آخری کوشش کی۔ فائلوں کے انبار کو ٹٹولا، اچانک اس کی نظروں کے سامنے ایک فائل آئی تو اس کی نظر فائل کے عنوان کے لفظ ''را'' پر پڑی تو اس فائل کو الگ کیا اسے جھاڑا۔ دل ہی دل میں بار ہا دوہراتا رہا ''را''، ''را'' مگر اس کی ہر کوشش بے سود چلی جاتی تھی۔ وہ ''را'' کے ساتھ مختلف حرف ملا رہا تھا۔ آخر کار اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا ''آرا'' اور بے ساختہ زبان پر ''جہاں آرا'' کا نام آ گیا۔ جہاں ۔۔۔ آرا ۔۔۔ اور آنکھوں سے لاوا اُبل پڑا دھڑکنیں بے ربط ہو گئیں اور زمین نے پاؤں پکڑنے سے جیسے صاف انکار کر دیا ہو۔ وہ ایک دم صوفے پر دھڑام سے گر گیا۔ کچھ دیر کے لیے اس پر سکتے کی کیفیت طاری ہو گئی۔ آنکھیں جامد ہو گئیں۔ ہونٹ برف کے گالوں کی طرح سرد ہو گئے جو کچھ بولنے اور کہنے کی صلاحیت کھو چکے تھے۔ کافی دیر بعد وہ اپنے دوران خون کو نارمل کرنے کے بعد بولا۔

جہاں آرا تو کیا تم جہاں آرا ہو۔ پھر اپنی آنکھوں کو سکیڑ کر جہاں آرا کی طرف دیکھ کر حتمی انداز سے بولا:

ہاں تم جہاں آرا ہی ہو۔ ہاں ۔۔۔ ہاں! میں جہاں آرا ہی ہوں۔

اس کے بعد کتنے ہی لمحے گزر گئے وہ دونوں خاموش رہے اتنے خاموش کہ دونوں کے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ پھر اس نے خاموشی کا قفل توڑا اور مدھم سی لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا؟

جہاں آرا تم کہاں چلی گئی تھیں؟

تمھاری زندگی سے دور کیوں کہ اگر میں ایسا نہ کرتی تو ہم دونوں کے لیے مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔

تمھاری شادی کے بعد میں کینیڈا چلی گئی تھی۔ وہاں اپنی تعلیم مکمل کی۔ خود کو پاؤں پر کھڑا کیا۔ اب ایک سپر سٹور چلاتی ہوں۔ پاکستان اپنے رشتے داروں سے ملنے آئی تھی۔ میں نے تمھیں دیکھا اور اب یہاں ویٹنگ روم میں ایک ساتھ۔ بائی دا وے آپ اکیلے جا رہے ہیں؟ آپ کی مسز؟

اس کا پانچ سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔

اوہو! آئی ایم سوری۔

آپ بھی اکیلی، میرا مطلب بچے وغیرہ؟

نہیں میں نے آج تک شادی نہیں کی۔

کیوں؟

شاید محبت نے ایسا کرنے نہ دیا۔ مجھے جس انسان سے محبت تھی، وہ مجھے کسی اور طرف دیکھنے ہی نہ دیتا تھا۔ اُس نے مجھے اتنا روکا کہ مجھے اس قید خانے سے نفرت ہو گئی۔ محبت کے قید خانے سے نفرت۔ ہر رشتے سے میرا اعتبار اٹھ گیا۔ اپنی ذات بھی بری لگنے لگی۔ اپنا وجود ہی بے وقعت محسوس ہونے لگا تو میں نے اپنی زندگی سے لفظ محبت کو ہمیشہ کے لیے رخصت کر دیا۔

☆☆☆☆

وقار عثمان

دیّے سے دیا

موسم کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ بارش کو جیسے آج ہی ٹوٹ ٹوٹ کر برسنا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو ہم اس موسم سے لطف اندوز ہوتے مگر اب... اب یہ موسم ہمارے لیے عذاب بنا ہوا تھا.. اور اس کی وجہ تھی زینب... میری اکلوتی بیٹی...

ہر گزرتے لمحے کے ساتھ زینب کی طبیعت مزید بگڑتی جا رہی تھی۔ میں اور میری بیوی اپنی بیٹی کی بیماری کے باعث شدید پریشان تھے۔ اس پریشانی سے بھی بڑھ کر ایک پریشانی جو ہمیں اس وقت کھائے جا رہی تھی کہ ہم اس وقت اپنی بیٹی کے علاج کے لیے اس کو کسی بھی ڈاکٹر کے پاس نہیں لے جا سکتے تھے۔ ایک تو ہمارے پاس سواری موجود نہیں تھی۔ دوسرا موسم ایسا تھا کہ سواری ملنے کی امید بھی نہیں تھی۔ اگر کسی طرح سے ہم کوئی انتظام کر بھی پاتے، تب بھی کسی عام ہاسپٹل میں زینب کا علاج ممکن نہ تھا۔

ہماری ضرورت ڈاکٹر روبینہ جاوید سے وابستہ تھی۔ یہ ہماری بچی کی بیماری سے واقف تھیں، کیوں کہ ہم انھی سے اپنی بچی کا علاج کرا رہے تھے۔ ہمارے ذہنوں پر ایک ہی سوال سوار تھا کہ کیا وہ اب نصف رات کے وقت ہماری بچی کے لیے کچھ کر پائیں گی۔ ہر بار سوچنے پر ہمیں جواب نفی میں ہی مل رہا تھا۔ ہمارے سامنے کوئی اور راستہ بھی موجود نہیں تھا۔ میری بیوی نے ڈاکٹر صاحبہ کا نمبر ملا ہی دیا۔ مجھے یہ خدشہ تھا کہ جانے وہ کال اٹھائیں گی بھی یا نہیں... یا کہیں آگے سے ڈانٹ پلا دیں گی کہ یہ کون سا وقت ہے... جب میں نے اپنی بیوی کی ڈاکٹر صاحبہ سے فون پر ہونے والی گفتگو سنی تو تمام خدشات ہوا ہو گئے۔ فون رکھتے ہی میری بیوی خوشی سے بولی:

’’ڈاکٹر صاحبہ نے کہا ہے کہ وہ خود زینب کے چیک اپ کے لیے ہمارے گھر آ رہی ہیں...‘‘

اپنی بیوی کی بات سن کر میں پریشان ہو گیا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کنواں پیاسے کے پاس آئے۔

’’ضرور ڈاکٹر صاحبہ نے ہمیں ٹالنے کی کوشش کی ہے...‘‘ میں نے سوچا۔ مگر بہت جلد، جب میں نے اپنے گھر کے دروازے پر کار کے ہارن کی آواز سنی۔

’’ڈاکٹر صاحبہ آ گئی...‘‘ یہ کہتے ہوئے میری بیوی دروازے کی طرف لپکی۔ پھر میں نے دیکھا۔

ڈاکٹر صاحب آ گئی تھیں۔ بارش کی وجہ سے ان کا لباس گیلا تھا۔ مگر ان کے چہرے پر پرسکون مسکراہٹ موجود تھی۔ میں ششدر رہ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً سے پہلے زینب کا چیک اپ کیا اور پھر اسے ایک انجیکشن لگایا۔ انجیکشن لگنے کی دیر تھی کہ زینب پرسکون ہونے لگی۔

”میں اب چلتی ہوں... صبح زینب کو ہاسپٹل لے آنا...“

ڈاکٹر صاحب کی آواز میں شفقت تھی... پیار تھا... محبت تھی اور جھریوں بھرے چہرے پر نورہی نور تھا۔

ڈاکٹر صاحب...! آپ نے بہت تکلیف کی ہماری درخواست پر ہماری بیٹی کے لیے اس وقت تشریف لائیں ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے میری بات سن کر سر کو جھکایا اور تھوڑی سی خاموشی کے بعد سر اٹھا کر انھوں نے پرسکون لہجے میں کہا:

”بیٹا....! زندگی انسان کو جو کچھ سکھا دیتی ہے، شاید کتابوں اور درس گاہوں سے بھی سیکھنا ممکن نہ ہو۔ میری زندگی میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا اور پھر وہ کھڑے کھڑے بولتی چلی گئیں۔

میں اس وقت ایک ماں تھی۔ اب تو نانی اور دادی بھی بن چکی ہوں۔ رات کا وقت تھا۔ میرا بیٹا پیپر کی تیاری کر رہا تھا۔ صبح اس کا اسکول میں پیپر تھا۔ وہ پڑھائی کے دوران بیت الخلا جانے کے لیے اٹھا۔ چلتے ہوئے اچانک اس کا پاؤں جانے کیسے فرش پر پھسلا کہ وہ سیدھا فرش پر جا گرا۔ میں فوراً دوڑی اس کے پاس پہنچی۔ وہ خود تو الحمدللہ سلامت رہا، لیکن اس کی آنکھوں کا چشمہ ٹوٹ گیا تھا۔ اس کی نظر بہت کمزور تھی۔ جب اس نے اپنا چشمہ ٹوٹا ہوا دیکھا تو فوراً رونا شروع ہو گیا۔

”امی..! میں اب پیپر کی باقی تیاری کیسے کروں گا؟“

میں نے اسی وقت عینک کے کور پر درج عینک ساز کا نمبر ملایا اور اپنے بیٹے کی پریشانی بتا کر اس سے عینک بنا دینے کی التجا کی۔

اس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ صبح اپنے مقررہ وقت سے پہلے ایسا نہیں کر سکتے... منت سماجت کے باوجود میری بات کا اس نے ذرا اثر نہیں لیا اور اگلے دن میرا بچہ صبح پیپر دینے سے رہ گیا۔

اگر وہ عینک ساز چاہتا تو ہماری پریشانی دور کر سکتا تھا، مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس وقت مجھے عملی طور پر احساس ہوا کہ والدین جب کسی کی وجہ سے اپنے بچے کے لیے چاہ کر بھی کچھ نہ کر سکیں تو تکلیف زدہ بچے کے ساتھ ساتھ ان پر بھی کیا گزرتی ہے۔

تب میں نے عزم کیا کہ جیسے اس شخص نے ہماری تکلیف دور نہیں کی اور ہمیں بے چین رکھا۔ ایسا

میں کبھی کسی کے ساتھ نہیں کروں گی۔

ان کی بات ختم ہوئی تو میرے اندر بھی احساس کا ایک ایسا دیا روشن ہو چکا تھا جس کی بدولت میں اپنے آپ کو ہر تکلیف زدہ کے لیے ہر لمحہ ہر ممکن مدد کے لیے تیار پا رہا تھا۔ اسی کیفیت میں بے اختیار میرے لبوں سے نکلا:

‘‘اللہ کرے ایسے ہی دیے سے دیا جلتا رہے...’’ میری بات سن کر ڈاکٹر صاحبہ کی آنکھوں میں چمک عود کر آئی۔

‘‘میرے آنے کا مقصد پورا ہوا۔ آج میں اس گھر میں خوشی دے کر نہیں... اس گھر سے خوشی لے کر جا رہی ہوں...’’

☆☆☆☆

فریدہ حفیظ

فائل میں پڑے سفر

یہ جو پرانی سی گرد آلود فائل ہے اس میں دو دو تین تین ادھورے لکھے صفحات۔۔۔ وقت پر مکمل ہوتے تو سفر نامہ کہلاتے۔ اب کیا کریں انھیں کیا نام دیں۔۔۔ اور مکمل کرنا چاہوں تو کیسے۔۔۔؟ سفر نامے کے لیے تو جگہوں کے نام، جہازوں میں سفر کے دوران اڑان کے اوقات، کب کہاں اُترے؟ کہاں سے سوار ہوئے؟ یہ تو یاد ہی نہیں تھا، نہ کہیں نوٹ کیا ہوا تھا۔

ایک کاغذ پر جس کا رنگ وقت کی دھول میں زرد مٹیالا ہو چکا تھا لکھا تھا۔۔۔ ہیتھرو ائرپورٹ پر الوداع کہتے ہوئے جب نجمی نے کہا کہ باجی آپ واپس جا کر سفر نامہ تو لکھیں گی تو میں نے دل میں جانے کیوں کہا: ہرگز نہیں۔ وہ تو دنیا کے دستور کے مطابق بات کر رہی تھی اور میں ان سفر ناموں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ایک صاحب سفر نامہ سے پوچھا: آپ امریکہ میں کتنا عرصہ رہے؟ جواب دیا: صرف دو دن کا ٹرپ تھا ایک سرکاری وفد کے ساتھ جانا تھا۔ انھوں نے جھینپتے ہوئے کہا۔ مگر لگتا ہے آپ ہفتوں وہاں رہے۔ چشمِ تصور رکھنے والے کے لیے دو دن ہی کافی ہوتے ہیں۔ سیاحت کے شعبوں کا شائع کردہ ڈھیروں باتصویر میٹریل دستیاب ہوتا ہے۔ رنگ بھرنے کا ہنر لکھنے والے کا کمال ہوتا ہے۔

سفر نامہ نہ لکھیے مگر کچھ تو ضرور لکھیے گا۔ ان لوگوں کے بارے میں جن سے ملاقاتیں ہوئیں۔ مقامات اور عمارتیں تو وہی رہتی ہیں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ نجمی نے یقیناً میرے دل کی بات میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے محسوس کی۔ بات پتے کی تھی۔ ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے میں نے دل ہی دل میں دہرایا۔

پیرس سے چلتے وقت میری پیاری میزبان رفعت اور ان کے شوہر محبوب شوکت نے بھی کچھ ایسے ہی کہا تھا کہ اس قیام کے دوران جو کچھ لکھوں ان تک کیسے پہنچے گا؟ ویسے ہی جیسے میں آپ تک پہنچی۔ میں نے جواب دیا۔ یہ بھی ایک دلچسپ اتفاق تھا اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

دراصل ہوا یہ تھا کہ برسوں پہلے شکاگو سے وطن واپس آتے ہوئے حفیظ نے یہ سوچ کر کہ پھر جانے کبھی موقع ملے نہ ملے لندن، پیرس اور روم کی سیر تو کر ہی لینی چاہیے۔ اس سفر میں انقرہ بھی شامل ہو گیا تھا۔

اس وقت ان تینوں شہروں کے مشہور اور سیاحوں کی دلچسپی کے اکثر مقامات دیکھ لیے تھے۔ بلکہ ایفل ٹاور اور پیرس کے درمیان بہتے دریا کے کنارے اونچے اونچے درختوں کے نیچے رکھے ان بینچوں کو خصوصی دلچسپی سے دیکھا تھا۔ جس کا ذکر مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفر نامے ”نکلے تیری تلاش میں“ میں کیا تھا۔ جس

میں سے ایک بنچ پر وہ بیٹھے تھے اور غالباً ایک حسینہ سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ تارڑ صاحب کا یہ سفرنامہ بھی اتفاق سے میسر آیا تھا۔ وہ یوں کہ مشرق اخبار کے دفتر میں خوش قسمتی سے جس کمرے میں بیٹھنے کو جگہ ملی وہ انتظار حسین کا کمرہ تھا۔ اس میں ایک الماری تھی جس میں وہ تمام کتب رکھی تھیں جو تبصرہ کے لیے انتظار صاحب کے پاس آتی تھیں۔ اس الماری کی چابی بھی ان کے پاس تھی۔ ایک روز میں نے ان سے پڑھنے کے لیے کوئی کتاب مانگی تو انھوں نے ”نکلے تیری تلاش میں“ نکال کر دے دی۔ تو امریکہ جانے سے پہلے یہ واحد سفرنامہ تھا جو پڑھ رکھا تھا۔ سفرنامے میں جن رنگ رنگیلی تفصیلات نے متوجہ کیا تھا ان رومان پرور اور خوش گوار حادثات سے دوچار ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس لیے امریکہ کا سفرنامہ ایک ناولٹ کی صورت میں لکھا۔ جو کچھ ان ”ڈریم سٹیز“ (Dread Cities) میں دیکھا ان کے بارے میں کالم تو لکھے سفرنامہ پھر بھی نہیں لکھا۔ بعد میں بہت سفرنامے پڑھے۔ لطف اللہ کی آپ بیتی پڑھی تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ گھوڑے اور پیدل خطرناک جنگلوں میں قاتل ٹھگوں سے ان کا بچ نکلنا ایڈونچر سے بھرپور۔ یہ بہت بعد میں پڑھا پہلے پڑھا ہوتا تو کیا فرق پڑتا۔ لطف اللہ کی آپ بیتی اگر دیکھا جائے تو پوری کی پوری سفرنامہ ہے ان کی پوری زندگی انیسویں صدی کے ہندوستان کی دلچسپ، عبرت انگیز اور سبق آموز داستان ہے جو ایک عام ہندوستانی نے انگریزوں کی نوکری میں رہ کر رقم کی جسے ڈاکٹر مبارک علی نے ترجمہ کیا۔ ان کے مطابق انیسویں صدی کا وہ ہندوستان جس کا معاشرہ ایک طویل عرصے سے ٹھہرا ہوا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اپنا اقتدار پھیلا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ایک ہندوستان برطانوی علاقہ تھا کہ جہاں نوآبادیاتی نظام اپنی جڑیں مضبوط کر رہا تھا۔ دوسری طرف راجاؤں، نوابوں اور سرداروں کا ہندوستان تھا۔ نوآبادیاتی نظام اپنا منہ کھولے اس قدیم ہندوستان کو نگل رہا تھا۔ ریاستوں کو فتح کیا جا رہا تھا۔ ان پر قبضہ ہو رہا تھا۔ راجہ و مہاراجہ اور نواب، مجبوری اور لاچاری کے عالم میں ہتھیار ڈال رہے تھے۔ یہ لاچاری اسی نظام کی وجہ سے تھی جو صدیوں سے فرسودہ ہو چکا تھا۔ جسے تبدیل کرنے کی انھوں نے کوشش نہیں کی تھی۔ سائنس و ٹیکنالوجی اور فکری سوچ کی غیر موجودگی میں ان کے اسلحہ خانے میں ایسے کوئی ہتھیار نہ تھے جس سے وہ جنگ کر سکتے۔ لطف اللہ کی آپ بیتی اسی ہندوستان کی ہے جہاں ایک طرف قدیم روایات اور ادارے اپنی دلکشی کے ساتھ موجود ہیں تو دوسری طرف ان کی افادیت کے ختم ہونے کا احساس بھی ہے۔ پھر انگریزی طور طریقے، عادات اور طریق حکومت کا نقشہ بھی اس میں نظر آتا ہے۔ وہ اس ملک پر کہ جس کی حکومت ان کے ہاتھ میں تھی اسے سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہاں کی زبانیں سیکھ رہے ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ قدیم اشیا جمع کر رہے ہیں۔ ثقافت سے آگہی حاصل کر رہے ہیں۔ سندھ کے بارے میں ان معاہدات کا ذکر ہے۔ یہ معاہدے انگریز خود لکھ لیتے اور میروں کے سامنے پیش کر کے انھیں ان کی شرائط تسلیم کرنے پر مجبور کرتے۔ میرانِ حیدرآباد و سندھ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ معاہدہ ان کے حق میں نہیں۔ مگر انتہائی مجبوری اور لاچاری کے عالم میں یہ جانتے ہوئے بھی کہ

ان کے ساتھ نا انصافی ہو رہی ہے وہ اس پر دستخط کرتے ہیں۔ لطف اللہ کی آپ بیتی کے بارے میں سرسری سی تفصیلات کا ذکر اس بات نے کرنے پر مجبور کیا کہ انگریزوں کی ملازمت میں جو زیادہ تر انھیں اردو، فارسی اور مقامی زبانیں سکھانے سے متعلق تھی۔ لطف اللہ کو آئے دن ان کے ساتھ سفر کرنا پڑتا تھا۔ یوں میں ان کی آپ بیتی کو سفرنامہ زیادہ تصور کرتی ہوں۔ بہرحال لطف اللہ کی آپ بیتی کے سحر سے نکلنا دشوار ہے۔ اس لیے اسے یہیں چھوڑ کر زمانہ حال میں آتے ہیں۔ حالاں کہ یہ حال بھی ماضی میں تبدیل ہو چکا ہے۔

تو پروین عاطف نے جب فارایسٹ کے خوبصورت الف لیلائی ماحول والے ملکوں کے بارے میں سفرنامے کی دو قسطیں سنائی تھیں تو حلقۂ اربابِ ذوق والے سوچتے کہ ادب کی مستند اور سکہ بند اصناف کے مقابلے میں مباحث نامے اور سفرنامے کیوں مقبول ہو رہے ہیں۔ تب کسی نے کہا تھا کہ سفرناموں میں حقائق، مقامات اور زندگی کے تجربات سامنے آنے لگتے ہیں۔ اگر کوئی انھیں خوبی سے قلم بند کر دے تو قاری کے لیے اس میں دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ کہ بہرحال تجسس اور نئی دنیاؤں کی کھوج اور کھوجنے کا حسن اپنی جگہ ہے۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے حسن عابدی کے اوسلو جانے کی داستان پڑھ رہی تھی جو انھوں نے برسوں پہلے ''اخبارِ خواتین'' میں ''میرے سفر کی یادیں'' کے عنوان سے قلم بند کی تھی۔ اس میں انھوں نے بڑی خوبصورت باتیں کہیں۔ نامور اور منفرد افسانہ نگار غلام عباس کی بات دہرائی کہ ہر وہ شخص جو خط لکھ سکتا ہے افسانے بھی لکھ سکتا ہے اور ہر وہ شخص جو ہولڈال کے بکسوئے باندھ سکتا ہے، سفرنامے لکھنے پر قادر ہے۔ سو برسوں پہلے جو چند دن وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کے دورۂ برطانیہ اوفرانس کے وسیلے سے وہاں گزارنے کا موقع ملا، ان کا کچھ احوال اور جن دوستوں، عزیزوں، نئے لوگوں اور نئے حالات سے سامنا ہوا کچھ ان کا تذکرہ ہو جائے۔

جانے سے پہلے موڈ کی خرابی کی وجہ بھی کوئی ایسی بے جواز نہ تھی۔ عاشق کو بھی محبوب کا بہت طویل انتظار کرنا پڑے تو وہ اپنے عشق پر لعنت بھیجتا ہے اور سوچتا ہے کہ اس سے تو اچھا ہوتا کہ چین کی نیند سوتے تو انتظار کی خواری نہ ہوتی۔ یہی کچھ ہمارے ساتھ ہوا۔ مہینہ بھر تو یہی کشمکش رہی کہ جاتے ہیں یا نہیں جاتے۔ گزشتہ چند سالوں سے حالات ہی ایسے ہو گئے تھے کہ اسمبلی میں وزیرِ خزانہ بجٹ پیش کرتے ہیں، بہت سارے ٹیکس لگاتے ہیں۔ اگلے روز پریس کانفرنس میں اعلان کرتے ہیں کہ کوئی ٹیکس واپس نہیں لیا جائے گا۔ مگر ٹیکس ادا نہ کرنے کی عادی قوم (سوائے ملازمت پیشہ اور سرکاری ملازمین کے) جلسے جلوس اور ہڑتالیں کر کے وزیرِ خزانہ کو پورا بجٹ ہی واپس لینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ایسے میں وزارتِ اطلاعات یہ اعلان کرے کہ وزیراعظم کے ساتھ پریس پارٹی میں جو صحافی جانا چاہیں اپنے یا اخبار کے خرچے پر جا سکتے ہیں۔ تو پھر کس صحافی کی ہمت تھی کہ اپنی جیبِ ناتواں پر بوجھ ڈالتا وہ بھی فارن کرنسی میں۔ اور ایسے حکومتی دوروں پر ہما شما کی کیا مجال کہ وہ خود سے اپنا نام پیش کر سکے۔ یہ حق تو صرف ایڈیٹر حضرات کا ہے چاہے اپنا نام پیش کریں یا کسی اور کی سفارش کریں۔ اور ہم ان خوش نصیبوں میں سے نہیں، تو یوں جانیے کہ جمہوریت کے آنے کا اتنا فائدہ ہوا کہ

ہوائی جہاز کی مفت سواری کی دعوت ملی۔ مگر اس وقت تک اتنے بے حال ہو چکے تھے کہ ساری ایکسائٹمنٹ جاتی رہی۔ ویسے بھی ایسے سرکاری دوروں کا حصہ بننے کے بارے میں صحافتی سیانوں کا کہنا ہے کہ جب تک ہوائی جہاز فضا میں بلند نہ ہو جائے اس وقت تک یقین نہیں کرنا چاہیے کہ پریس پارٹی کی فہرست میں واقعی نام شامل ہو گیا ہے کہ پیالہ لبوں تک جانے تک راہ میں کئی لغزشیں آتی ہیں اور کبھی کبھی پیالہ ٹوٹ بھی جاتا ہے۔ تاہم جس کا اختتام بخیر ہو اس مہم کو کامیاب تصور کیا جانا چاہیے۔ تو وزیرِاعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کی طرح ہمارا دورۂ برطانیہ اور فرانس بہت کامیاب رہا۔ ویسے سربراہانِ مملکت کے کبھی دورے کامیاب ہوتے ہیں۔

اگر کوئی پوچھے کہ لندن اور پیرس میں اس بار کیا دیکھا تو ہم سوچ میں پڑ جائیں گے کہ واقعی ہم نے کیا دیکھا۔ جو پہلی بار دیکھا تھا اس کے بارے میں اس زمانے کی ٹیکنالوجی کے دور کی پیدائش کے بچے ایک بٹن دبا کر دنیا کے جس حصے کی چاہیں سیر کرا دیتے ہیں۔ اس لیے پہلی بار جو دیکھا تھا وہ کمپیوٹر کے ایک کلک کی مار ہے۔ اب جو ذرا ذہن پر زور دیا تو یوں لگا کہ بہت کچھ چاہے نہ دیکھا لیکن جو محسوس کیا وہ کتنا نیا اور کتنا خوبصورت تھا۔ جو لوگ وطن میں ساتھ رہتے ہوں اور پھر کسی موڑ پر جدا ہو گئے ہوں، وہ جب وطن سے ہزاروں میل دور ملیں تو کتنا انوکھا احساس ہوتا ہے۔ اپنائیت، محبت اور یادوں کا ایک جہان آباد ہو جاتا ہے۔

ایک بار اسلام آباد ائرپورٹ پر لاہور جاتے ہوئے فلائیٹ کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے اچانک شوخ رنگ کے لباس میں ایک سمارٹ اور چاق وچوبند خاتون سامنے سے گزر گئی۔ تو ذہن کے نہاں خانوں میں ایک بڑی بڑی آنکھوں، گھنگریالے بالوں کی دو چوٹیوں والا ہنستا چہرہ نظروں کے سامنے آیا تھا۔ یہ جولی تھی۔ یقیناً وہی تھی۔ ہم میٹرک میں ساتھ پڑھتے تھے۔ اس روز وہ تیزی سے گزرتی ہوئی میری آواز نہ سن پائی تھی۔ مگر ماضی کے بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ واضح سنائی دینے لگی تھی۔

لاہور پہنچنے تک سکول کا زمانہ ایک فلم کی طرح نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ جولی کی ہنسی کی کھنک صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس روز مجھے بیگم فرخ مختار کا بھی خیال آیا۔ فرخ سے سکول کے زمانے کے بعد اس وقت ملاقات ہوئی جب وہ ملتان سے خواتین کی مخصوص نشست پر مجلسِ شوریٰ کی رکن نامزد ہو کر آئی۔ شاید آپ کو یاد ہو مجلسِ شوریٰ ملٹری ڈکٹیٹر ضیاء الحق نے بنائی تھی۔

فرخ مختار کو دیکھ کر پھر سکول کا زمانہ سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ کتنے خوب صورت لمحے تھے۔ یہ لمحے مٹھی میں بند نہیں کیے جا سکتے۔ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسل جاتے ہیں۔ اس وقت ہاتھ بھی کتنے چکنے ہوتے تھے۔

بزنس کلاس میں صحافیوں کی ہمراہی میں جب جہاز کراچی کی زمین چھوڑ کر آسمان کی وسعتوں میں آگے بڑھ رہا تھا تو اطمینان بخش احساس نے گھیر لیا کہ واقعی میں ہم عازمِ سفر ہیں۔ اردگرد نظر ڈالی اسی عمل میں سامنے فرسٹ کلاس کے پردے کے پیچھے ایک جانی پہچانی جھلک دیکھی۔ یہ جولی ہے۔۔۔ تسنیم مجھے نام بھی یاد

آ گیا۔ میں نے پردے کے پاس جا کر اسے پکارا تو وہ چونکی اور وہ بھی حیران رہ گئی۔ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتے لمحے جگنوں کی طرح مٹھی میں آ گئے تھے اور سارا راستہ جلتے بجھتے رہے۔ پیرس کے قریب ہولی نے کہا میں تو یہیں اتر جاؤں گی تم سے اسلام آباد میں ملاقات ہوگی۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے باتیں نہ ہو سکیں۔ مجھے بہت حیرت ہوئی۔ باتیں تو ہم نے بہت کی تھیں۔ شاید باتیں ہم نے خیالوں میں کی تھیں۔ جب بھی فرصت کے چند لمحے نکال کر میرے قریب آئی۔ ایک ہم سفر سینئر صحافی نے اس خوشی سے دوچار ہونے کا موقع نہیں دیا۔ انھیں کوئی نہ کوئی مسئلہ درپیش رہتا تھا اور کچھ نہیں تو یہی کہ جہاز کے اس حصے میں ڈیوٹی پر مامور ائر ہوسٹس ان کی طرف دیکھ کر مسکراتی کیوں نہیں۔ انچارج کی حیثیت سے ہولی ان کی شکایات کے جواب میں معقول سی صفائی پیش کر دیتی۔ یہ سطریں لکھتے ہوئے احساس ہوا کہ برسوں بعد سفرنامہ لکھنے کا تجربہ کتنا انوکھا ہے۔ وہ جو ہیتھرو ائرپورٹ پر رخصتی کے وقت ننھی نے کہا تھا کہ اور کچھ نہیں تو ان لوگوں کے بارے میں لکھیے جن سے ملاقاتیں ہوئیں، باتیں ہوئیں۔ ابھی پرانے لوگ ہم سفر تھے اور سفر اختتام پذیر ہونے سے قبل ہی ان کے بارے میں دلچسپ انکشافات ہونے لگے اور آج جو میں یہ سطریں سپردِ قلم کر رہی ہوں تو مجھے ننھی نصرت کا پیار کا نام ننھی تھا بہت یاد آ رہی ہے۔ آج گیارہ اپریل 2017 ہے۔ آج اس کی پہلی برسی ہے۔ اسی رات میں چندی گڑھ سے اسلام آباد پہنچی تھی۔ اسی شام سب ننھی کو اپنی آخری منزل تک پہنچا کر سوگوار لوٹے تھے۔ وہ ہم سب بہن بھائیوں میں چھوٹی تھی۔۔۔ مگر پہلے چلی گئی۔۔۔ سب کو روتا چھوڑ کر اور میرا لندن کا یہ سفر اسی کی وجہ سے ممکن ہو سکا تھا۔ شادی کے بعد وہ وہیں کی ہو کر رہ گئی تھی۔ دفن ہونے کے لیے وطن چلی آئی

وزیراعظم بےنظیر بھٹو کے اس دورے میں پیرس بھی شامل تھا۔ اب پھر وہی مسئلہ درپیش تھا کہ پیرس میں تو کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس وقت سیکرٹری انفارمیشن راشد لطیف صاحب جن کی وجہ سے یہ سفر ممکن ہو سکا تھا انھوں نے میری درخواست پر ایک سہولت مہیا کرنے کا وعدہ کر لیا تھا کہ رہائش گاہ سے سرکاری تقریبات میں شامل ہونے کے لیے سواری میسر ہوگی۔ مگر ابھی سے یہ پیرس کا ذکر کہاں سے آ گیا۔ ابھی تو کئی جگنو چمکنے ہیں۔

یہ جون کا آخر تھا اور سن تھا 1989۔ غالباً اسی روز لندن میں پاکستانی کمیونٹی نے بےنظیر بھٹو کے اعزاز میں ایک استقبالیے کا اہتمام کیا تھا۔ تقریب ختم ہونے سے ذرا دیر قبل ایک پیغام ملا کہ کچھ دوست ملنا چاہتے ہیں۔ تقریب کے بعد کچھ توقف کیجیے۔ میں سوچتی رہی لندن میں کون ہو سکتا ہے مجھ سے ملنے کی خواہشمند۔

یہ بھید کھلا۔ یادوں کے دیے روشن ہو گئے۔ نجّی یہ تم ہو خوشی اور حیرت کے ملے جلے احساسات کے ساتھ ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ نذیر بیگم۔ ہم نے یونی ورسٹی کا زمانہ فین روڈ کے ایک ہوسٹل میں اکٹھے گزارا تھا۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ادب کی طالبہ، میں پنجاب یونی ورسٹی میں۔ دونوں دانش کدوں کے بیچ فاصلہ ہی کتنا تھا۔ صرف ایک سڑک کی دوری۔ آج فیض صاحب آ رہے ہیں۔ کالج کے لان

میں محفل سجے گی مجھی اطلاع دیتی۔ آج سراج صاحب شکیسپیئر پر خصوصی لیکچر دیں گے۔ میں بتاتی۔ ضرور آتا۔

ایرک سپئیر مین لاوش گارڈن میں چہل قدمی کرتے۔ ہم بھی پہنچ جاتے۔ پھولوں کے کنجوں میں بچھے بنچ پر وہ بیٹھ جاتے۔ ہم گھاس کے مخملیں قالین پر دوزانوں بیٹھ جاتے۔ اور ہمیں نہ سمجھ آنے والی گتھیاں سلجھاتے۔ یادوں کا سلسلہ تھا جو ہاتھ باندھے چلا آرہا تھا۔ چلو چلتے ہیں۔ آخر کارنجی کے شریکِ حیات نے ہماری توجہ زمانہ حال کی طرف پلٹائی۔ دونوں Wembly میں اپنے خوب صورت ولا نما گھر میں لے گئے۔ بالکل سفید دودھیا رنگ کی عمارت تھی تم تو ''وہائٹ ہاؤس'' میں رہتے ہو۔ ہم نے ڈھیروں باتیں کیں۔ رشید صاحب لندن میں حبیب بینک کے منیجر تھے۔ دونوں نے بااصرار کھانے کے لیے روکا۔ کھانے کی میز پر اور لوازمات کے ساتھ پاکستانی سٹائل کا چکن روسٹ بازار سے آگیا۔ بازار میں یہ بھی ملنے لگا ہے میں نے حیرت سے پوچھا۔ ہر چیز تکے کباب، بریانی حتیٰ کہ ساؤتھ ہال جاکر مٹر چاول اور پودینے دہی کی چٹنی تک سے لطف اندوز ہوا جاسکتا ہے۔ میرے اس طرح حیران ہونے پر نجمی نے بھی حیرت کا اظہار کیا تو میں نے برسوں پہلے امریکہ سے واپسی پر پہلی بار لندن آنے کا احوال سنایا۔ جب ناشتے کے لیے ایک ریسٹورانٹ میں ہم میاں بیوی ایک میز پر بیٹھے ویٹرس کی توجہ حاصل کرنے کی لاحاصل سعی میں مصروف تھے۔ ہال میں کوئی زیادہ رش بھی نہیں تھا۔ کافی دیر گزرنے کے بعد اچانک ہم پر وارد ہوا کہ ریسٹورانٹ کے دروازے پر ''کتوں اور کالوں کا داخلہ منع ہے'' کی تختی لگی ہوئی نہیں تھی اور ہر بار ویٹرس ہمارے بلانے پر ہاتھ ہلا کر تسلی دیتی کہ آرہی ہوں۔ اگر امریکہ میں مارٹن لوتھر کنگ کی کالوں کے لیے حقوق حاصل کرنے کی جنگ میں جان نہ گئی ہوتی اور وہیں Black is beautiful کی تحریک نہ چل رہی ہوتی۔ تو شاید ویٹرس ہمیں بھی ہوٹل سے نکل جانے کا حکم دیتی۔ اس نے صرف ایسا وطیرہ اختیار کرنے پر ہی اکتفا کیا کہ ہمیں خود ہی اپنی اوقات یاد آگئی اور ہم نے ایک مالاباری کے ہوٹل میں ناشتہ کیا۔ مگر لندن کے مشہور سیاحتی مقامات دیکھنے کے دوران بازاروں میں نسلی امتیاز کے حوالے سے کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا۔

باتیں کرتے کرتے اچانک مجھے خیال آیا کہ جب ہیتھرو ائر پورٹ پر اتر کر شہر جانے والی سواری میں بیٹھے تو معلوم ہوا کہ آج لندن میں سرکاری ٹرانسپورٹ کی ہڑتال ہے۔ بسوں اور انڈر گراؤنڈ ریلوے کے ملازمین اپنے مطالبات منوانے کے لیے ہر بدھ کو کام نہیں کرتے۔ برطانوی وزیراعظم مسز تھیچر نے بھی اعلان کردیا ہے کہ جھکنے والی نہیں۔ کسی قسم کا پریشر برداشت نہیں کریں گی۔ سو ہڑتال والے دن لندن والے اپنی گاڑیوں پر دفتر جانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اپنی گاڑی پر سفر کرنے میں کوئی حرج نہیں مگر مشکل مسئلہ پارکنگ کا ہے۔ اس کا حل یہ نکالا گیا ہے کہ لندن کے تمام پارکوں میں ہری ہری گھاس کی حفاظت کے لیے اس پر ٹرف (Truf جو کھیل کے میدانوں میں ہاکی کھیلنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے) بچھا دیا جاتا ہے۔ اور ''نوپارکنگ'' والے علاقے بھی پارکنگ کے لیے کھول دیے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ کوئی ہفتوں سے چل رہا

تھا اور جانے کب تک چلے۔ لیکن اس سے لندن والوں کے صبر اور برداشت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جہاں گھنٹوں پہلے ہی ٹریفک جام اور سرخ بتی ان کے صبر کا امتحان لیتی ہے۔ یہ روز کا معمول ہے۔ اس لیے شہر کے اندر اپنی سواری کے بجائے پبلک ٹرانسپورٹ کو ترجیح دی جاتی ہے۔

ہڑتالیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے برطانوی حکومت نے جس نظم و ضبط، تحمل، بردباری کا مظاہرہ کیا تھا اور جس طرح برطانوی باشندوں نے صبر اور تحمل سے اس سلسلے میں پیش آنے والی دشواریوں کا مقابلہ کرنے کے لیے حکومت کا ساتھ دیا تھا وہ اسی قوم کا خاصہ ہے۔ اس صورتِ حال نے مجھے انیسویں صدی کے اس دور میں پہنچا دیا جب ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے اقتدار کو کس نظم و ضبط اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آگے بڑھا رہی تھی۔ ہندوستان میں نوآبادیاتی نظام کو استحکام دینے کے لیے انگریزوں نے بے پناہ جدوجہد کی۔ ہندوستان میں موسموں کی سختی، علاقوں کی اجنبیت، زبانوں کی ناواقفیت، رہائش کی مشکلات اور شدید بیماریاں ان سب کو برداشت کرتے ہوئے اس نظام کی جڑیں مضبوط کر رہے تھے۔ مگر کس کے لیے؟ قوم پرستی، حب الوطنی، عظمت اور بڑائی کا احساس، یہ وہ جذبات تھے جن کے لیے وہ خوشی سے قربانیاں دے رہے تھے۔ اس کی خاطر انھوں نے جلاوطنی کی زندگی گزاری۔ خاندان و بچوں سے دُور ایک نامانوس اجنبی کلچر میں رہے۔ یہ سب کچھ ان کے کردار میں رچ بس گیا تھا۔ ان کی تہذیب کا حصہ بن گیا تھا۔ جس کا نظارا سڑکوں پر ٹریفک جاموں کے دوران ان کے صبر و تحمل اور برداشت کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔

لندن کے بعد پیرس جانے کا معاملہ آیا تو یہاں پھر وہی مسئلہ تھا کہ رہائش کا کیا ہوگا۔ پہلے سوچا جانے کی کیا ضرورت ہے یہیں لندن میں کچھ روز قیام کر لیتے ہیں۔ اس دوران لندن جنگ اخبار میں انور خالد اور قیصر امام سے دوبارہ ملاقاتیں دلچسپ رہیں۔ ایک اور سینئر صحافی حبیب الرحمان صاحب سے پاکستان میں ایک بار تعارف ہوا تھا، وہاں انھیں حبیب الرحمٰن جنگی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ وہ لندن میں اپنا ایک ہفت روزہ اخبار نکال رہے تھے۔ میں نے ان سے ذکر کیا کہ پیرس میں قیام کا انتظام ہوتا تو ہم بھی چلے جاتے۔ میں نے سرِ راہ تذکرہ کیا تھا۔

حبیب صاحب نے فون اٹھایا کسی سے گفتگو شروع کر دی۔ اپنے نام پر چونکی۔۔۔ کچھ کہنے کو تھی کہ میرے ہاتھ میں ریسور تھمایا ادھر سے آواز آئی۔ محبوب شوکت لائن پر تھے۔

آپ آ رہی ہیں۔ میری حیرت اور خوشی کا اندازہ کون کر سکتا تھا۔ حبیب الرحمان صاحب نے جب پیرس فون کر کے محبوب شوکت سے رابطہ کیا اور ایک اجنبی کو ٹھہرانے کی بات کی تو انھوں نے دریافت کیا کہ وہ ہے کون؟ میرا نام سن کر انھیں بھی اس عجیب اتفاق پر حیرت ہوئی کہ ہم تو یونی ورسٹی میں اکٹھے تھے۔ لیجیے پیرس میں بھی ٹھہرنے کا انتظام ہوگیا۔ یوں لگتا تھا یہ دورہ سیاحت کے لیے نہیں پرانے دوستوں اور طالب علمی کے زمانے کے ساتھیوں سے ملاقاتوں کا تھا۔ شوکت محبوب کی بیگم رفعت اور ان کی پیاری بیٹی اور بیٹے کے ساتھ

گذرے چند گھنٹوں کی یادیں ماضی کا حسین سرمایہ ہیں۔ ایک خاندان کے لیے مختص اپارٹمنٹ میں بچوں کا کمرہ مہمان کو دے دیا جائے تو بچے اس کو پسند نہیں کرتے مگر دونوں پیارے بچوں نے اگر برا منایا بھی تو مجھے احساس نہیں ہونے دیا۔

پیرس میں ایفل ٹاور اور آرٹ گیلری، خوب صورت محلات، جن کے باغات میں فنکاری اور دلکشی کا نمونہ ہیں کے علاوہ سیاحوں کو شاہی ظلم و جبر و استبداد کی نشانی Bastille کا قلعہ بھی دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے۔

انقلاب فرانس کے وقت اس کی حیثیت بھی لاہور کے شاہی قلعے جیسی تھی جو سیاسی قیدیوں پر ظلم کے لیے جانا جاتا تھا۔ Bastille پر جب انقلابیوں نے حملہ کیا تو اس میں صرف سات قیدی تھے۔ ان میں چار غیر ملکی تھے ایک دماغی مریض تھا۔ قلعے پر اسلحے کے لیے حملہ کیا گیا تھا مگر بارود وہاں سے پہلے ہی منتقل کر دیا گیا تھا۔

14 جولائی کو فرانس میں جشنِ Bastille بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ اصل میں جولائی اور اگست دونوں ماہ فرانس میں میلوں ٹھیلوں، نمائشوں، پارٹیوں اور تفریح کے لیے مختص ہیں ہر جشن کا اختتام آتش بازی سے ہوتا ہے۔ آسمان پر ہر طرف پٹاخوں کی رنگین روشنیاں بکھری ہوتی ہیں۔

بے نظیر بھٹو جب فرانس پہنچیں تو موسم گرما کی تقریبات شروع ہو چکی تھیں۔ اگلے روز رات کے وقت پیرس کی مشہور شاہراہ شانزے لیزے پر ایک عظیم ریلی کارنیوال کو دیکھنے کے لیے سرِ شام ہی شائقین شاہراہ کے دونوں اطراف ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ ایک کشادہ شاہراہ کے دونوں اطراف سبزہ کے قطعے ہیں۔ پھر فٹ پاتھ اور پھر دکانیں اور کاروبارِ حیات کے مراکز۔ محبوب شوکت کے دونوں بچوں کے ہمراہ ہم بھی جشنِ موسمِ گرما کے سلسلے میں رنگ برنگی پریڈ دیکھنے کی غرض سے پہنچ گئے۔

شائقین کی راہنمائی کے لیے سیکورٹی گارڈز مستعد کھڑے تھے۔ خلقت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ لوگ بیٹھے تھے، آ جا رہے تھے۔ رات کو گرنے والی اوس سے بچنے کے لیے انتظامات بھی تھے۔ بے حد ڈسپلنڈ، عورتیں بچے جوان لڑکیاں ہجوم میں بے پروائی اور آزادی سے پریڈ کے منتظر تھے۔ ناچتے گاتے ٹولوں کے پیچھے پیچھے طویل فلوٹ Floats جیسے پانی پر تیر رہے ہوں۔ چہروں پر رنگ برنگ ماسک سجائے اپنے کلچر اور تہذیب کی نمائش کرتے۔ جیسے 23 مارچ کو ہمارے ہاں اسلام آباد میں پریڈ کے بعد فلوٹس ہمارے کلچر، تہذیب و تمدن کے نمونے لیے ہوتے ہیں۔ شانزے لیزے کے تاریخی بغیر کواڑوں کے دروازوں کے دونوں اطراف میناروں کے اوپر آتش بازی کی تیاریاں بھی مکمل تھیں۔ فلوٹ، شائقین کی تالیوں میں آہستہ آہستہ رواں دواں تھے۔

ہم نے تھوڑی دیر یہ جشنِ رنگ و نور دیکھا رات بہت بھیگ گئی تھی اس لیے واپسی کی راہ لی۔

ظفر اقبال

نظم کے بارے میں کچھ خیالاتِ پریشانی

تازہ ''دنیازاد'' میں کوئی 31 نظمیں شامل کی گئی ہیں، جنھیں پڑھ کر مایوسی بھی ہوئی، حیرانی بھی اور معاصر نظم کے حوالے سے صحیح معنوں میں فکرمندی کا احساس ہوا حالاں کہ فکرمند نظم گوؤں کو ہونا چاہیے اور اگر وہ اپنی تخلیقات پر مطمئن ہیں تو یہ بات مزید افسوس ناک ہے کیوں کہ نظم پڑھتے وقت آپ کو یہ احساس تو ہونا چاہیے کہ آپ نظم پڑھ رہے ہیں، کوئی اخباری رپورٹ نہیں۔ تاہم غزل کے مقابلے میں نظم، موضوعات کے حوالے سے اپنا دامن زیادہ کشادہ رکھتی ہے جب کہ میرا موٴقف یہ ہے کہ نظم اگر واقعی شاعری ہے تو اس میں شاعری بھی ہونی چاہیے بقول سید ضمیر جعفری مرحوم:

شوق سے لختِ جگر، نورِ نظر پیدا کرو
ظالمو تھوڑی سی گندم بھی مگر پیدا کرو

چناں چہ نظم سے شاعری کا تقاضا کچھ اتنا نامناسب بھی نہیں ہے کیوں کہ اگر نظم کو بیگار کے طور پر پڑھنا پڑے تو یہ سراسر زیادتی ہے، قاری کے ساتھ بھی اور اپنے زمانے کے ساتھ بھی۔

میری رائے میں شاعری میں لطفِ سخن کا ہونا ضروری ہے کیوں کہ قاری نظم کو اسی لیے پڑھنے کا تکلف اٹھاتا ہے ورنہ نظم پڑھنے کا مقصد کوئی گیان حاصل کرنا نہیں ہے کیوں کہ شاعری جس جذبے کی تسکین کے لیے پڑھی جاتی ہے، اس حوالے سے تو قاری کو کسی قدر آسودگی حاصل ہونی چاہیے اور یہ کم از کم تقاضا ہے!

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ قاری قدرتی طور پر غزل اوریئنٹڈ ہے اور نظم سے لطفِ سخن کا تقاضا غیر فطری بھی نہیں ہے۔ یقیناً نظم غزل سے مختلف چیز ہے بلکہ غزل کا ہر شعر بھی مکمل نظم کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم ہر دو اصناف میں شاعری تو مشترک ہونی ہی چاہیے۔ سوال تغزل کا بھی نہیں ہے ''آبِ رواں'' کے زمانے کا شعر دیکھیے:

تغزل کا بازار ٹھنڈا ہوا
کوئی اور ہی دوپہر گرم ہے

تاہم نظم اگر اپنے موضوع کے لحاظ سے ڈل اور خشک بھی ہو تو اس کے باوجود اس میں لطفِ سخن پیدا

کیا جا سکتا ہے کیوں کہ اس کا سپاٹ ہونا کسی صورت قابلِ قبول نہیں ہے۔ اوپر جن 31 نظموں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں دو چار کو چھوڑ کر باقی باقاعدہ پھیکی اور تقریباً ناقابلِ مطالعہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ میری رائے ہے اور کئی دوسروں کی رائے اس سے مختلف بھی ہو سکتی ہے۔ تاہم انھیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ نظم میں شاعری اور لطفِ سخن کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرا نظم سے لطفِ سخن کا مطالبہ ہی غلط ہو تو اس کے بعد یہ سارا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ نظم کو جینوئن شاعر بھی بہت کم نصیب ہوئے ہیں جب کہ نثری نظم کی صورتِ حال کچھ زیادہ ہی دگرگوں ہے حالاں کہ نہ اس میں وزن و آہنگ کا تکلف برتنا پڑتا ہے، نہ قافیہ ردیف کا۔ یعنی آپ جو کچھ بھی قلم برداشتہ کر دیں وہ نظم ہے۔ پھر ایک قابلِ اعتراض بات یہ بھی ہے کہ نثری نظمیں بھی آزاد نظموں کے ساتھ ہی درج ہوتی ہیں اور اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ نظم شروع کریں تو دو چار جھٹکوں کے بعد کہیں جا کر پتا چلتا ہے کہ او ہو یہ تو نثری نظم تھی۔ پھر، ایک ہنر یہ بھی بروئے کار لایا جاتا ہے کہ نثری عبارت کو ٹکڑوں یعنی مصرعوں میں تقسیم کر کے اسے باقاعدہ نظم کی شکل دے دی جاتی ہے۔ حالاں کہ اگر یہ نثر ہے تو اسے پیراگراف کی شکل میں کیوں نہیں پیش کیا جاتا۔

میں نثری نظم کا مخالف نہیں ہوں بلکہ اسے مستقبل کی شاعری تسلیم کرتا ہوں اور کئی نثری نظموں کے مجموعوں کا دیباچہ بھی لکھ چکا ہوں۔ میں ایک جگہ یہ بھی کہہ چکا ہوں کہ نثری نظم کے شاعر کے لیے ایک زوردار نثر نگار ہونا ضروری ہے۔ کیوں کہ اگر اس میں آہنگ و وزن اور قافیے ردیف کے زیورات شامل نہیں ہوتے تو کم از کم اسے زوردار تو ہونا ہی چاہیے۔ لیکن اگر نظم نثری ہو اور یہ نثر ڈھیلی ڈھالی بھی ہو تو اس کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ وزن و آہنگ کی غیر موجودگی میں نثر میں ایسی روانی پیدا کی جا سکتی ہے کہ یہ کمی پوری ہو جائے۔

ایسا لگتا ہے کہ شاعری پر یہ وقت ہی پیغمبری ہے جب کہ غزل کا اس سے بھی بُرا حال ہے اور ٹنوں کے حساب سے غزل کے نام ٹریش پیش کیا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ رسالے میں چھپی غزل کا مطلع پڑھ کر ہی آپ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ آپ کو یہ غزل پڑھنی ہے یا نہیں جب کہ ہر دو اصناف کی اپنی سہولیات اور مشکلات ہیں جن پر میں کھل کر بحث کر چکا ہوں اور جسے دُہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تاہم اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غزل آج بھی شاعری کی مقبول ترین صنف ہے۔ بری غزل کے مطالعہ سے بچنے کا طریقہ اوپر عرض کر چکا ہوں جب کہ نظم کے پندرہ بیس مصرعے پڑھنے کے بعد آپ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آپ نے اپنا وقت ضائع کیا ہے اور اسے نظم کے منفی نکات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ سو نظموں کے حوالے سے خدانخواستہ کسی تعصب کا اظہار نہیں

ہے۔ صرف اس سے کچھ تقاضوں کا اظہار کیا ہے اور اسے نظم گوؤں اور غزل گوؤں کے درمیان کسی لڑائی کا نام بھی نہیں دینا چاہیے۔

لڑائی سے یاد آیا کہ ہمارے بھائی دوست جناب ستیہ پال آنند جو خود ایک ممتاز اور سینئر شاعر ہیں، غزل کے مخالف مشہور رہیں حالاں کہ خود انھوں نے لاتعداد غزلیں بھی کہہ رکھی ہیں۔ میں نے اس پر عرض کیا تھا کہ غزل اگر اتنی ہی بے کار چیز ہے تو یہ خود بخود ہی ختم ہو جائے گی۔ اس کے خلاف ایک محاذ کھڑا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تاہم اُن کی یہ سوچی سمجھی رائے ہے جس کا احترام ضروری ہے کیوں کہ ادب کا یہ لالہ زار اختلافِ رائے کی بدولت ہی سرسبز و شاداب چلا آ رہا ہے۔ چناں چہ اگر وہ غزل کا تمسخر اڑانا ضروری سمجھتے ہیں تو انھیں اس کا بھی حق حاصل ہے اور اگر غزل واقعی مر گئی تو اس کارِ خیر میں ان کا حصہ بھی یادگار رہے گا۔

چناں چہ جہاں غزل گوؤں کو اس صنف کی یبوسیت دُور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، وہاں نظم گو شعرا کو بھی اس زیادہ سے زیادہ دلچسپ، دل پذیر اور قابلِ مطالعہ بنانے کا تردّد کرنا ہوگا اور یہ کام کسی نقاد کا نہیں بلکہ خود ان کے کرنے کا ہے کیوں کہ ان کی اپنی اہمیت اور مقبولیت کا راز بھی اسی میں ہے اور یہ کام باہر سے آ کر کوئی بھی نہیں کرے گا۔ نہ ہی کسی کو تکمیلیت کا دعویٰ ہو سکتا ہے کیوں کہ آدمی آخری سانس تک سیکھتا ہے۔ اپنے آپ کو بہتر کرنے کا شوق ویسے بھی سب کو ہوتا ہے اور اپنے معزز ہم عصروں کے لیے یہ ایک دعوتِ عام بھی ہے۔

انداز بیاں گرچہ بہت خوب نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

☆☆☆☆

مبین مرزا

اقبال: حرفِ نعت اور تشکیلِ افکار

واقعہ یہ ہے کہ اردو شاعری کے بحرِ ناپیدا کنار میں اقبال کی مثال ایک جزیرے کی سی ہے۔ وہ اس بحر کا حصہ ہے، لیکن اس میں گم نہیں، بلکہ اس سے الگ اپنی ایک قائم بالذات شناخت رکھتا ہے۔ اس بحر میں سر بہ آورد موجیں امڈتی رہی ہیں، لیکن یہ جزیرہ اپنی جگہ قائم و دائم ہے۔ اس کے رنگ اور موسم سب اس کے اپنے ہیں اور الگ سے پہچانے جاتے ہیں۔ سمندر کی موجوں کا اپنا اپنا خروش اور اپنی اپنی گونج ہے اور اس جزیرے کی ہواؤں کا اپنا ایک آہنگ۔ سمندر کی لہروں کے دامن میں ہیرے موتی ہیں تو اس جزیرے کی مٹی میں اپنے پوشیدہ خزانے۔ یوں تو یہ دونوں باہم مربوط ہیں، لیکن دونوں کی الگ ہستی ہے اور جداگانہ شناخت۔

اہم بات یہ ہے کہ ہماری تنقید نے بھی اس حقیقت کو سمجھا اور تسلیم کیا ہے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ جن زاویہ ہائے نگاہ، جیسے موضوعات اور جن تناظرات میں کلامِ اقبال کا مطالعہ کیا گیا ہے، بلاشبہ اردو کے کسی دوسرے شاعر کا نہیں ہوا۔ یقیناً اس کا سبب اقبال کے حرفِ سخن اور اس کے معجزۂ فن کی نمود ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس کے باوجود آج بھی اگر کوئی اک ذرا توجہ سے شعر و فکرِ اقبال پر نگاہ ڈالے تو اُسے کچھ ایسے نکات بہر حال فراہم ہو جاتے ہیں جو اس کی تفہیم کے نئے پہلو اجاگر کرتے ہیں۔ اس میں کہیں عصرِ حاضر کے افکار و نظریات سیاق فراہم کرتے ہیں تو کہیں تہذیب و تمدن کے تصورات۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی شاعری اور افکار آج بھی اپنے مطالعے کا جواز رکھتے ہیں۔

یوں تو اسے سخنِ اقبال کی بلند اقبالی ہی کہا جائے گا کہ مختلف الخیال افراد اپنے اپنے زاویہ ہائے نگاہ سے اس کا مطالعہ کرنے کے بعد نہ صرف شاد کام رہتے ہیں، بلکہ اپنے فکر و خیال کے ذیل میں انھیں یہاں سے حوالے اور مثالیں بھی میسر آ جاتی ہیں۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں، وہ اہلِ مذہب ہوں یا انقلابی، قوم پرست ہوں یا سماجی و معاشی مساوات کے داعی، تہذیب کے خوگر ہوں یا آزادیِ انساں کا نعرہ لگانے والے، فطرت پسند ہوں یا خودی کے پرستار، فلسفہ و حکمت کے جویا ہوں یا لطفِ زبان و بیاں کے رسیا — اقبال کے یہاں سبھی کو تسکین و طمانیت کا سامان حسبِ مراد میسر آ جاتا ہے۔ تاہم اگر شمس الرحمٰن فاروقی اس صورتِ حال سے نالاں

ہیں کہ اس طرح اقبال کو افکار کے سانچوں میں بانٹ کر پڑھنا زیادتی ہے تو ٹھیک ہے، وہ اقبال کا لفظیاتی اور عروضی نظام پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنا شوق پورا کر لیں۔ آزاد ذہن کے ساتھ ادب پڑھنے والے لوگ آخر نقادوں یا اُن کی تنقید کی انگلی پکڑ کر چلنے کے پابند تو نہیں ہو سکتے۔ ویسے تو اقبال کو اُن کے افکار کے تناظر میں پڑھنے کی شکایت سلیم احمد نے بھی کی تھی اور کہا تھا کہ افکار کی اہمیت کو اس درجہ بڑھا دیا گیا ہے کہ شاعر (یعنی اُن کے بقول اصل) اقبال کہیں دب کر رہ گیا ہے۔

ناقدینِ اقبال پر سلیم احمد اور شمس الرحمٰن فاروقی کے اعتراضات اپنی جگہ۔ ظاہر ہے، یہ اعتراضات ان سب لوگوں کے مقالات و تجزیات اور ان سے حاصل شدہ تأثرات اور نتائج کے حوالے سے کیے گئے ہیں جو غیر ضروری طور پر اقبال کے افکار پر مرکوز ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ایسے لوگ باقی سب چیزوں کو چھوڑ کر صرف و محض اقبال کے یہاں سے فلسفہ برآمد کرنے یا اُس سے فلسفے کے نکات اور دلائل و براہین اخذ کرنے کو اصل کام سمجھ لیتے ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ کسی بھی بڑے شاعر کا متوازن اور جامع مطالعہ صرف اس صورت میں ممکن ہے جب اس کے افکار و خیالات کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کے ساتھ اُس کی طرزِ احساس، تشبیہاتی و استعاراتی علائم، فنی اوصاف اور جمالیاتی خواص کو بھی تہ بہ تہ کھولنے اور پرکھنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کام ذرا وقت طلب ہے اور اُس وقت ہو سکتا ہے جب نقاد اُس مرکز و محور تک پہنچنے کی جستجو کرے جہاں سے زیرِ مطالعہ شاعر کا نظامِ فکر و احساس تحریک حاصل کرتا اور نمو پاتا ہے۔

دقت اپنی جگہ، لیکن کسی فن کار کے بنیادی داعیے اور مرکزی مسئلے کو اس کے فن کارانہ اظہار کی اعلیٰ ترین سطح پر سمجھنے کے لیے یہی طریقہ سب سے زیادہ موزوں ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ فکر و احساس کا مرکز ہی اصل میں وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر فلسفے کے دقیق مسائل بھی جمالیاتی پیرائے میں اس طرح بیان ہوتے ہیں کہ فکرِ محسوس کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ کام وقت طلب اس لیے ہوتا ہے کہ اس میں فن کار کی کلیتِ کار کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ بڑے فن کار کا تخلیقی عمل یا فنی نگار خانہ اصل میں ایک طلسم کدے جیسا ہوتا ہے اور اس کی کلید یا اسمِ اعظم اُس کا مرکزی مسئلہ ہوتا ہے۔ اس طلسم کدے میں داخل تو کہیں سے بھی ہو سکتے ہیں، فکر و فلسفے کے راستے، طرزِ احساس یا اسلوب کی راہ سے، تشبیہات، استعارات یا علامات کے دروازے سے، اور اگر ایک بار داخل ہو جائیں تو اِس کے بعد سیرِ گلگشتِ مصلّیٰ کا لطف بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق اٹھایا جا سکتا ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ فن کار کا فکری اور جمالیاتی طلسم پوری طرح کھلتا انھی لوگوں پر ہے جنھیں اس کا اسمِ اعظم حاصل ہو جائے۔

اب مثال کے طور پر اقبال ہی کو سامنے رکھ لیجیے۔ یہاں نظریات ہیں، افکار ہیں، زمان و مکاں،

تہذیب وتمدن، بقا وارتقا، انہدام وزوال کے تصورات ہیں، تشبیہات واستعارات کا ایک وسیع نگارخانہ ہے، اسلوبیات اور لفظیات کا نظام ہے، لہجہ ہے، انداز ہے، تیور ہیں — غرضے کہ وہ سب کچھ ہے جو ایک بڑے شاعر کے یہاں ملتا ہے یا اس کی اثر آفرینی اور فسوں کاری کو قائم کرنے کے لیے درکار ہوتا ہے۔ یہ سب چیزیں مختلف پڑھنے والوں پر اپنے اپنے انداز اور تناسب سے اثر کرتی ہیں۔ کوئی فکر وفلسفہ کی داد دیتا ہے تو کوئی زبان وبیاں کی، کوئی لہجے کا قتیل ہوتا ہے تو کوئی گھن گرج پر فریفتہ۔ تاہم اگر آپ نتیجہ مجموعی صورت میں دیکھنا چاہیں تو بس وہ یہ نکلتا ہے کہ پڑھنے یا سننے والا اقبال کا قائل ہے۔ چناں چہ اقبال کی شاعری کا سب سے نمایاں وصف یہ نکلا کہ وہ قائل کر لیتی ہے، یا چلیے یوں کہہ لیجیے کہ اپنے اثر میں لے آتی ہے۔ یہ وہ معاملہ ہے جس میں اقبال پوری اردو شاعری میں سب سے آگے نظر آتے ہیں، حتیٰ کہ میرؔ اور غالبؔ سے بھی۔ اب اگر بات اقبال کا قائل یا قتیل ہونے پر ہی ختم ہو جاتی ہے تو یہ الگ معاملہ ہے، لیکن اگر کوئی ان کے افکار وتصورات، اسلوب وآہنگ اور مزاج واحساس کو اس طرح سمجھنا چاہتا ہے کہ اُن کے تخلیقی عمل کی کنہ تک پہنچے اور اُن کے فکری نظام اور جمالیاتی تجربے کو تہ در تہ کھول کر دیکھ سکے تو اسے لامحالہ اُس مرکز تک پہنچنا ہوگا جہاں سے یہ اکھوا پھوٹتا اور سخنِ اقبال میں رنگ ونور کی شعاعوں کی صورت ظہور کرتا ہے۔

اقبال کی شاعری کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے ہوئے اُن کے فکر وفن کی ایک جہت قدرے اختصاص کے ساتھ روشن نظر آتی ہے، اور وہ ہے اُن کی نعت گوئی۔ چوں کہ بیشتر ناقدینِ اقبال اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اُن کے افکار وخیالات کے دوسرے نکات کو موضوعِ گفتگو بناتے رہے ہیں، اس لیے اقبال کے شاعرانہ مقام ومرتبے کے تعین میں اس جہت پر عام طور سے توجہ ہی نہیں دی گئی۔ یہی سبب ہے کہ اگر کچھ ناقدین نے اس حوالے سے کلامِ اقبال پر نگاہ ڈالی اور جائزہ لیا تو ان میں بھی زیادہ تر لوگ وہ ہیں جنھوں نے اسے اُن کے عشقِ رسولؐ کا حاصل گردانا اور عقیدتِ محض کے زمرے میں شمار کیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ اقبال کی شاعری میں راہ پانے اور بیان ہونے والے افکار وتصورات کو نعت کے فکری اور اسلوبیاتی زاویے سے دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔

معدودے چند اہلِ نظر نے اقبال کے یہاں نعت کو صنفی سطح پر اور فنی خصوصیات کے ساتھ دیکھا ہے، اور اس کے جمالیاتی پہلوؤں اور ادبی محاسن کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ ویسے اقبال کے بہت سے ناقدین جن میں بڑے بڑے ثقہ لوگ بھی شامل ہیں، کلامِ اقبال کی اس جہت کو درخورِ اعتنا ہی نہیں جانتے۔ یہی وجہ ہے کہ افکارِ اقبال کی تعبیر وتشریح کے باب میں آپ کو شرق وغرب کے کتنے ہی فلسفیوں، تاریخ دانوں اور سماجی مفکرین کے حوالے قدم قدم پر ملتے ہیں، لیکن اگر نہیں ملتا تو اس نکتے پر غور وخوض کا کوئی حوالہ نہیں ملتا کہ

سخنِ اقبال میں راہ پانے والے افکار و تصورات اجزا کی صورت میں یہاں وہاں سے ماخوذ ہیں یا کوئی ایک منبع ہے جس کی کرنوں نے اقبال کے افکار و آثار کی عمارت کے ہر گوشے کو منور کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے اگر مختلف افراد کے تصورات و خیالات سے استفادہ کرتے ہوئے اپنا ایک نظامِ افکار ترتیب دیا ہے تو بھی یہ اپنی جگہ ایک بڑی بات ہے، لیکن اگر یہ ساری روشنی ایک ہی مرکز سے حاصل کی گئی ہے جس سے اس کا پورا ایوانِ فکر جگمگا اٹھا ہے تو یہ اُس سے بھی کہیں بڑا اور اہم کام ہے۔ اس صورت میں اقبال کی جامع تفہیم کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس منبع و ماخذ کو دیکھا جائے اور یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ اقبال کے یہاں یہ تجلی کس طرح ظہور کرتی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا، بالعموم فکرِ اقبال کا مطالعہ جن اساسی نکات کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اُن میں نعت گوئی شامل ہی نہیں ہے۔ ظاہر ہے، اس کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ مطالعۂ اقبال کے لیے یہ قرینہ توجہ طلب محسوس نہیں کیا ہوگا، ورنہ اتنے بڑے اور اہم ناقدین و شارحینِ کلامِ اقبال اپنے موضوع کی اس جہت سے بھلا کیوں کر صرفِ نظر کرسکتے تھے۔ تاہم اس امر کا فیصلہ بہتر طور سے اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم براہِ راست شعرِ اقبال سے رجوع کریں اور دیکھیں کہ وہ اس باب میں کس نوع کی شہادتیں پیش کرتا ہے۔ ہماری یہ طالب علمانہ تفتیش کسی گہری چھان پھٹک اور بہت باریک بینی کا مطالبہ بھی نہیں کرتی۔ محض ایک طائرانہ نگاہ ہمیں اس معاملے کو سمجھنے کا موقع فراہم کردیتی ہے، اور ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اقبال کے افکار و تصورات کی تشکیل و تعمیر میں جس جوہر نے بنیادی کردار ادا کیا ہے، وہ رسالت مآبؐ کی سیرت و کردار ہے۔ اقبال نے فکر و احساس کی ہر سطح پر اس کا نہایت گہرا اثر قبول کیا ہے۔ چناں چہ اقبال کے فکر و فن کا مرکزی دھارا اسی اثر کی قوت سے متعین ہوتا ہے۔

تاہم غور طلب بات یہ ہے کہ اقبال کے فکری سانچے میں برقی رو کی طرح دوڑنے والے اس احساس نے ان کے یہاں مجرد تصور کے طور پر راہ نہیں پائی۔ اس کے برعکس یہ اُن کے یہاں ایک زندہ تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال نے اس تجربے کو ایک طرف تو اس کی تاریخی، تہذیبی اور سماجی جہت سے دیکھا اور دوسری طرف ایک ایسے مابعدالطبیعیاتی تناظر میں جہاں کونیاتی امور ظہور کرتے ہیں اور کائناتی سطح پر تغیر و تبدل کا نقشہ ترتیب پاتا ہے۔ اقبال کے یہاں اس کا اظہار اُن کے اوّلین مجموعے “بانگِ درا” سے ہی سامنے آنے لگتا ہے۔ ویسے تو اس مجموعے میں ہمیں کم و بیش اُن سارے افکار و تصورات کے نقوش مل جاتے ہیں جو بعد ازاں فکرِ اقبال کے نام سے موسوم ہوئے، لیکن یہ افکار و تصورات پہلے مجموعے میں محض ابتدائی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ تاہم قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس ابتدائی مرحلے میں بھی اقبال کے یہاں عشقِ رسولؐ اور آپؐ کی سیرت و کردار کے اثر کا اظہار جس پختگی اور وارفتگی سے اور جس درجہ بلند فکری سطح پر ہوتا ہے، اس میں

حقیقتِ محمدیہ ؐ کا شعور بھی کارفرما ہے، اور یہ شعور اپنے کونیاتی مضمرات کے ساتھ نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ''جوابِ شکوہ'' کا ایک شعر دیکھ لیجیے:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

اس نظم کے مطالعے کے دوران آپ غور کیجیے تو وہاں نعت کا ماحول ہے اور نہ ہی وہ فضا ملتی ہے جس میں آپؐ کی سیرت کو موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہو، بس ایک شعر آتا ہے، اور اس کے بعد موضوع یا سلسلۂ فکر و خیال یکسر بدل جاتا ہے۔ اب یہ ہوتا ہے کہ ہم آنحضرتؐ سے ایک مسلمان کے حقیقی رشتے کی نوعیت اور اس کے ذاتی و اجتماعی زندگی پر اثرات کا وہ منظرنامہ ابھرتا ہوا دیکھتے ہیں جو دراصل ایک یگانۂ روزگار تہذیب کے نقوش روشن کرتا چلا جاتا ہے۔ اقبال کے یہاں رسمی نعت کا کوئی قرینہ ہمیں نہیں ملتا، لیکن نظم کے مسلسل چار بند اسی موضوع سے تعلق رکھتے ہیں، اور پھر اس شعر پر یہ نظم پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

ہم دیکھتے ہیں کہ یہ شعر اپنے معنی کی وسعت اور گہرائی کا اظہار جس سیاق میں کرتا ہے، اس کو مابعد الطبیعیاتی رموز و علائم کے ذریعے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ خیر، اس موضوع پر آگے چل کر بات کریں گے۔ یہاں ہمارے سمجھنے کا نکتہ یہ ہے کہ کم و بیش وہ سب اہم فکری عناصر جو کلامِ اقبال کی جداگانہ شناخت قائم کرتے ہیں اور ان کے خیالات و تصورات کی صورت گری کرتے ہیں، وہ اپنے بلیغ ترین بیانیے کے کسی نہ کسی مرحلے پر یا تو نعتِ رسولِ کریمؐ کا کوئی پیرایہ اختیار کر لیتے ہیں یا پھر وہاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر یا نعت کا کوئی شعر آ کر اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے کہ فکرِ اقبال کا یہ منظرنامہ کس ماخذ سے رنگ و نور اخذ کر رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایسے دوسرے شعرا جو اپنا ایک فکری تناظر رکھتے ہیں، ان کے برخلاف اقبال کے یہاں مابعد الطبیعیاتی افکار کا دائرہ بھی نعتیہ اسلوب کی وجہ سے مجرد نہیں رہتا، محسوس بن جاتا ہے۔

عقل و عشق، خودی و خودآگاہی، حیات و مرگ، فنا و بقا، اجتہاد و انقلاب اور عروج و زوال سے لے کر اقبال کے عہد تک کے فکری، سیاسی، سماجی اور معاشی تصورات و نظریات جیسے مابعد الطبیعیات، سوشلزم، سیکولرزم اور جمہوریت تک آپ جس زاویے سے چاہے دیکھ لیجیے، اُن کی دانش و بینش کا تقریباً سارا نمایاں منظرنامہ اور اُن کے افکار و تصورات کا دائرہ جس سرچشمے سے روشنی حاصل کرتا ہوا نظر آتا ہے، وہ آپؐ کی ذاتِ گرامی ہے۔ لہٰذا مطالعے کے لیے فکر و شعور اور جذبہ و احساس کا جو رُخ بھی سامنے رکھا جائے، سخنِ اقبال پر

اسی سرچشمے کی چھوٹ پڑتی دکھائی دیتی ہے۔ اب اگر اس لحاظ سے غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ نعت گو شعرا میں اقبال کا مقام کس قدر بلند اور کتنا منفرد ہے۔

وہ لوگ جو شعر و فکرِ اقبال کا مطالعہ نعت کی جہت سے کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے یا پھر کسی بھی اور وجہ سے ایسا نہیں کرنا چاہتے، انھیں اس نکتے کو تسلیم کرنے میں تأمل ہو سکتا ہے اور ان کی طرف سے اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ یہ دعویٰ بے محل ہے۔ اس لیے کہ اقبال کا تو نعت گو شعرا میں شمار ہی نہیں ہوتا، اور ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ جب انھوں نے باضابطہ نعت کہی ہی نہیں۔ اب اگر بات رسمی اندازِ نعت کی ہے تو یہ رائے بالکل درست ہے۔ اقبال نے واقعی اُس مزاج اور اسلوب کی نعت نہیں کہی جو عام طور سے ہمارے یہاں رائج ہے اور جس سے عامۃ الناس خوب مانوس ہیں۔ یہ اردو نعت کی عوامی روایت ہے۔ یقیناً اس کے اپنے کچھ موضوعات و مضامین ہیں۔ اسی طرح اس کا اپنا ایک پیٹرن اور ڈکشن بھی ہے۔ عوامی حلقوں میں مروّج اس نعت کے مضامین، موضوعات، طرزِ اظہار اور اسلوبِ بیاں میں عقیدے اور عقیدت کو نسبتاً فوقیت حاصل ہے۔ ظاہر ہے، یہ عوامی مزاج کا معاملہ ہے۔

تاہم دیکھا جائے تو یہ مزاج صرف اور صرف اردو اور مسلمانوں سے مخصوص بھی نہیں ہے۔ دوسری زبانوں میں بھی عوامی نعت کا رنگ و آہنگ یہی ملتا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت یحییٰؑ، حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے لیے محبت و عقیدت سے لکھی گئی نظموں کا بھی کچھ ایسا ہی مزاج نظر آتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ دنیا کی قدیم تہذیبوں، مثلاً چینی یا ہندی تہذیب میں بھی اگر دیکھیے تو ایسے ہی رنگ و اسلوب کی مذہبی شاعری ملے گی، جس میں اوتاروں سے عقیدت و محبت کا اظہار اسی انداز سے کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ معاملہ کسی مذہب، قوم یا خطے سے مخصوص نہیں ہے۔ تہذیبوں اور اقوامِ عالم کی تاریخ ہر تفریق سے بالاتر ہو کر عوامی عقیدت کو اسی رنگ میں ابھارتی نظر آتی ہے۔

بایں ہمہ یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ عربی اور فارسی کی طرح اردو میں بھی فکری و فنی دبازت رکھنے والی نعت کی ایک مستحکم اور عظیم الشان روایت موجود ہے۔ یہاں موضوعات کا دائرہ قدرے وسیع ہو جاتا ہے، جس میں مذہبی افکار، کونیاتی امور اور مابعد الطبیعیاتی عناصر ملتے ہیں۔ ساتھ ہی لہجہ اور اسلوب بھی بدلا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ دنیا کے دوسری زبان و ادب کے قارئین کی طرح اردو میں بھی فکری جہت والے نعتیہ ادب کے قارئین ذرا مختلف ہوتے ہیں۔ اب رہا معاملہ اقبال کا تو واقعہ یہ ہے کہ اردو نعت کی شعری تہذیب میں بھی وہ اسی طرح انفرادیت کے حامل ہیں جیسے اردو شاعری کی روایت میں۔ ''بالِ جبریل'' اور ''ضربِ کلیم'' میں تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے، لیکن خود ان کے پہلے مجموعے کا مطالعہ بھی ذرا توجہ سے کیا جائے تو وہ بجائے خود اقبال کی

انفرادیت کا اوّلین نقش نظر آتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ''بانگِ درا'' کی کچھ نظمیں یا آپ کہہ لیجیے، اس کا ایک حصہ اسی جدید نظم کا تسلسل محسوس ہوتا ہے جس کی طرح حالی اور آزاد نے ڈالی تھی۔ تاہم اس کتاب کا ایک وقیع حصہ قطعی طور پر مختلف ہے۔ یہاں اقبال کی انفرادیت کا واضح طور پر احساس ہوتا ہے، صرف موضوع کی حد تک نہیں، بلکہ طرزِ سخن، کنایات، اشارات، استعارات، تشبیہات، تلمیحات اور علامات تک آپ کو بہت کچھ ایسا ملے گا جو یہ بات قطعی طور پر ثابت کردے گا کہ اقبال کا کلام ایک الگ شے ہے اور اسے اس طرح پڑھا ہی نہیں جاسکتا جس طرح ہم اس سے پہلے اپنی شاعری کو پڑھتے رہے ہیں۔ اس کے بعد ''بالِ جبریل''، ''ضربِ کلیم'' اور ''ارمغانِ حجاز'' کی شاعری کو دیکھ لیجیے اور غور کیجیے کہ اس کا اردو کی شعری روایت سے کیا تعلق ہے۔

اقبال سے پہلے اردو کی شعری روایت دراصل غزل کی روایت ہے، اور یہ اتنی توانا اور ایسی مستحکم روایت ہے کہ اس نے ہند اسلامی تہذیب اور ثقافتی مظاہر کی صورت گری میں بھی ایک کردار ادا کیا ہے۔ تاہم اقبال کے یہاں دیکھا جاسکتا ہے کہ غزل کا قوام ہی بدل گیا ہے۔ ''بالِ جبریل'' کی غزلیں پڑھ کر غور کیجیے کہ وہ اپنے مزاج، رنگ، اسلوب، آہنگ، موضوعات اور کیفیات میں اردو غزل کی روایت سے کیا علاقہ رکھتی ہیں۔ اسی طرح ''شکوہ''، ''جوابِ شکوہ''، ''مسجدِ قرطبہ''، ''ذوق وشوق'' اور ''ساقی نامہ'' جیسی نظموں کو دیکھ کر فیصلہ کیجیے کہ ہماری شعری روایت کے تسلسل میں یہ نظمیں کس طرح دیکھی جاسکتی ہیں۔ بعینہٖ معاملہ اقبال کی نعت کا بھی ہے۔ یہ اردو نعت کی عوامی روایت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی۔ یہ اس روایت کا حصہ ہے جو مابعد الطبیعیاتی اور فکری تصورات کو معرضِ بیاں میں لاتی ہے۔ تاہم اپنے موضوعات، یعنی فکری content اور اپنے اسلوب و آہنگ، یعنی جمالیاتی اظہار میں مکمل طور سے اپنی انفرادیت کا ثبوت دیتی ہے۔ شعرِ اقبال کا یہ دریچہ جس سمت میں کھلتا ہے، اس کا منظرنامہ تمام تر اقبال ہی سے موسوم ہے۔ بات کی وضاحت کے لیے محض چند اشعار دیکھیے:

لوح بھی تو قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ، تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب

حقیقت یہ ہے کہ صرف یہی چند اشعار بھی اقبال کی نعت کے فکری تناظر اور اسلوبیاتی مزاج کو سمجھنے کے لیے کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ کسی فن کار کی بنیادی تفہیم یا اُس کے فکر و فن کی نادرہ کاری اور بلندی سے عمومی آگہی کے لیے اُس کا ہر فن پارہ سامنے رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ہی اُس کی تمام جہات کا بہ نگاہِ غائر تجزیہ درکار ہوتا ہے۔ دیکھا بس یہ جاتا ہے کہ اپنے فن کی اعلیٰ ترین سطح پر وہ کن فکری مسائل سے سروکار رکھتا ہے اور دقیق ترین سوالات کی جستجو کرتے ہوئے وہ فنی اور شعری جمالیات کے کن معیارات کا حامل ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اقبال کی یہ نعت صرف اُن کے شعری حاصلات ہی کا نہیں، بلکہ اردو کے بہترین نعتیہ ادب کا بھی ایک نادر نمونہ ہے۔ ایک ایسی بلند پایہ مثال جس میں شاعر کا فن ہی درجۂ کمال کو نہیں پہنچا، بلکہ فکری سطح پر دینی روایت اور تہذیبی نشانات بھی اپنی اعلیٰ ترین صورتوں کے ساتھ اس میں ظہور کرتے ہیں۔ اقبال کی نعت نے یہ آواز، یہ لہجہ، یہ آہنگ، یہ فکر، یہ شعور، یہ اسلوب اور یہ جمالیات کس طرح حاصل کی ہے، اس پر ہم ذرا بعد میں بات کرتے ہیں، اس سے پہلے ایک اور نکتے کو دیکھ لیتے ہیں۔

اقبال جیسے ایک بڑے شاعر کا مقام و مرتبہ اور اُس کے فن کی قدر و منزلت کا تعین اُن تصورات کی تشکیل اور سوالات کے جوابات پر منحصر ہوتا ہے جو اِس جہانِ رنگ و بو میں انسان کی حیثیت اور کائنات اور خالقِ کائنات سے اُس کے رشتے کی بابت تخلیقی سطح پر اس کے یہاں اظہار پاتے ہیں۔ یہ سوالات اُس شاعر کے یہاں انسانی وجود اور اس کی روح کے رشتے، کائنات میں اس کی زندگی کی معنویت اور اس کی تقدیر کی نوعیت اور حقیقت کا تعین کرتے ہیں۔ چوں کہ ہر بڑا شاعر اپنا ایک تہذیبی سیاق رکھتا ہے، اس لیے اُس کے فن کی صورت گری کرنے والے تصورات و سوالات اسی سیاق میں مرتب ہوتے ہیں۔ اس کے عہد تک تہذیب کے سفر، اسے پیش آنے والے حالات اور آئندہ کے امکانات کا نقشہ بھی اسی سیاق میں ترتیب پاتا اور اسی سے اپنے لیے معنی اخذ کرتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ اسی معنویت کے تناظر میں شاعر کے پیش کردہ تصورات و سوالات اس کی تہذیب کو ایک نئے تاریخی تناظر میں استحکام فراہم کرتے ہیں اور اس کی اقدار کے فروغ کا ذریعہ بنتے ہیں۔

بادی النظر میں ان تصورات اور سوالات کا متن شاعر کے تخلیقی بیانیے میں سامنے آتا ہے، یعنی وہ بہ

ظاہر انفرادی شعور و احساس کا زائیدہ ہوتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ساری انفرادیت کے باوجود بڑے شاعر کی آواز کو محض ایک ذاتی یا شخصی کلام نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ اُس کے تخلیقی بیانیے کے پس منظر میں روحِ عصر اور تہذیبی ضمیر کی گونج بھی لازماً موجود ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ جن تصورات کی تشکیل اور جن سوالات کے جوابات کی جستجو کرتا ہے، وہ دراصل اُس کی تہذیب کی فی نفسہٖ نقش گری کا وہ عمل ہے جو ایک زمانی دائرے میں اُس کے لیے سامانِ بقا کی صورت میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ بنیادی اصولوں، معیارات، حقائق اور ضوابط کے حوالے سے تو بے شک تبدل کا کوئی نشان نہیں ابھرتا، لیکن دیکھا گیا ہے کہ تہذیبوں پر گزرنے والے مختلف زمانوں میں یہ عمل نہ صرف یہ کہ اپنی بقا کے مختلف مراحل میں صوری و معنوی تغیرات سے ہم کنار ہوتا رہتا ہے، بلکہ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ اس کا لحن، اسلوب اور منہاج بھی کسی حد تک بدل جاتا ہے۔ اس حقیقت کا مشاہدہ و مطالعہ فارسی شاعری میں سعدی، رومی، جامی، عراقی اور حافظ کے کلام میں اور اُدھر انگریزی میں چوسر، شیکسپیئر، ملٹن، جون ڈن، ورڈز ورتھ، بائرن، کیٹس، براؤننگ اور ایلیٹ وغیرہم کے تخلیقی بیانیے میں صراحت سے کیا جا سکتا ہے۔ اس نوع کے مطالعے کے لیے اردو کی ایسی ہائر آرکی میں جن شاعروں کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے گا ان میں اب تک آخری بڑا شاعر اقبال ہے۔

اب یوں تو اصول کی بات یہ ہے کہ ایک بڑے شاعر کا مطالعہ کرتے ہوئے ذہن کو کشادہ اور غیر متعصب رکھنا ضروری ہوتا ہے، تاکہ اُس کے خیالات یا نکاتِ سخن ذرا سہولت کے ساتھ اور وسیع تناظر میں روشن ہو سکیں، لیکن اقبال کے سلسلے میں یہ ضرورت کچھ سوا ہو جاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اقبال کے ساتھ پہلے ہی سے بہت سے سابقے اور لاحقے جوڑ لیے گئے ہیں، مثلاً حکیم الامت، شاعرِ مشرق، مصورِ قوم، روایت و تہذیب کا نقیب، انسانی اقدار کا علم بردار، مفکرِ اسلام، ترجمانِ حقیقت، مردِ خود آگاہ، پیغمبرِ حیات وغیرہ۔ اِدھر آپ اقبال کا نام لیجیے، اور اُدھر یہ سابقے لاحقے آپ کے ذہن میں آنے لگتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اقبال کا ذکر کرتے ہوئے ہماری تنقید نے ان سب کو اس طرح اور اتنی بار دُہرایا ہے کہ اب یہ اُن کے ساتھ پیوست ہو کر رہ گئے ہیں۔ بات صرف یہاں بھی ختم نہیں ہوتی۔

مسئلہ اس کے بعد یہ پیش آتا ہے کہ ان عنوانات کے تحت اقبال پر جو مطالعات مرتب کیے جاتے ہیں، وہ حتمی اور فیصلہ کن بیانات سے لبالب چھلکتے ہوئے ملتے ہیں اور ساتھ ہی ان میں حوالوں اور مثالوں کا انبار بھی ہوتا ہے۔ بار بار کے دیے گئے حوالوں اور دہرائی گئی مثالوں کو ان کے معروف اور مروجہ سیاق و سباق سے نکال کر نئے تناظر میں رکھنا اور نئی جہت اور نئے مفہوم کا تعین کرنا سہل نہیں ہوتا، لیکن اگر آپ اقبال جیسے شاعر کو معمول کے ڈھرے سے ہٹ کر دیکھنا، پڑھنا اور سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ آپ

اپنا context خود بنائیں اور اس کے توسط سے مطالعے کا نیا پیرا ڈائم قائم کریں۔

وہ عنوانات اور حوالے جن کا ذکر سطورِ گزشتہ میں کیا گیا، مطالعۂ اقبال کے ضمن میں اپنی ایک اہمیت رکھتے ہیں۔ تاہم اگر کچھ اور پہلوؤں کو بھی ہم پیشِ نظر رکھیں تو اپنے موقف کو زیادہ محکم طور پر سامنے لا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اقبال کے سیاسی تصورات کو دیکھ لیجیے۔ ویسے تو اس موضوع پر اتنا کام نہیں ہوا جتنا فکرِ اقبال کے دوسرے عنوانات پر ہوا ہے، اس کی اہم ترین وجہ یہ ہے کہ خود اقبال نے بھی اپنے سیاسی افکار کسی تصنیف، رسالے یا خطبے کی صورت میں یک جا اور جامعیت کے ساتھ پیش نہیں کیے ہیں۔ تاہم اُن کے یہاں نظم و نثر میں یہ موضوع بار بار ابھرتا ضرور رہا ہے۔ ظاہر ہے، اس کا سبب فرد سے لے کر عالمی سطح تک انسانی زندگی کا وہ منظرنامہ تھا جس میں اقبال کے شعور نے آنکھ کھولی اور حالات و حقائق کا مشاہدہ کیا۔ اقبال کی امنگوں کا مرکز مشرق تھا، لیکن اُس کا زوال بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ مغرب کی برتری ہر میدان میں تسلیم کی جا چکی تھی۔ چناں چہ ہمارے یہاں اقبال کے سیاسی تصورات کا مطالعہ مغربی افکار کی روشنی میں کرنے کا رُجحان عام رہا ہے۔ افلاطون، ارسطو، کانٹ اور ہابز وغیرہم کے تناظر میں اقبال کے سیاسی نظریات کو دیکھنے اور سمجھنے کی جو کوششیں کی گئی ہیں، وہ تمام تر بے مصرف تو چلیے نہیں ہیں، لیکن ان کے ساتھ، بلکہ اُن کے مقابلے میں اگر ہم غزالی، رازی اور ابنِ خلدون اور سب سے بڑھ کر قرآن و سنت کے تناظر میں اقبال کے سیاسی تصورات اور رجحانات کا جائزہ لیں تو کہیں بہتر سطح کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اندازِ نظر اور طریقِ کار اقبال کی سیاسی فکر کو اس کے ملی اور قومی سروکار کے ساتھ صراحت سے اجاگر کر سکتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ اقبال نے مغرب کا مطالعہ بہت انہماک سے کیا تھا، اس کے نمائندہ اہلِ دانش و بصیرت کو توجہ سے پڑھا تھا اور ممکن ہے کسی سطح پر کوئی اثر بھی قبول کیا ہو، لیکن اُن کے یہاں یہ معاملہ سیاسی حقائق کی تفہیم اور سماجی و گروہی حالات کے تحلیل و تجزیے کی حد تک تھا۔ اس نے اقبال کے یہاں مغرب کی قبولیت کی راہ قطعاً ہموار نہیں کی تھی۔ مغربی تہذیب اور اس کے سیاسی و سماجی مظاہر و مسائل پر اقبال کی گہری نظر تھی اور وہ دیکھ رہے تھے کہ مغرب کے بلند اور روشن میناروں کی بنیادوں میں وہ تموج خیز لہریں پیدا ہو چکی ہیں جو بالآخر تہذیب کے اخلاقی و روحانی زوال و انہدام کا جواز بنتی ہیں۔ اس کا دوسرا اہم سبب یہ بھی تھا کہ مدینے کی فلاحی ریاست کے انتظام و انصرام نے یہ بات اقبال کے دل میں بٹھا دی تھی کہ کوئی بھی نظامِ سیاست و مملکت کسی ملک و قوم کے لیے اس وقت تک فلاح و بقا کی ضمانت نہیں دے سکتا، جب تک کہ اُس کا ڈھانچا مضبوط اخلاقی و روحانی بنیادوں پر استوار نہ ہو۔ اقبال نے اپنے خیالات و افکار کو قدیم مسلمان صوفیا اور حکما کا تکملہ، بلکہ تفسیر کہا ہے۔ ان سب حقائق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سوچنا چاہیے، ایسا کس وجہ سے ہوا؟ اصل میں یہ ہوا

سیاست اور اخلاق کے باہمی ناگزیر رشتے کے شعور کی وجہ سے۔ اس رشتے کی نوعیت اور حقیقت کا ادراک اقبال کو سیرتِ رسولؐ، شعائرِ دین اور تاریخِ اسلام سے حاصل ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کا سیاسی شعور مغرب کا نکتہ چیں ہے۔ اس سلسلے میں اقبال کے یہاں کوئی اشتباہ یا ابہام نظر نہیں آتا۔ وہ صاف انداز میں اور پوری قطعیت سے کہتے ہیں:

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری

دوسری طرف اقبال اپنی روایت وتہذیب کا وہ شعور بھی رکھتے ہیں جو انھیں اپنے انسانی (اور بالخصوص بحیثیت مسلمان) مقام ومنصب کی ماہیت سے بخوبی آگاہ کرتا ہے۔ چناں چہ وہ اپنے یہاں اختیار واقتدار کی حقیقت کو ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

سروری در دینِ ما خدمت گری ست
عدلِ فاروقی و فقرِ حیدری ست
در ہجومِ کارہائے ملک و دیں
با دلِ خود یک نفس خلوت گزیں

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند
در شہنشاہی فقیری کردہ اند

ہستیِ مسلم ز آئین است و بس
باطنِ دینِ نبی این است و بس

ساتھ ہی جب وہ مشرق ومغرب کا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اپنی ملت پہ قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پہ انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

تو یہ اُس شعور کا اظہار ہے جو اپنی دینی روایت نے اُن کے اندر پیدا کیا ہے۔ اوراک کی یہ سطح انھیں اصل میں اُس فکر و نظر کے تحت حاصل ہوئی ہے جس نے آپ کے کردار اور آپؐ کے تربیت یافتہ خلفاے راشدین کے حکومتی ادوار کو مطالعے نہیں تجربے کے طور پر دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ اسی وجہ سے آپ توجہ سے پڑھیے تو محسوس ہوگا کہ ’خاص ہے ترکیب میں.....‘‘ والا مصرع اصل میں درود و سلام کا لہجہ رکھتا ہے۔ یہ نعت ہی کا تو فیض ہے جو اقبال کے یہاں اس رُخ سے رونما ہوتا ہے اور اُن کے فکر و سخن کی معنویت کا سیاق متعین کرتا ہے۔

یہ بات ذرا طویل ہوگئی، لیکن فکرِ اقبال کی اس جہت کو ذرا تفصیل سے دیکھنا اس لیے ضروری تھا کہ وہ بنیادی پہلو جو اُن کے فکر و نظر کو ترتیب دیتا ہے، اپنے طول و عرض میں سامنے آ جائے۔ اس کے بعد اقبال کے دوسرے افکار و تصورات کو اجمالی طور پر دیکھتے ہوئے ہم اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹ سکتے ہیں۔ چناں چہ اب وہ مرحلہ آ گیا ہے۔ یہاں ہم اُن کے چند ایک بڑے تصورات پر طائرانہ نظر ڈال کر اپنے نتائج مرتب کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر عقل و عشق اقبال کے نظامِ خیال کے بہت بنیادی استعارے ہیں۔ اس جہانِ رنگ و بو میں انسانی تگ و تاز کی ساری معنویت کا انحصار اقبال کے نزدیک اس امر پہ ہے کہ اُس کے مرکز میں عشق کارفرما ہو۔ مرکز کا یہ اصول بھی اقبال نے کہیں اور سے نہیں طواف میں مرکز کی معنویت سے لیا ہے۔ چناں چہ عشق اقبال کے یہاں ایمان کے درجے میں آ جاتا ہے، یعنی یقین اور وابستگی کی ایک غیر مشروط اور کامل حالت۔ اب اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہے، یعنی بنیاد عشق پر نہیں ہے تو وہ اقبال کے یہاں اوّل تو سراسر منفی شے ہے اور اگر منفی نہیں تو کم سے کم لایعنی ضرور ہے۔ مثال کے طور پر ذرا یہ اشعار دیکھ لیجیے:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشاے لبِ بام ابھی

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

عشق دمِ جبرئیل ، عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول ، عشق خدا کا کلام
تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ! عقل تمام بولہب

اب دیکھیے، عشق خواہ آتشِ نمرود میں کود رہا ہو، مسلمان ہونے کی علامت ہو یا سر بسر مصطفیٰؐ ہو، مراد یہ ہے کہ اقبال کے یہاں عشق دراصل خیرِ کامل ہے۔ وجہ یہ کہ اس کی نسبت کلیتاً آپؐ کی ذاتِ گرامی سے ہے۔ ہمارے یہاں بیشتر ناقدین اس نوع کے اشعار کو اقبال کے عشقِ رسولؐ سے موسوم کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ''عشق تمام مصطفیٰؐ...'' بجا کہ عشقِ رسولؐ کا اظہار ہے، اور اس سے بھی انکار کفر کے مصداق ہے کہ ایک صاحبِ ایماں کے لیے عشقِ رسولؐ دین و دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے۔

اس حقیقت کے اعتراف کے ساتھ اگر ایک سوال پر بھی غور کر لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے، وہ یہ کہ اقبال کے یہاں فکری تشکیلات کا مآخذ بننے والا یہ عشق کیا وہی یا اُس سے ملتی جلتی کوئی شے ہے، جسے ہم عشق کے عنوان سے اردو شاعری، بلکہ دنیا کی ساری شاعری میں پڑھتے آئے ہیں؟ سوال ذرا بڑا ہے، لیکن جملہ تفصیلات سے حذر کرتے ہوئے ایک اصولی، سادہ اور مختصر جواب سے ہمارا کام چل سکتا ہے۔ لہٰذا جواب یہ ہے کہ قطعاً نہیں۔ یہ عشق فی الاصل ایمانِ کامل کا مجمل اظہار ہے، اور اقبال کے یہاں یہ ایمان پیدا ہوا ہے شعائرِ اسلام کی جامع تفہیم اور تاریخِ انسانی کے اس گہرے ادراک سے کہ آپؐ تمام جہانوں، سب زمینوں اور سارے زمانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ لہٰذا آپؐ سے پہلے کی ارضی تاریخ آپؐ کے بعد کے زمانی دائرے سے مل کر کونیاتی امر کی تکمیل کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ یہ ایک مسلمان کا ایمان ہے اور اُس وقت جب بندۂ مومن، مردِ آگاہ کو تکوینِ الٰہیہ کا شعور القا ہو جائے تب اسے یہ ایمان نصیب ہوتا ہے۔ اس لیے ''عشق تمام مصطفیٰؐ...'' یا ''عشق خدا کا رسول...'' دراصل مدحِ رسولِ کریمؐ ہے، یعنی نعت کا قرینہ ہے۔ یہ قرینہ اسی بندۂ مومن کو عطا ہوتا ہے جس کے بارے میں اقبال کہتے ہیں:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

نہ چینی و عربی وہ نہ رومی و شامی
سما سکا نہ دو عالم میں مردِ آفاقی

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

اب سوال یہ ہے کہ وہ انسان جسے اقبال نے بندۂ مومن، مردِ آفاقی، مردِ آگاہ اور مسلمان کہا ہے، اس شعور و ادراک کی منزل کو تو رحمتِ الٰہی کی ودیعت سے حاصل کر لیتا ہے، لیکن اس حقیقتِ حقہ کو وہ خود بھی کسی کسوٹی پر جانچتا پرکھتا ہے، یا محض جو اسے حاصل ہو جائے اُس پر اکتفا کر کے بیٹھ رہتا ہے۔ اس کا جواب ملتا ہے ہمیں کلامِ اقبال میں اُن اشعار سے جو عہدِ حاضر کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ 'عہدِ حاضر' اقبال کے یہاں ایک استعارے اور ایک اصطلاح کا درجہ رکھتا ہے۔ چناں چہ یہ وہ تناظر ہے جس میں بندۂ مومن اپنے عہد کے حقائق اور تجربات کے رُو بہ رو اپنے ایمان کی تصدیق اور استحکام کے مرحلے سے گزرتا ہے۔ کس طرح گزرتا ہے اور اس کے بعد کن نتائج تک پہنچتا ہے، دیکھ لیجیے:

طلسمِ عصرِ حاضر را شکستم
ربودم دانہ و دامش گسستم
خدا داند کہ مانندِ براہیم
بنارِ او چہ بے پروا نشستم

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا
وجود کیا ہے، فقط جوہرِ خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

اقبال کے افکار و تصورات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ حوالے اور مثالیں درکار ہوں تو اور بھی بہت کچھ نہایت آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مسئلہ مگر یہ ہے کہ بات طول کھینچتی رہے گی۔ یوں بھی اوراقِ گزشتہ میں جو چند نکات پیش کیے گئے اور جو مثالیں درج کی گئیں، وہ ہماری بات کی وضاحت اور مؤقف کی تائید و استحکام کے لیے کافی ہیں۔ علاوہ ازیں فی الوقت افکارِ اقبال کا احاطہ و تجزیہ مقصود بھی نہیں ہے۔ اصل میں وہ جو ایک بات اقبال کی نعت کے حوالے سے کہی گئی تھی، ہمیں تو صرف اُس کی تصدیق کے لیے اقبال کے یہاں سے نعت کے فکری و اسلوبیاتی تناظر میں کچھ نکات اور اشارے حاصل کرنا مقصود تھا۔ وہ کام کیا جا چکا ہے، سو اب ہمیں مزید حوالوں کی ضرورت نہیں ہے۔

چناں چہ ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اقبال کی نعت اپنی فکر اور اسلوب دونوں لحاظ سے اردو نعت کی شعری روایت میں اسی طرح انفرادی حیثیت کی حامل ہے جس طرح اقبال کی شاعری ہماری پوری شعری روایت میں۔ گفتگو کے اس اختتامی مرحلے پر ہمیں یہ بات بھی فیصلہ کن طور پر سمجھ لینی چاہیے کہ اقبال کی نعت اپنی یگانگت اور انفرادیت کا ایک اور بہت اہم حوالہ یہ رکھتی ہے کہ اقبال نے جس طرح نعت کی موضوعاتی وسعت کو کائناتی سطح تک پھیلایا اور اس کی لے کو سوزِ دروں اور جذبِ باطن سے ہم آہنگ کیا ہے، اسی طرح انھوں نے نعت کی صنفی اور ہیئتی قیود کو بھی کراں تا بہ کراں کشادہ کیا ہے کہ اُس میں وجود و شہود، زمین و زماں، شاہد و مشہود اور حضوری و سپردگی کے تصورات سے تجربات تک تہ در تہ عناصر مل کر ایک ایسا کلامیہ تشکیل دیتے ہیں کہ جو کشف و الہام کی سطح کو پہنچا ہوا معجزۂ فن بن جاتا ہے۔ فن کی یہ نمود بھلا کیوں کر ایک روایتی پیرائے میں معرضِ بیاں میں آ سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے یہاں رواں دواں نظم کے کسی ایک مرحلے پر نعت کا ایک شعر آتا ہے اور نظم کی پوری کیفیت و معنویت کو یکسر بدل کر رکھ دیتا ہے۔ اسی لیے اقبال نے مروجہ سانچے میں نعتیہ اشعار پیش نہیں کیے ہیں کہ وہ جانتے ہیں، دو ایک شعر یا چند ایک مصرعے نظم کے مکمل سلسلۂ خیال کو حضوری کے تجربے سے ہم کنار کر سکتے ہیں، پورے کلام کو نعت کے اسلوب میں ڈھال سکتے ہیں اور سارے فکری تصورات کو نعت کی تحویل میں دے سکتے ہیں۔ فن کی یہی نمودِ شعر و فکرِ اقبال کی بلند اقبالی کا جواز ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر وہ کیا شے ہے جو اقبال کے حرفِ سخن میں شامل ہوتی ہے اور اس کی تاثیر کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ یہ سوال اس مقام پر بہت سادگی سے اور بہت سرسری انداز میں پوچھ لیا گیا ہے، لیکن یہ

بہت بنیادی نوعیت کا استفسار ہے۔ صرف اس لیے نہیں کہ اس کلید سے تفہیمِ اقبال کا نیا در کھل سکتا ہے، وہ تو خیر کھل ہی جائے گا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے ذریعے ہند اسلامی ادب و شعر کی وہ جہت بھی آشکارا ہوتی ہے جو بلا تفریقِ رنگ و نسل اور بلا امتیازِ ملک و قوم پوری ملتِ اسلامیہ کے شعور و احساس کو ایک مشترک مرکز سے جوڑ دیتی ہے۔ اقبال کی طرزِ سخن میں شامل ہونے والی وہ شے ہے، حجازی لے۔ یہاں حجازی لے سے مراد ہے آنحضورؐ سے نسبت و تعلق کا وہ اظہار جو زمانوں اور زمینوں کے تعینات سے ماورا کرتے ہوئے صرف شاعر کو ہی نہیں، بلکہ اُس کے قاری کو بھی سر بہ سر حضوری کی بے پایاں اور وجد آفریں سرشاری سے ہم کنار کرتا ہے۔ تبھی تو اقبال نے افتخارِ جاں کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

عجمی خم ہے تو کیا، مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری

یہی وہ لے ہے جو کلامِ اقبال میں آثار و افکار سے لے کر اسلوبیات و جمالیات تک تخلیقِ فن کے پورے منظر نامے میں برقی رَو کی طرح زندگی کی وہ حرارت جگاتی ہے جو شعور و احساس کی تشکیل و تعبیر اور اظہار و ابلاغ کو معجزۂ فن بنا دیتی ہے۔ یہی لے اس حقیقت کو بھی نمایاں کرتی ہے کہ اقبال کے یہاں حرفِ نعت محض رسمِ محبت و عقیدت کا مظہر نہیں ہے، بلکہ یہ اُس مرکز سے رشتے کا اظہار ہے جسے اقبال نے عشق کہا ہے، جو انسان کے سینے میں دل کی طرح دھڑکتا ہے، اُس کی رگوں میں خون کی گردش اسی عشق کی قوت پر منحصر ہے، اور یہی ستاروں، سیاروں اور کہکشاؤں کی اس محیط و بسیط کائنات میں انسان کے وجود کو بلند رتبہ بناتی ہے۔ اس شعور کا اظہار اقبال کے کلام میں جا بہ جا ہوتا ہے اور اُن کیفیات و علائم کے ساتھ کہ جو اُن کے فن کی سطح اور سخن کی معنویت کے دائرے کو کائنات گیر بنا دیتے ہیں۔ لاریب، یہ صرف اور صرف حرفِ نعت کا فیضان ہے۔

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اقبال کی ساری شاعری اسی حرفِ نعت کی دولت پر مایہ سے مالا مال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ہماری ہند اسلامی تہذیب اور اُس کی ادبی و فکری روایت میں جس حجازی لے کو شامل کیا اُس نے اردو کی

شعری روایت کے کیف و کم کو اُس تغیر سے آشنا کیا کہ وہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ اسی کیف و کم کا اثر ہے کہ اقبال کی شاعری سر بہ سر ایک ایسے سانچے میں ڈھل گئی کہ جس نے اُن کے حرفِ شعر کو حرفِ نعت کی اُس معراج تک پہنچا دیا کہ جہاں اُن کے بڑے بڑے افکار و تصورات کی تشکیل نعت کے حرفِ باریاب سے ہوئی۔ یہ اسی جوہر کی نمود ہے کہ اقبال کی شاعری تاریخ و تہذیب کے حقائق و تجربات اور مذہب و فلسفہ کے تصورات، اشارات اور کنایات کو اس طرح اپنے اندر سمو لیتی ہے کہ وہ مجرد نہیں رہتے، بلکہ فکرِ محسوس کے پیکر میں ڈھل جاتے ہیں۔ یوں وہ بہ یک وقت قلب و نظر دونوں کے لیے بالیدگی اور روشنی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر آصف فرخی

انتظار حسین کا اظہارِ خیال

(پاکستان اسٹڈی سنٹر میں)

ڈاکٹر جعفر احمد: پاکستان اسٹڈی سنٹر میں یہ جو کورس ترتیب دیا گیا ہے اس میں آصف فرخی صاحب نے انتظار حسین صاحب کی تحریریں بھی شامل کی تھیں جو وہ پڑھ کر سنانا اور ان پر گفتگو کرنا چاہتے تھے۔۔۔ ہمارے لیے بہت خوشی کی بات ہے کہ انتظار حسین صاحب آج یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ ہمارے سنٹر میں اہلِ علم، ادیب، دانش ور اکثر آتے رہتے ہیں اور ہماری یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہم اپنے طالب علموں کو ان اہلِ علم سے بالمشافہ گفتگو کا موقع فراہم کریں۔ لیکن یہ پہلا موقع ہے کہ انتظار حسین صاحب ہمارے ہاں تشریف لائے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ طالب علموں کے لیے بہت یادگار موقع ثابت ہوگا۔ انتظار حسین صاحب، میں یہ بیان کرتا چلوں کہ پاکستان اسٹڈی سنٹر اور پاکستان کی پانچ اور یونی ورسٹیوں میں اس طرح کے سنٹر موجود ہیں، ہمارا مقصد ایم اے کی سطح پر تدریس کے ساتھ ساتھ تحقیق کی تربیت دینا بھی ہے اور ہمارے ہاں سے Pakistan Perspectives کے نام سے ایک تحقیقی جریدہ شائع ہوتا ہے، اس کے علاوہ کتابیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ لگ بھگ ۳۵ سے ۴۰ کے درمیان کتابیں ہمارے ہاں سے شائع ہو چکی ہیں جن میں تاریخ، سیاسیات، آئین، ادب اور سماجی موضوعات پر کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ہمارے ہاں ایم اے کے طالب علم سو نمبر کا ایک پرچہ دیتے ہیں جسے تھیسس کے طور پر لکھا جاتا ہے اور مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی بھی ہے کہ ہمارے ہاں سے بہت سمجھیے کہ Modest قسم کی تحقیق آپ کی تخلیقات کے حوالے سے بھی ہوئی ہے جو کہ کوئی بلند پایہ چیزیں نہیں ہوں گی، ظاہر ہے کہ طالب علموں کی کوشش ہے، لیکن یہ بات ضرور ہے کہ آپ ہمارے پیشِ نظر رہے ہیں اور آپ کی تحریریں ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہی ہیں۔ طالب علموں سے آپ کا تعارف کرانے سے پہلے یہ چاہا کہ ایک نظر ہم ذرا یہ بھی دیکھیں کہ ہماری لائبریری میں انتظار حسین صاحب کی کیا کتابیں موجود ہیں۔ یہ میں یہاں لے بھی آیا ہوں اس لیے کہ بعض اوقات کتابوں کو دیکھ کر کچھ شوق پیدا ہوتا ہے۔ یہ ان کی کئی کتابیں ہیں۔ میں ان کی یہاں آمد پر ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اب میں آصف فرخی صاحب سے کہوں گا کہ وہ اپنی گفتگو کا آغاز کریں۔

آصف فرخی: شکریہ ڈاکٹر صاحب۔ آج جو یہ گفتگو کا سلسلہ ہوگا اس میں اہم ۱۹۷۱ء یا پھر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کہیے، بنگلہ دیش کی آزادی کہیے، اس کو ہم ادب کے حوالے سے پڑھنے کا سامان کریں گے۔ پچھلی بار آپ کو یاد ہوگا ڈاکٹر جعفر احمد نے جو گفتگو کی تھی اور ڈاکٹر صاحب نے بڑی تفصیل کے ساتھ اور مرتب حوالوں کے ساتھ وہ پورا مربوط نقشہ کھینچا تھا کہ وہ سیاسی عوامل کیا تھے اور وہ سیاسی عوامل ایک آدھ دن کی بات نہیں تھے، بلکہ پاکستان کے قیام سے ہی یوں سمجھیے کہ معاشرے میں ایک دراڑ پڑنے لگی تھی جو ۱۹۷۱ء میں پوری طرح سامنے آئی۔ اب بات کرنا چاہتے ہیں خاص طور پر اس ادب کے بارے میں جو اس حوالے سے لکھا گیا یا جس میں یہ حوالہ موجود ہے، جو شاعری سامنے آئی، جو نثر تخلیق ہوئی اور اس پر بات کریں گے۔ آج سے شروع کرتے ہوئے جو آئندہ چار چھ لیکچرز ہوں گے۔ اس سلسلے کو شروع کرنے سے پہلے دو ایک باتیں ضرور کہنا چاہتا ہوں کیوں کہ اس کا جو پورا پس منظر ہے سیاسی اور سماجی یا پھر تھیوری کے حوالے سے، وہ ہم اس سے اگلی گفتگو میں چھیڑیں گے۔ ٹھیک ہے؟ آج ہم جو بات کریں گے، اس میں سب سے پہلے یہ بات کہنی چاہیے کہ پاکستان کے معاشرے کا یا پاکستان کی تاریخ کا یا پاکستان میں جاری ثقافتی کش مکش اور جدوجہد کا مطالعہ، پاکستان کے ادب کے ذریعے اور حوالے سے --- یہ ہماری کوشش ہوگی۔ کیوں کہ ادب، آپ سب جانتے ہی ہیں کہ معاشرتی عوامل کے بارے میں بہت حساس ہے اور معاشرے کی جو مختلف صورتیں ہوتی ہیں، یا معاشرے کے جو تضادات ہوتے ہیں وہ ادب میں ظاہر ہوتے ہیں۔ سو پاکستان میں جو ادب لکھا گیا ہے، پاکستان کی مختلف زبانوں میں، اس میں پاکستان کی ایک ایسی تاریخ آپ کو نظر آئے گی جو تاریخ کے Form میں تو نہیں ہے مگر تاریخ کی ایک شکل ضرور ہے، ایسی شکل جو تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملے گی، یعنی پاکستانی معاشرے کی جو مختلف صورتیں ہیں، پاکستانی معاشرہ اور خود پاکستان جن تبدیلیوں سے دوچار رہا ہے ان کو آپ ادب کے اندر کارفرما دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ تفریق ضروری ہے کہ ادب کے اندر جو تاریخ ملتی ہے، یا جسے آپ کہہ لیں کہ متوازی تاریخ ہوتی ہے، اس میں تخیل کی رنگ آمیزی بھی شامل ہوتی ہے، وہ صرف Historical Truth نہیں ہوتی بلکہ Imaginative Truth ہوتی ہے، وہ ادبی اصولوں کی پابند ہوتی ہے کہ ایک ادیب ان واقعات اور معاملات کو کس طرح دیکھتا ہے اور ادیب اپنا انفرادی نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔ اس کی جو بھی رائے ہوتی ہے، ادب میں اسی رائے کا اظہار ملتا ہے۔ یعنی مؤرخ کے لیے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ جانب داری سے کام لے یا اپنے نقطۂ نظر کو حاوی رکھے، حالاں کہ یوں بھی ہوتا آیا ہے اور کوئی بھی مؤرخ مکمل طور پر معروضی نہیں ہو سکتا، لیکن مؤرخ کے لیے غیر جانب داری لازمی سمجھی جاتی ہے۔ ادیب اس پابندی سے آزاد ہوتا ہے۔ ادیب تاریخ کو اپنے اعتبار سے دیکھتا اور لکھتا ہے اور اپنے زمانے کے Truths کو وہ براہ

راست استعمال کرے یا نہ کرے، ادب کے اندر، بہر حال تاریخی حقیقت موجود ہوتی ہے، تاریخ موجود ہوتی ہے۔ اچھا، اس کے بارے میں ہم تفصیل سے بات کریں گے لیکن مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس چیز کو میں بجائے اس کے کہ ایک Statement کے طور پر یا بیان کے طور پر آپ کے سامنے رکھوں، آپ کو ایک ایسے Text سے، ایک ایسی تحریر سے متعارف کرانا چاہوں گا جس میں یہ پوری صورتِ حال آپ کو نظر آئے کہ پاکستان کا جو وجود ہے یا پاکستان کی جو کیفیت ہے، جو پاکستان کی شہری زندگی سے عبارت ہے، اس کو آپ کے سامنے رکھا جائے۔ لیکن آپ تاریخ کے طالب علم ہیں اس لیے میں اس تحریر کے بارے میں پھر یہ کہوں گا کہ یہ تاریخ کے Form میں نہیں ہے، یہ افسانوی رنگ میں ہے، اور تاریخی نہ ہوتے ہوئے بھی تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب کے مصنف یہاں موجود ہیں، اس لیے آج کی گفتگو کا آغاز انتظار حسین کے ناول ''بستی'' کے ایک اقتباس سے کریں گے۔ انتظار صاحب کا تعارف تھوڑا سا ڈاکٹر جعفر احمد صاحب نے کروایا لیکن انتظار صاحب کا مختصر تعارف کرانا مشکل ہے، میرے لیے تو بالکل ہی ناممکن ہے، یوں سمجھیے کہ یہ ایک ۔۔۔ ایک زندہ کلاسیک کو اپنے سامنے ہم دیکھ رہے ہیں، ان سے مل رہے ہیں، باتیں کر رہے ہیں اور اس بات کو آپ یوں سمجھیے کہ آپ فرض کیجیے کہ آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے آپ کا دہلی میں رہنا سہنا ہوتا اور جیسے آپ یہاں پڑھ رہے ہیں، اسی طرح آپ دہلی کالج میں پڑھ رہے ہوتے اور آپ کو پتہ چلتا کہ ایک دن مرزا غالب کچھ پڑھانے، کچھ سنانے آ رہے ہیں۔ حالاں کہ ہم جانتے ہیں کہ غالب تو کالج سے الٹے پیروں واپس چلے آئے تھے لیکن ہم یہ Imagine کر سکتے ہیں۔ یا پھر آج سے ستر اسی برس پہلے کا لاہور ہوتا اور اسی طرح سے آپ گورنمنٹ کالج کے طالب علم ہوتے، پھر ایک دن سننے میں آتا کہ علامہ اقبال آج طالب علموں سے گفتگو کرنے یا لیکچر دینے کے لیے بلائے جا رہے ہیں۔ تو جس طرح یہ لوگ اس وقت اس شہر کے سماج کا ایک حصہ تھے اور اب ہماری ادبی تاریخ کا حصہ ہیں، اور اردو ادب کی جو شکل آج ہمارے سامنے ہے اس کا بڑا اہم Formative influence ہیں، اسی طرح ہمارے زمانے میں نثر کو اور افسانوی نثر کو جن لوگوں نے ایسی شکل دی ہے ان میں انتظار حسین کا نام نمایاں ہے۔ بلکہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ سرِ فہرست ناموں میں شامل ہے۔ انتظار صاحب کے کام کی اہمیت افسانے کے حوالے سے تو ایسی ہے کہ جب ہم افسانے پر بات کریں گے تو تفصیل کے ساتھ بات کرنے کی گنجائش نکلے گی۔ لیکن ایک بات اور فی الوقت کہنے والی ہے، یعنی آپ کے مطالعے اور آپ کے شعبے کے حوالے سے۔ وہ یہ انتظار صاحب نے افسانے لکھے ہیں، جتنے بھی لکھے ہیں کافی لکھے ہیں، لیکن ان کے افسانوں میں اور ناولوں میں پاکستان کی ایک پوری تاریخ بھی رقم ہو گئی ہے۔ یعنی آپ ان کو شروع سے دیکھیے۔ ہجرت کا تجربہ، فسادات کا تجربہ، ۱۹۶۵ء کی جنگ اور ایک طرح کا جذباتی ردِعمل پھر

مایوسی کی لہر، سیاسی اکھاڑ پچھاڑ، ۱۹۷۱ء کی جنگ، سیاسی ابتری، پھر آج کل کی جو کیفیت ہے، کراچی میں جو واقعات گزر رہے، اس سے پہلے بھٹو کی پھانسی اور ضیاء الحق کا جو دور آیا، یہ واقعات شعوری طور پر یا لاشعوری طور پر انتظار صاحب کی تحریروں میں شامل ہوئے ہیں اور اس طرح سے موجود ہیں کہ لوگ اس وقت کا کیا سوچ رہے تھے، کس طرح محسوس کر رہے تھے، اس وقت کا ذمہ دار دانش ور کیا سوچ رہا تھا، اس وقت زندگی کا رواں دواں عمل کیسا تھا، یہ سب باتیں بڑی خوبی اور وضاحت کے ساتھ انتظار صاحب کے افسانوں اور ناولوں میں بیان ہوئی ہیں۔ تاریخ کا ایک ریکارڈ موجود ہے جو تاریخ کی شکل میں نہیں ہے۔ یعنی کس دن کیا واقعہ سامنے آیا، اخبار کی سرخی تو نہیں ملتی ہے لیکن یہ ضرور لکھا ہے کہ ۷۱ء کی جنگ میں لاہور کے لوگوں پر کیا گزر رہی تھی، ۶۵ء کی جنگ کے بعد ولولے کی جگہ مایوسی نے کیسے لے لی۔ سبز پوش سواروں کا انتظار کیا جا رہا تھا۔۔۔۔ یہ ساری باتیں انتظار صاحب کی مختلف تحریروں میں آپ کو ملیں گی۔ تو پاکستان کی تاریخ کے مطالعے کا ایک بہت بڑا وسیلہ یا طریقہ، انتظار صاحب کے افسانوں کا Exploration ہے۔ یہ تو ایک ابتدائی تعارف ہے اور اس کے بعد ہم آپ ان سے بات کریں گے۔ سب سے پہلے میں انتظار صاحب سے درخواست کروں گا کہ ''بستی'' ان کا جو ناول ہے، اس ناول کا بھی میں الگ سے تعارف کرواتا ہوں، تو ''بستی'' میں سے وہ کچھ حصہ پڑھ کر سنائیں، جو ۱۹۷۱ء کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد کچھ سوال میں اٹھاؤں گا اور مجھے امید ہے کہ کچھ سوالات آپ کی طرف سے بھی آئیں گے کہ ادیب کے کام میں معاشرے اور معاصر تاریخ کا مطالعہ کس طرح ہوتا ہے، جس کا اعتبار ادب کی وجہ سے قائم ہوتا ہے۔

اچھا، اب ''بستی'' کے بارے میں، جس کا اقتباس انتظار صاحب ابھی پڑھ کر سنائیں گے۔ ''بستی'' انتظار صاحب کا بڑا اہم ناول ہے اور پاکستان میں جو ناول لکھے گئے ہیں، ان میں اس ناول کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ شہر کے بسنے اور ایک بچے کے شعور کے بیدار ہونے کی کہانی ہے، ایک بار جڑوں سے اکھڑنے اور پھر نئی جگہ جڑیں نئی زمین میں اتارنے کی کہانی ہے اور جو کیفیت ہے اس کو اس ناول میں سمیٹا ہے۔ انتظار صاحب کے دو ناول اس کے بعد اور ہیں، ''تذکرہ'' اور ''آگے سمندر ہے۔'' ایک مختصر ناولٹ دن کے نام سے ''دن اور داستان'' نامی کتاب میں شامل ہے۔ یہ ناولٹ ''بستی'' سے پہلے لکھا گیا تھا۔ تو یہ کتابیں افسانوں کے مجموعوں کے علاوہ ہیں۔ ''بستی'' کی اشاعت کو میرا خیال ہے کوئی بیس پچیس برس ہو گئے ہیں۔ اردو میں اس کو پڑھا گیا، ہندی میں اس کا ترجمہ ہوا، انگریزی میں ترجمہ ہوا اور اس کا نیا ایڈیشن آکسفورڈ یونی ورسٹی شائع کر رہی ہے، چند مہینوں میں آ جائے گا۔ خوش قسمتی سے مجھے اس کتاب کے بارے میں بڑی تفصیل کے ساتھ انتظار صاحب سے گفتگو کرنے کا موقع ملا اور یہ گفتگو اس نئی اشاعت میں شامل ہے۔ تو ''بستی'' انتظار صاحب کی

بڑی اہم اور بنیادی کتاب ہے اور پاکستان کے معاشرے نے جو شکل اختیار کی اس پر ایک رواں تبصرہ اس میں موجود ہے، اور خاص طور پر ۱۹۷۱ء کے بارے میں جو آج کی ہماری گفتگو کا حوالہ ہے۔ تو اب میں انتظار صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ ”بستی“ کا وہ اقتباس سنائیں، پھر ہم اس پر ان سے گفتگو بھی کریں گے۔

انتظار صاحب: اب یہ میں ”بستی“ سے ایک اقتباس آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ یہ اصل میں میرے عزیز نے انتخاب کیا ہے، آصف فرخی نے۔ تو مجھے کچھ پتہ نہیں ہے، میں اسے شروع کرتا ہوں اور جب میں پڑھوں گا تب مجھے یاد آئے گا کہ میں نے کیا لکھا تھا۔ بہر حال میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپ نے ہمیں یاد کیا۔ یہاں ڈاکٹر جعفر احمد صاحب، آصف فرخی صاحب ہمیں لے کر آئے، بلال نقوی صاحب بیٹھے ہوئے ہیں تو مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ اس یونی ورسٹی میں آپ کے شعبے کے واسطے سے حاضر ہوا ہوں اور آپ سے ملاقات ہو رہی ہے۔ اب میں یہ پیش کرتا ہوں آپ کے سامنے۔

(پڑھ کر سناتے ہیں۔)

”موٹریں، ٹیکسیاں، رکشائیں، تانگے، سب سواریاں عجلت میں تھیں کہ ایک دوسرے پر چڑھی جا رہی تھیں۔ اسے سڑک عبور کرنا دشوار نظر آ رہا تھا۔ سواریوں کو دیکھا۔ دفعتاً ایک کار کہ اس کی پشت پر Crush India لکھا ہوا تھا، سواریوں سے بھری، سامان سے لدی فراٹے کے ساتھ اس کے برابر سے گزرتی چلی گئی۔ کار کی پشت پر لکھا ہوا نعرہ ذرا دیر کے لیے نظروں کے سامنے آیا اور پھر اڑتی گرد میں دھندلا گیا۔ کار بہت تیزی میں تھی کہ سڑک سے اتر کر کچے میں آئی اور گرد اڑاتی چلی گئی۔

اس نے گزرتے ٹریفک کا اب تفصیل سے جائزہ لیا۔ کاریں اور ٹیکسیاں اپنی چمک دمک کھو بیٹھی تھیں۔ ان کے ڈھانچوں پر مٹی لپی ہوئی تھی۔ ہر کار، ہر ٹیکسی، سواریوں سے بھری ہوئی، سامان سے لدی ہوئی۔ تانگوں میں سامان اور سواریاں ایک دوسرے میں گڈمڈ تھیں۔ یا اللہ! یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ اپنی اس حیرانی کا ذکر اس نے شیراز پہنچ کر عرفان سے کیا ”یار! آج ہماری سڑک پر بہت ٹریفک تھا۔ سڑک عبور کرنا مشکل ہو گیا۔ لوگ آخر کہاں جا رہے ہیں؟“

”تم نے صرف سڑک کا ٹریفک دیکھا ہے۔ میں ابھی اسٹیشن کا نقشہ دیکھ کے آ رہا ہوں۔“

”وہ نقشہ بھی بتا دو۔“

”مت پوچھو۔ پلیٹ فارم پر اتنا مسافر ہے کہ وہاں سانس لینا مشکل ہے اور گاڑی کوئی نہیں آ رہی۔ بس قیامت کا سماں ہے۔“

”اور یہاں شیراز خالی پڑا ہے۔“ اس نے ارد گرد نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ آج شیراز بالکل ہی خالی

تھا۔ وہ اور عرفان بس دو دم ایک ایک میز کے گرد بیٹھے تھے۔ ’’یار آج وہ اپنا سفید بالوں والا ابھی نہیں آیا۔‘‘

اچانک دروازہ کھلا اور افضال داخل ہوا۔ ارد گرد نظر ڈالی ’’خالی؟‘‘

’’خالی۔‘‘ اس نے افسردگی سے جواب دیا۔

’’چوہے کہاں چلے گئے؟‘‘

’’تمھاری بانسری کا انتظار کر کر کے اتنے Frustrate ہوئے کہ خود ہی سمندر کی طرف چلے گئے۔‘‘ عرفان نے طنز بھرے لہجے میں جواب دیا۔

افضال نے گھور کے عرفان کو دیکھا۔ کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولا: ’’مکروہ آدمی! چائے منگا۔‘‘

’’عبدل‘‘ عرفان نے آواز دی۔

عبدل جیسے آرڈر کا منتظر ہی تھا فوراً لپک کر آیا ’’ہاں جی!‘‘

’’چائے۔‘‘

افضال سوچتے ہوئے بولا: ’’یار پرندے بہت پریشان ہیں۔ میں ابھی ابھی راوی کی طرف سے آ رہا ہوں۔ جب جہاز آتے ہیں تو آس پاس کے باغوں سے پرندے حواس باختہ اڑتے ہیں، بے معنی طور پر آسمان پر چکر کاٹتے ہیں اور غریب پھر درختوں میں چھپ جاتے ہیں۔‘‘ رکا، بڑبڑایا ’’اس نگر کے پرندے پریشان ہیں۔‘‘

’’اور تم؟‘‘ عرفان نے اسے گھور کے دیکھا۔

’’میں بھی پریشان ہوں۔‘‘

’’تمھیں پتہ نہیں کہ جو پریشان ہیں وہ شہر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔‘‘

افضال سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کہنے لگا: ’’ایک مسافر نے کسی جنگل سے گزرتے دیکھا کہ ایک چندن کے پیڑ میں آگ لگی ہوئی ہے۔ شاخوں پہ بیٹھے ہوئے پرندے اُڑ چکے ہیں مگر ایک راج ہنس شاخ پہ جا بیٹھا ہے۔ مسافر نے پوچھا کہ اے راج ہنس! کیا تو دیکھ نہیں رہا کہ چندن میں آگ لگی ہوئی ہے؟ پھر تو یہاں سے اڑتا کیوں نہیں؟ کیا تجھے اپنی جان پیاری نہیں؟ ہنس بولا کہ ’’اے مسافر! میں نے اس چندن کی چھاؤں میں بہت سکھ پایا ہے۔ کیا یہ اچھا لگتا ہے کہ اب جب کہ وہ دکھ میں ہے، میں اسے چھوڑ کر چلا جاؤں؟‘‘ افضال چپ ہو گیا، پھر بولا: ’’جانتے ہو وہ کون تھا؟ ۔۔۔۔ شاکیہ منی نے جاتک سنائی، بھکشوؤں کو دیکھا، کہا کہ بھکشوؤ! جانتے ہو وہ راج ہنس کون تھا؟ وہ راج ہنس میں تھا۔‘‘

’’اچھا!‘‘ عرفان طنزیہ لہجے میں بولا: ’’میں بھی تم سے اسی اعلان کی توقع کر رہا تھا۔‘‘

افضال عرفان کا منہ تکنے لگا، پھر بولا: ''تو ٹھیک کہتا ہے۔ بالکل ٹھیک۔ وہ راج ہنس میں تھا۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا، دروازے تک گیا مگر کچھ سوچ کر پھر پلٹا۔ عرفان کے قریب آیا، بولا: ''بدھ بھی سچا تھا، میں بھی سچا ہوں۔ اصل میں پچھلے جنم میں ہم دونوں ایک تھے۔''

افضال پلٹ کر جانے لگا تھا کہ عبدل چائے لے کر آ گیا۔ عرفان بولا: ''چائے آ گئی ہے۔''

افضال نے عرفان کو مشفقانہ نظر سے دیکھا۔ ''عرفان! تو اچھا آدمی ہے۔''

افضال بیٹھ گیا۔ عرفان نے چائے بنائی۔ افضال چائے پیتے پیتے بولا: ''یار جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔''

''کیا اچھا ہوا؟''

''یہی کہ مکروہ لوگ شہر چھوڑ رہے ہیں۔ شیراز آج کتنا پاکیزہ نظر آ رہا ہے۔'' رکا اور بولا: ''یار میں نے بہت سوچا۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ لوگ جو طیب ہیں، اس ملک کو بچا سکتے ہیں۔''

''وہ کہاں ہیں؟'' عرفان نے اپنے مخصوص طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''کہاں ہیں؟'' کاکے تجھے وہ نظر نہیں آتے۔ میں اور تم دونوں۔ یار تین بہت ہوتے ہیں۔'' پھر جیب سے نوٹ بک نکالی، قلم کھولا، نوٹ بک کھول کر کچھ لکھتے ہوئے بولا: ''عرفان! میں نے تجھے معاف کر دیا۔ طیب لوگوں کی فہرست میں تیرا نام شامل کر لیا ہے۔'' پھر بڑبڑایا: 'میری نوٹ بک میں طیب لوگوں کی فہرست روز بروز مختصر ہوتی چلی جا رہی ہے۔''

اچانک سائرن بجنے لگا۔ اس کے ساتھ سیٹیاں تیز تیز بجنے لگیں۔

''افضال اٹھ کھڑا ہوا،'' مجھے چلنا چاہیے۔''

''یہ ہوائی حملے کا سائرن ہے۔ باہر مت نکلو، بیٹھے رہو۔''

''ذاکر! تو بہت ڈرا ہوا ہے۔ رُکا، بولا: ''کاکے مت ڈر۔ آج داتا سے میری بات ہو گئی ہے۔ میں نے کہا کہ داتا میں تیرے شہر کو اپنی پناہ میں لے لوں؟ کہا کہ لے لے۔ سو یہ شہر اب میری پناہ میں ہے۔ اسے کچھ نہیں ہو گا۔'' یہ کہتے کہتے اٹھا اور باہر نکل گیا۔

بس اسی طرح رات اور دن کی تمیز کے بغیر وقفے وقفے سے سائرن بولتا، سائرن کے ساتھ سیٹیاں بجتیں۔ ٹریفک کے سپاہی اور سول ڈیفنس کے رضا کار سڑک سڑک سیٹیاں بجا کے اور اشارے کر کے ہدایات دیتے نظر آتے۔ سڑک سڑک سواریوں کی رفتار اچانک تیز ہو جاتی، پھر دھیمی پڑتی چلی جاتی کہ وہ سڑک سے اُتر کر درختوں کے سائے میں ٹھکانے بناتی چلی جاتیں۔ رفتہ رفتہ سڑکیں خالی ہو جاتیں اور صرف ٹریفک کے سپاہی اور رضا کار سیٹیاں مُنہ میں دبائے جہاں تہاں کھڑے دکھائی دیتے۔ ایک کنارے سے دوسرے

کنارے تک سڑک خالی۔ کنارے کنارے کھڑی موٹروں، رکشاؤں، ٹیکسیوں اور اسکوٹروں کی لمبی قطار۔ ٹریفک کا سارا شور، شہر کی ساری آوازیں معطل۔ چار سو بے حرکت اور خاموش۔ تیزی سے گزرتی ہوئی کوئی جیپ اس بے حرکتی اور خاموشی کو توڑنے کی کوشش کرتی مگر وہ دم کے دم اوجھل ہو جاتی۔ اس کے بعد خاموشی اور امنڈ آتی، بے حرکتی اور گہری ہو جاتی اور وہ کبھی کسی سڑک کے کنارے درخت کے سہارے بیٹھ کر، کبھی درختوں کے پیچھے کسی کھائی میں اجنبی راہ گیروں کے بیچ پسر کر، کبھی شیراز کے کسی گوشے میں دبک کر کان کھڑے کرتا۔ اس اندیشے کے ساتھ کہ اب ایک عجیب شور اٹھے گا اور فضا کا سکوت درہم و برہم ہو جائے گا۔ مگر کوئی شور سنائی نہ دیتا۔ نہ کوئی بڑا دھماکہ، نہ کوئی اونچی آواز۔ بس دور سے آتی ہوئی ایک مدھم گھوں گھوں۔ اس کے بعد پھر مکمل خاموشی اور پھر سائرن بولتا کہ اب اس کے بولنے کے ساتھ چھپے ہوئے لوگ، کونوں کھدروں سے نکلتے اور رکشائیں، اسکوٹر، موٹریں، ٹیکسیاں ایک دم سے پورے شور کے ساتھ چل پڑیں۔ ابھی فضا پُر شور ہے اور ٹریفک رواں دواں ہے اور ابھی پھر سائرن بولنے لگا۔ پھر وہی سیٹیاں، پھر وہی چھپتے ہوئے لوگ اور تھمی ہوئی سواریاں اور پھیلتی ہوئی خاموشی۔ دن میں کتنی بار یہ عمل دہرایا جاتا۔ مگر شام پڑے سائرن دوسرے رنگ سے بجتا کہ اس کے ساتھ سواریوں کی رفتار میں اور پیادوں کی چال میں اچانک ایک درہمی پیدا ہو جاتی۔ رُکنے کے بجائے ہر سواری بے تحاشا دوڑ رہی ہے اور ہر پیادہ بھاگم بھاگ چلا جا رہا ہے۔ مگر رفتہ رفتہ شور دور ہوتا چلا جاتا۔ خاموشی شام کے دھندلکے کے ساتھ پھیلتی چلی جاتی اور رات کے پھیلتے سائے کے ساتھ مل کر پورے شہر پہ چھا جاتی۔ اس خاموشی سے فائدہ اٹھا کر کتے اول رات میں بھونکنا شروع کر دیتے۔ بس پھر لگتا ہے کہ رات بہت گزر چکی ہے۔ اتنی جلدی اتنی رات ہو گئی۔ مگر اس کے بعد رات پڑ جاتی اور گزرنے کا نام نہ لیتی۔ پھر اچانک سائرن بول پڑتا۔ پھر وہی سیٹیاں۔ اس کے ساتھ ہی کتے ایک نئی توانائی کے ساتھ بھونکنا شروع کر دیتے۔ لگتا کہ سارے شہر کے کتے ایک دم سے جھرجھری لے کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ سیٹیوں اور کتوں کے بھونکنے کا شور اس کے حواس پہ چھاتا چلا جاتا۔ بستر میں لیٹے لیٹے اسے لگتا کہ ساری فضا اس مکروہ شور سے بھر گئی ہے۔ قریب پلنگ پہ لیٹے ہوئے ابا جان آہستہ سے اُٹھ کر بیٹھ جاتے اور مُنھ ہی مُنھ میں کچھ پڑھنا شروع کر دیتے۔ پھر امی کروٹ لیتیں اور اُٹھ کر بیٹھ جاتیں۔

"ذاکر بیٹے! جاگ رہے ہو؟"

"جی امی۔" اور وہ اُٹھ کر بیٹھ جاتا۔

اور اس کے بعد امی دعا کے لیے دونوں ہاتھ اُٹھاتیں: "یا الٰہی! خیر۔" ابا جان مُنھ ہی مُنھ میں عربی میں کچھ پڑھتے۔ کبھی نادِعلی، کبھی آیۃ الکرسی۔ امی اونچی کانپتی آواز میں دعا مانگتیں۔ جب سے جنگ شروع ہوئی

ہے امی کی خواہش کے مطابق ہم ایک ہی کمرے میں سوتے ہیں۔ رات کے اندھیرے میں اپنے اپنے پلنگ پر بیٹھے ہوئے تین سائے۔ ابا جان آیتوں کا ورد کر رہے ہیں۔ امی دعا مانگ رہی ہیں اور میں خطرے کی اتنی راتیں گزارنے کے بعد بھی اپنے ذہن کو ایسے وقت میں مصروف رکھنے کے لیے کوئی صورت نہیں سوچ سکا ہوں۔'' (بستی۔ باب ۷)

آصف فرخی: اب تھوڑی سی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں، کیوں کہ یہ ایسا موقع ہے کہ کہانی کے ساتھ ساتھ کہانی کہنے والا بھی ہمارے درمیان موجود ہے تو ہم کچھ سوال کر سکتے ہیں۔ (وقفہ) چندن کا پیڑ جو کھا اٹھا رہا ہے اور ہنس وہاں موجود ہے، یہ علامت اس میں آپ نے بیان کی ہے۔ کیا یہ ادیب اور معاشرے سے اس کی وابستگی یا Commitment کی کوئی صورت ہے؟

انتظار حسین: دیکھیے بات یہ ہے کہ کہانی والا اس وقت تو ایک کیفیت میں ہوتا ہے کہ تجربہ جو اس کے سامنے ہے، اسے قلم بند کر رہا ہوتا ہے۔ وہ اس وقت یہ نہیں سوچتا کہ یہ جو میں لکھ رہا ہوں یہ کس چیز کی علامت ہے اور کس چیز کی علامت نہیں ہے۔ شعوری طور پر جب ہم اس قسم کی فکر کرتے ہیں، لکھتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہم نے کوئی بہت ایسی تحریر لکھ دی ہے تو اس میں تصنع آ جاتا ہے۔ آ ور جسے کہتے ہیں اردو کی تنقید میں۔ تو یہ تو بعد میں قاری بتاتا ہے یا نقاد بتاتا ہے کہ جو آپ نے جاتک استعمال کی ہے، یا یہ تلمیح جو ہے، اس کی معنویت اس کہانی میں یا اس بیان میں یہ ہے۔ تو یہ جو بات ہے تو اب تمھارے کہنے سے مجھے خیال آتا ہے کہ شاید اس کوئی علامتی حیثیت ہے۔ اس وقت تو میں رو میں لکھ رہا تھا تو مجھے جاتک کتھایاد آئی، مہاتما بدھ کی جاتک کتھائیں مجھے بہت کچھ پتہ دیتی ہیں اور یہ ایسی جاتک کتھا ہے کہ جاتکوں کے باہر بھی اس کے Versions ملتے ہیں۔ مہابھارت میں بھی یہ دوسرے طریقے سے بیان ہوئی ہے اور بھی جگہ بیان ہوئی ہے۔ یہ چھوٹی سی جاتک ہے یا حکایت ہے تو اسے میں نے مختلف Conexts میں پڑھا ہے، جاتکوں میں بھی پڑھا ہے، ان سے باہر بھی۔ تو اس میں ایسی خوبی کوئی بات ہے اس میں کہ یہ مختلف Contexts میں، مختلف حوالوں سے بیان ہوئی ہے اور مختلف جگہوں میں اس کے مختلف معنی ہو سکتے ہیں۔ اب یہاں اس کے کیا معنی بنتے ہیں، یہ تو آصف فرخی مجھے بتائیں گے، مجھے پتہ نہیں۔

آصف فرخی: آپ نے ایک بار پھر مجھے امتحان میں ڈال دیا۔ میں اس بات کو یوں آگے بڑھانا چاہتا ہوں کہ ۱۹۷۱ء کا جو تاریخی حوالہ ہے یا واقعہ کہیے، جو ''بستی'' میں آپ نے خاصی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اپنے تجربے کے لحاظ سے، مجھے ایسے لگتا ہے کہ پاکستان میں ان حالات اور واقعات کے بارے میں جس طرح غور و فکر ہونا چاہیے تھا، جو تجزیہ ہونا چاہیے تھا یا ہمارے معاصر ادب کے مطالعے کا جتنا بڑا

حصہ یہ ہونا چاہیے تھا، ایسا نہیں ہوا۔ اور اس پورے واقعے سے کوئی سبق حاصل کرتا تو ورکنا رہا اپنے ملک کے بارے میں یا اپنے بارے میں کوئی نتیجہ اخذ کرنے کا کام نہیں کیا۔ کیا آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے؟

انتظار حسین: ہاں، بلکہ کبھی کبھی یہ سوال کیا جاتا ہے، مجھ سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اتنی بڑی واردات گزر گئی، پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا، لیکن ادیب نے اس سے کیا اثر لیا۔ ہمارے ادب میں اس کے اثرات زیادہ نظر نہیں آتے۔ مثال دی جاتی ہے کہ جب تقسیم ہوئی تھی تو اس حوالے سے اتنا فکشن لکھا گیا تھا، ناول، افسانے، نظمیں تو وہ پورا عہد جو ہے ۴۷ء کے بعد کا تو اس میں ہر لکھنے والے کا موضوع وہی تھا۔ ۴۷ء کے حوالے سے یا تقسیم جو ہوئی تھی اس کے حوالے سے، جو بستیوں پر گزری، جو لوگوں پر گزری۔ تو یہ اتنا بڑا واقعہ تھا، اس کا کچھ زیادہ اثر نہیں آتا۔ تو میں جواب کے طور پر بھی یہ کہتا ہوں، شاید سارے ادیبوں کی طرف سے صفائی پیش کرنے کے لیے، کہ پوری قوم نے اس سے کتنا اثر قبول کیا۔ یہ سارا تجربہ جو ہے کہ ایک ملک ٹوٹا اور جسے کہنا چاہیے کہ نظریہ آپ نے تعمیر کیا تھا تحریکِ پاکستان کے عمل میں اور خواب دیکھے تھے اتحاد کے کہ ڈھاکا سے لے کر پشاور تک جو مسلمان آباد ہیں، وہ ایک قوم ہیں۔ وہ سارا خواب اس واقعے کے ساتھ چکنا چور ہو گیا۔ تو اس کا پوری قوم پر جو اثر ہونا چاہیے تھا، وہ تو ہمیں نظر نہیں آیا۔ فوری طور پر جو ہوتا ہے ہاں، لاہور شہر میں اس کے مظاہرے نظر آئے۔ لوگوں نے افسوس بھی کیا لیکن چند دنوں کے بعد ہم نے دیکھا کہ جیسے یہ تجربہ سر سے گزر گیا۔ لیکن اب لکھنے والے سے یہ توقع کرتے ہیں کہ بے شک پورے معاشرے کا جو بھی ردِ عمل ہو، اسے تو کم از کم ـــــ یعنی یہ اتنا بڑا واقعہ گزر رہا ہے اور پاکستان کی تاریخ کو درہم برہم کر دیا، وہ واقعہ اتنا بڑا تجربہ ہے کہ اس کا اثر آنا چاہیے تھا، ادب میں اور اس کا اظہار ہونا چاہیے تھا۔ تو میں بھی اس میں شریک ہوں کہ اس کا اثر اس طریقے سے ہوا نہیں۔ اس کا اظہار نہیں ملتا ہمارے ادب میں۔ لکھی گئیں، کچھ کہانیاں بھی لکھی گئیں، کچھ رپورتاژ بھی لکھے گئے۔ ہمارے ایک افسانہ نگار جو تھے اس عمل سے گزرے، وہ سول سرونٹ بھی تھے، اپنے مسعود مفتی تو انھوں نے کچھ کہانیاں بھی لکھیں، انھوں نے رپورتاژ بھی لکھا۔ لیکن جیسی تحریریں آنی چاہیے تھیں، اور اس طرح نظر آتا ہے کہ ہماری اردو کی ادبی روایت جو تھی، وہ اس تجربے سے جیسے کنی کاٹ کر نکل گئی۔ تو اگر آپ کو افسوس ہے تو میں بھی اس افسوس میں شامل ہوں۔ تو میں نے جو کہانیاں لکھی ہیں وہ بھی بس ایسی ویسی ہیں۔ واجبی واجبی سی۔

ڈاکٹر جعفر احمد: سوال یہ ہے کہ سیاسی جو واقعات ہوتے ہیں، جس طرح یہ واقعہ ہوا تو کیا یہ ضروری ہے کہ ہر واقعہ ادب میں reflect ہو؟

انتظار حسین: کوئی ضروری نہیں۔ اور ہر واقعہ reflect بھی ہو تو جو اتنے بڑے واقعے

ہوتے ہیں، کوئی ضروری نہیں کہ فوری طور پر تحریر میں آ جائیں ۔ کچھ وقت بھی لگتا ہے بڑے تجربے جو ہوتے ہیں ۔ اب جیسے مثال دی جاتی ہے، ایک بڑا ناول جو ہے، ''وار اینڈ پیس'' ہے تو کب وہ واقعہ ہوا تھا اور کب وہ ناول لکھا گیا اور وہ شاہکار سمجھا جاتا ہے ۔ ممکن ہے اس زمانے میں اور بھی چیزیں لکھی گئی ہوں لیکن اس تجربے کی جس طریقے سے داستان بیان ہوئی ہے تو وہ تو ''وار اینڈ پیس'' ہی ہے اور اگر دوسری تحریریں تھیں تو وہ پیچھے رہ گئی تھیں ۔ لیکن لوگوں نے کہا کہ بعض مقامات ایسے ہوتے ہیں کہ وہ ہم پر اس طریقے سے اثر انداز ہوتے ہیں کہ ان سے مفر نہیں ہوتا ۔ جیسے ۴۷ء کا واقعہ آتا ہے، فسادات کا اثر ہوا، ہجرت ہوئی اور یہ سب ہوا تو وہ سارے برصغیر کی، کم از کم شمالی ہند پر اس کے اتنے وسیع پیمانے پر اثرات ہوئے، ہر بستی اس سے متاثر ہوئی کہ اس سے مفر تھا ہی نہیں ۔ تو جو بھی لکھنے والے تھے وہ اس سے کسی نہ کسی طریقے سے متاثر ہوئے، انھوں نے لکھا ۔ اگرچہ توقع یہ تھی کہ جو کچھ ہنگامی طور پر لکھا جا رہا ہے تو کچھ عرصے کے بعد ایسا بڑا شاہکار آئے گا، کوئی بڑا ناول، کوئی لمبی نظم تو یہ پورا تجربہ سمٹ کر اس میں اظہار پائے گا ۔ پتہ نہیں کوئی تحریر ایسی ہے کہ نہیں ۔ چوں کہ ہم تو ان لکھنے والوں میں شامل ہیں تو ہم اپنے طور پر یہ فیصلہ نہیں کر سکتے، نقاد تجزیہ کر کے بتائیں گے ۔ لیکن اس میں ایک بات ضرور میں عرض کروں گا کہ یہ جو ''وار اینڈ پیس'' کی مثال دی جاتی ہے وہ ہمارے ذہنوں میں اٹک گئی ہے ۔ ایک تو یہ کہ ہم اس طریقے سے سوچتے ہیں کہ کوئی بڑا تجربہ ہو، کوئی ایسی واردات ہوئی ہے تو اسے بڑے وسیع کینوس پر پینٹ کیا جائے اور ضخیم کتاب لکھی جائے اور ضخیم ناول لکھا جائے ۔ تو یہ ضخامت جو ہے، ہمارا Obsession بن گئی ہے ۔ حالاں کہ بیسویں صدی میں بعض شاہکار ناول ہیں، وہ تو اتنے مختصر ہیں ۔ سب سے بڑی مثال کامیو کا Outsider ہے جس کی سنگِ میل کی حیثیت ہے، جس سے سارا trend بدل گیا فکشن لکھنے کا، وہ چھوٹا سا ناول ہے ۔ ایسی کچھ اور بھی چیزیں ہیں ۔ تو محض جسامت کوئی معنی نہیں رکھتی ہے ۔ تو اب بہت سی نظمیں لکھی گئیں، جو سب سے زیادہ quote کی جاتی ہے، نقل کی جاتی ہے، وہ فیض صاحب کی نظم ہے ۔ وہ چھوٹی سی نظم ہے لیکن اس کا impact دیکھیں کتنا ہوا ۔ تو آپ ضخامت پر نہ جائیں ۔ بعض کہانیاں ـــــ منٹو کی کہانیاں، وہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں ۔ منٹو طویل کہانی تو لکھتا ہی نہیں تھا تو ان کی اپنی اہمیت ہے ۔ کچھ چیزیں آپ کو اس پورے ادب میں ایسی ملیں گی جو واقعی بہت گہرے معنی رکھتی ہیں اور جن کے بارے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں یہ تجربہ بڑی حد تک اظہار پا جاتا ہے، پورے طریقے سے نہیں، لیکن اپنی جگہ، اس سرزمین میں یہ جو دوسرا واقعہ ہوا ہے، اس کے سلسلے میں ابھی تک تو نہیں ـــــ ممکن ہے آگے چل کر شاید اس واقعے سے متاثر ہو کر کوئی ناول آئے، کوئی نظم آ جائے، اس کا کوئی پتہ نہیں ہے ۔

ڈاکٹر بلال نقوی: انتظار صاحب، آپ نے فیض صاحب کا ذکر کیا، تو طاہر مسعود نے فیض

صاحب سے ایک انٹرویو کیا تھا، اس میں سوال کیا کہ مشرقی پاکستان کے المیے نے ہمارے ادب پر کیا اثر ڈالا؟ تو فیض صاحب نے کہا، بازو ان کا بھی کٹا ہے ----

انتظار حسین: کیا؟

ڈاکٹر بلال نقوی: فیض صاحب نے کہا، بازو جو ہے ----مطلب، طاہر مسعود نے کہا ملک علیحدہ ہوگیا، ایک بازو ہمارا کٹ گیا۔ تو فیض صاحب نے کہا، بھئی بازو تو ان کا کٹا ہے، ہمارے اوپر اس کا کیا اثر ہوگا؟ میں نے جعفر احمد صاحب کو بھی یہ انٹرویو دکھایا، اب معلوم نہیں انھوں نے کس موڈ میں یہ بات کہی۔ لیکن انھوں نے یہ کہا کہ بازو تو ان کا کٹا ہے، ہمارے ادب پر اس کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ تو اس سے آپ کیا اندازہ لگاتے ہیں؟

انتظار حسین: نہیں، میں تو اسے دوسرے طریقے سے دیکھتا ہوں، محض پاکستان کے Context میں نہیں۔ مسلمانوں کی جو سیاست ہے اور سیاسی جدوجہد ہے، ۱۸۵۷ء کے بعد، آپ کو یاد ہوگا کہ اس کا آغاز، اس سیاسی تحریک کا آغاز ڈھاکا سے ہوا تھا۔ ڈھاکے ہی میں اس کا انجام ہوا۔ یہ کتنی عبرت ناک بات ہے۔ وہیں سے آپ کا قافلہ چلا تھا، ۱۹۰۶ء میں جو پہلی کانفرنس ہوئی مسلم لیگ کی داغ بیل پڑی، ڈھاکے سے آغاز ہوتا ہے اس ساری جدوجہد کا اور ڈھاکے ہی میں وہ غرق ہو جاتا ہے، پورے کا پورا، پوری تاریخ غرق ہوتی ہے۔ تو مجھے یہ برصغیر کے مسلمانوں کی جدوجہد، اس کا المیہ نظر آتا ہے، محض پاکستان کا نہیں۔ تو میرے لیے تو تاریخ میں اتر کر دیکھیں تو یہ پاکستان سے بڑا واقعہ ہے۔

طالب علم: مجھے یہ پوچھنا ہے کہ جو لوگ مشرقی پاکستان میں رہ رہے تھے، اس میں سارے لوگ ایسے نہیں تھے جن کو پاکستان سے کوئی وابستگی نہ ہو۔ وہاں پر بھی ایسے لوگ جنھیں کچھ ہوا ہوگا، وہاں پر بھی reaction آیا ہوگا۔ تو کیا اس کو ہم اپنی نظر میں نہیں لائیں گے؟

انتظار حسین: دیکھیے آپ جو یہاں گنبد میں بند ہیں اور یہ بنگلہ دیش کا سوال ہے کہ ان کا ردِعمل ایسا ہونا چاہیے، تو ان کا ردِعمل بالکل مختلف ہے۔ آپ نے اگر وہ کتاب پڑھی ہو حسن ظہیر کی تو اس کا دیباچہ انھوں نے لکھا ہے، اور اس میں یہ کہا ہے ----وہ وہاں موجود تھے، اس وقت جب ڈھاکا کا Fall ہوا اور اس وقت سارے شہر میں جو کچھ ہو رہا تھا، تو ایک طرف خوشی کا اظہار تھا کہ ہم نے اپنا آدرش جو تھا وہ حاصل کر لیا، نئے ملک کے بنانے کی خوشی ہو رہی تھی اور دوسری طرف وہ لوگ تھے جو افسردہ تھے کہ پاکستان آج ٹوٹ گیا۔ تو یہ دو ردِعمل انھیں اس شہر میں نظر آئے تھے، وہ آپ لوگ دیکھ سکتے ہیں۔ بنگلہ دیش والوں کا ردِعمل ہمارا نہیں ہے، بلکہ ایک مرتبہ میں ڈھاکا گیا تو میرے ایک دوست وہاں تھے، غلام محمد، افسانہ نگار۔ وہ بہاری

تھے لیکن انھوں نے Identify کیا تھا اپنے آپ کو بنگالیوں کے ساتھ اور وہ بڑے غصے میں آئے تھے ایک مرتبہ۔ میں ادبِ لطیف کا ایڈیٹر تھا، انھوں نے مجھ سے کہا، میں نے اردو میں لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ میں نے پوچھا کیوں، اردو نے کیا خطا کی ہے۔ انھوں نے کہا، اردو والے جو کچھ کر رہے ہیں ۔۔۔ تو جب ڈھاکہ گیا تو بنگلہ دیش بن گیا تھا، اب سے پانچ چھے سال پہلے تو ان کا نقطۂ نظر بالکل مختلف تھا۔ انھوں نے کہا، ہم نے اس عذاب سے نجات پالی اور ہم ایک الگ قوم ہیں ۔۔۔ بنگلہ دیش۔ وہ اس پر اطمینان کا اظہار کر رہے تھے۔ بلکہ "بستی" پر انھیں یہ اعتراض تھا کہ آپ نے اس واقعے کو المیے کے طور پر پیش کیا ہے، آپ کو یہاں کے لوگوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے، یہاں کے Nationalist لوگوں سے۔ مگر ہمارا تو نظریہ یہی ہے کہ ہم ایک قوم تھے اور اس طریقے سے الگ ہوگئے۔ انھوں نے کہا، نہیں آپ کو ہمدردی ہونا چاہیے، بنگالیوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اب آزاد ہوگئے۔ تو انھیں "بستی" پر یہ اعتراض تھا کہ آپ نے ان لوگوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار نہیں کیا، آپ مغربی پاکستان کے شہری بن کر سوچ رہے ہیں۔

ڈاکٹر جعفر احمد: اسی بات کو تھوڑا آگے بڑھاتے ہوئے میں کہوں گا کہ ابھی جیسا آپ نے فرمایا، ۱۹۴۷ء کا جو واقعہ تھا، وہ ہندوستان کے ہر شخص کا تجربہ تھا، ہر گاؤں کا تجربہ تھا۔ ۱۹۷۱ء کا جو واقعہ ہے وہ شاید اس طرح سے مغربی پاکستان کے ہر گھر کا اور ہر گاؤں کا تجربہ نہیں بنا اور اس پر مزید یہ کہ غلام محمد صاحب نے ۱۹۷۱ء کے بعد شکر ادا کیا کہ ہماری جان چھوٹی اور انھوں نے یہ کہا کہ "بستی" میں آپ صرف مغربی پاکستان کے لوگوں کی نظروں سے چیزوں کو دیکھ رہے ہیں، تو تینوں باتوں سے لگتا ایسا ہے کہ یہ جو لاتعلقی ہمارے ہاں رہی اور اس واقعے کے حوالے سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاید ہم ایک قوم ہی نہیں بنے۔ اگر قوم بنے ہوتے تو اس کی شکست و ریخت کا کوئی المیہ بنتا، اس پر ہم ماتم کرتے ۔۔۔ ہم قوم ہی نہیں تھے۔ وہ ہمیں بہت آسانی سے بھول گئے، ہم انھیں بہت آسانی سے بھول گئے۔

انتظار حسین: اس سے منطقی نتیجہ تو یہی نکلتا ہے۔ لیکن ہمارا گمان یہ تھا کہ چوں کہ اس کے پیچھے پورا ایک پس منظر ہے اور وہ سیاسی جدوجہد جس کا میں نے ابھی حوالہ دیا، اس میں بنگالی پیش پیش تھے اور تحریکِ پاکستان میں بھی یہ عجب صورتِ حال ہے کہ مغربی پاکستان کے جو علاقے تھے، اتنی گرم جوشی یہاں نہیں تھی۔ یا تو وہ بنگال میں تھی یا ان صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے۔ تو بنگال تو اس تحریک کا ہراول دستہ تھا۔ ان کا موقف یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اصل پاکستان ہم ہیں اور وہ اکثریت میں بھی تھے۔ وہ پورا مغربی پاکستان ملا کر پچاس سے بھی کم اور چھپن فی صد کے لگ بھگ ان کا تناسب تھا۔ لیکن وہ اتنے بے زار ہوئے کہ انھوں نے نہ صرف مغربی پاکستان کے لوگوں سے قطع تعلق کیا بلکہ وہ پاکستان جس کے تصور میں وہ بہت سرگرم تھے، وہ

اس سے بھی لاتعلق ہو گئے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ سارا شور جو تھا وہ بس شور تھا، اس میں ہم قوم بن نہیں پائے تھے، وہ اس عمل کے بیچ میں پاکستان بن گیا۔ یہی اس کا نتیجہ نکلتا ہے اور بھی اس کے اثرات ہو سکتے ہیں اور پھر ۷۱ء کی بات یہ ہے کہ اس کا لوگوں کی زندگیوں پر بہت اثر پڑا۔ یہ تو واقعہ ہو گیا ناں، اور یہ ڈھاکے میں ہوا۔ جو کچھ ہوا مشرقی پاکستان میں ہوا۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ یہاں تو دیہات کے لوگ اطمینان سے بیٹھے تھے، شہر کے لوگوں کو احساس تھا، لاہور ہے، کراچی ہے، جو نمائندہ شہر تھے۔ جو پڑھے لکھے لوگ تھے یا زیادہ حساس تھے، سیاسی طور پر انھیں یہ احساس تھا کہ بھئی، ملک کا ایک حصہ چلا گیا۔ دیہات میں جو خلقت ہے تو اس پر کوئی اثر ہی نہیں پڑا۔ انھوں نے اخباروں میں پڑھ لیا، ریڈیو سن لیا کہ ایک جنگ ہو رہی تھی ہم سے دور اور اس میں مشرقی پاکستان جو علاقہ تھا پاکستان کا حصہ، وہ الگ ہو گیا۔ تو وہ ان کا تجربہ نہیں بنا۔ یہی کہہ سکتے ہیں ہم۔

ڈاکٹر جعفر احمد: ایک بات اور چاہوں گا کہ ہمارے سٹوڈنٹ یہ بات سنیں کہ لوگوں نے یوں کہنا شروع کیا۔۔۔ مجھے یوں لگتا ہے آپ مجھے Correct کریں کہ یہ جو اتنے بڑے Uphearals ہوتے ہیں، اتنے بڑے واقعات، انقلاب روس ہے، پاکستان کا بننا، ہندوستان جیسی سرزمین کا تقسیم ہونا اور پھر یہ کہ پاکستان کا ٹوٹ جانا، ان واقعات کا ادب میں جو reflection آتا ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کا خاصی حد تک اس سارے واقعے میں ایسا لگتا ہے کہ یہ ایک Strategic چیز تھی، ایک خاص وقت میں بڑا رائٹر وہاں موجود ہے، اس دور میں موجود ہے، یعنی دلی جو کچھ ہوا ۱۸۵۷ء میں غالب اس وقت موجود تھے، اور ایک پورا آشوب ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ۴۷ء کا واقعہ ہوا تو منٹو موجود تھے، کرشن چندر موجود تھے، ان سب کی تحریروں میں ان واقعات کا reflection ہے۔ اب بیروت میں بمباری ہوئی، فیض احمد فیض موجود تھے۔ ایک نظم انھوں نے کہی، وہ بہت بڑی نظم بن گئی۔ آج پورے عراق کے اوپر جو کچھ بربریت گزر رہی ہے تو کوئی بڑی نظم نہیں آئی۔۔۔ یہ Strategic location کی بھی بات ہے کہ جب کوئی بڑا واقعہ ہو رہا ہو تو اس پائے کے لکھنے والے، دو چار لکھنے والے بھی منظرنامے پر موجود ہوں، جو ظاہر ہے زیادہ receptive ہوں گے، زیادہ بڑی چیز لکھ سکیں گے۔

انتظار حسین: مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی بڑا لکھنے والا نہ ہو مگر بعض تجربے ایسے ہوتے ہیں جو خود اس قسم کے لکھنے والے کو پیدا کر دیتے ہیں۔ کوئی ایسا ہے، کوئی معمولی لکھنے والا اور اس قسم کے تجربے سے گزرا، اور اس نے اتنی شدت سے محسوس کیا۔ اس نے اس تجربے کو سمیٹ لیا اور ایک ایسی تحریر لکھ دی کہ وہ خود اس کے حوالے سے بڑا لکھنے والا بن گیا۔ یہ تو ہوتا ہے لیکن یہ ہے کہ اگر لکھنے والے پہلے سے موجود ہوں تو اگر بڑا تجربہ آرہا ہے تو اسے سنبھالنے والا کون ہے؟ اگر کوئی شاعر موجود ہیں، بڑے فکشن رائٹر چند ایک موجود

ہیں تو ان سے توقع یہ ہے کہ اس تجربے کو وہ سنبھال لیں گے۔ وہ بڑا تجربہ جو ہوتا ہے، وہ بھی ایک امانت ہوتا ہے، انسانی زندگی کی امانت۔ اس امانت کو سنبھالے گا کون؟ امانت کو سنبھالنے والے بھی ہونے چاہئیں۔ بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن جہاں تک غالب کا تعلق ہے، ۱۸۵۷ء کا جو آشوب تھا، بڑا واقعہ تھا تو غالب اس وقت فارغ ہو چکے تھے شاعری سے۔ وہ تجربہ اگر مجھ سے کہا جائے تو میں جواب دوں کہ نہیں، غالب نے اس تجربے کو سنبھالا ہے مگر شاعری میں نہیں، نثر میں۔ اس کے جو خطوط ہیں، جہاں دلی کے متعلق لکھا ہے، اس کی تباہی کا حال لکھا ہے تو وہ بات خطوط میں ملے گی۔ نثر میں اس کا بیان موجود ہے، شاعری میں نہیں۔ ۱۸۵۷ء کے حوالے سے شاعری میں اگر کوئی چیز ایسی لکھی گئی ہے تو میرے علم میں نہیں۔

طالب علم خاتون (سوال کرتی ہیں۔)

انتظار حسین: آپ کا سوال سنائی نہیں دے رہا۔ آپ سامنے آ کر سوال کیجیے۔

طالب علم خاتون: میرا سوال یہ ہے کہ ہماری جو زندگی ہے، وہ مشینی زندگی ہے، ہم لوگ بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ ہمارا ادب اس مقصد میں کیا ساتھ دے رہا ہے؟

انتظار حسین: ہمارا ادب؟

طالب علم خاتون: ہمارا ادب کیا ساتھ دے رہا ہے؟

انتظار حسین: تو بھئی یہ جو ہماری عام زندگی میں مشکلات ہیں، مسائل ہیں، وہ تو اپنی جگہ پر ہیں تو اب ادب سے یہ توقع کی جائے کہ وہ ہر موڑ پر آپ کی رہنمائی کرے، یوں تو نہیں ہوا کرتا، یا یہ کہ جو آپ کی مشکلات ہیں اس کا دستاویزی بیان ادب میں آ جائے، یہ بھی نہیں ہوا کرتا۔ یہ کام صحافت کا ہے، ادب کا نہیں ہے۔ شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار جو ہیں وہ تو یوں ہے کہ ایک پورا ماحول جو ہے اور آپ پر جو گزر رہی ہے، جس طریقے سے ہو رہا ہے ہمارے زمانے میں، وہ چھن چھان کر ایک تجربے کی صورت میں اس کو کہیں منتقل کرتے ہیں اپنے افسانوں میں یا شاعری میں۔ لیکن اگر آپ تفصیل کے ساتھ ادب میں اس کے نشانات دیکھنا چاہیں تو یہ ادب میں نہیں ہوا کرتا۔ یہ صحافت کا کام ہوتا ہے۔ وہ آپ اپنی صحافت میں تلاش کیجیے۔

ایک طالب علم: سر آپ سے یہ سوال کرنا ہے کہ یہ کیوں ہوتا ہے کہ کوئی ادیب یا افسانہ نگار یا کوئی بھی ناول نگار، کوئی بڑا مسئلہ ہو یا ناخوش گوار واقعہ ہو، اس کے بعد ناول یا افسانہ لکھتا ہے۔ اس سے پہلے مسئلے کا ادراک کر کے کیوں نہیں لکھتا ہے؟ یہ مشرقی پاکستان یا بنگال میں علیحدگی کا مسئلہ تھا تو مغربی پاکستان کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ وہ قصوروار تھا تو ان مسائل پر پہلے کیوں نہیں لکھا؟ مسئلہ ہونے کے بعد کیوں لکھا؟

انتظار حسین: (ہنستے ہوئے) دیکھیے، وہ کام سیاسی مبصر کرتے ہیں ہمارے اخباروں میں،

جو ایڈیٹوریل رائٹر ہوتے ہیں، کالم نگار ہوتے ہیں، یہ سب فرائض انجام دیتے رہتے ہیں۔ آج بھی آپ پڑھتے ہیں۔ میں بھی اخبارات کے ذریعے سے روز یہ خبریں حاصل کرتا ہوں کہ ”ڈان“ میں کیا لکھا جا رہا ہے، ”ٹائمز“ میں کیا تجزیہ آ رہا ہے۔ اردو صحافت تو بے نیاز ہے ان کاموں سے۔ لیکن ہماری انگریزی صحافت میں تجزیے مل جاتے ہیں آپ کو۔ تو وہ اخبار یہ فریضہ سر انجام دے رہا ہے۔ ہمارا صحافی کسی حد تک یہ کام کر رہا ہے۔ تو اب ادیب سے یہ توقع کیوں کر رہے ہیں؟ ادیب کا Subject اس سے ذرا مختلف ہوتا ہے۔ تو وہ موضوع جو ادب اٹھاتا ہے، وہ فریضہ صحافی سر انجام نہیں دے سکتا۔ تو اسے اپنا کام کرنے دیجیے۔

طالب علم: (سوال ریکارڈ نہیں ہوا)

انتظار حسین: یہ جو آپ کہہ رہے ہیں، یہ وقتی ہے۔ یہ عمل گزر رہا ہوا اور یہ باتیں ہوتی چلی جا رہی ہوں اور جو وقت گزر رہا ہے اسے ریکارڈ کیا جاتا ہے صحافت میں۔ لیکن یہ پورا عمل گزر جاتا ہے یا گزر رہا ہوتا ہے تو وہ اسے۔۔۔۔ صحافت اسے اپنی تفصیلات کے ساتھ قلم بند کرتی ہے۔ ادیب یا شاعر ان تفصیلات کو چھانتا چلا جاتا ہے اور اس کی تہہ میں جو تجربہ جاری و ساری ہوتا ہے یا جو الگ الگ تجربے مل کر ایک بڑا تجربہ بنتا ہے، اسے اپنی گرفت میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ صحافی نہیں کر پاتا۔ تو وہ صحافت کا دائرہ کار مختلف شکل کا ہوتا ہے تو اس میں آپ کو فرق کرنا چاہیے۔ لیکن ہمارے زمانے میں ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ادب اور صحافت گڈمڈ ہو گئے ہیں اور بعض صحافتی تحریروں پر شک ہوتا ہے کہ کہیں یہ نثر کا۔۔۔۔ ہماری صحافت تو ایسی نہیں لیکن بعض کی صحافت بھی ایسی ہوتی ہے کہ کبھی کبھی یہ شک گزرتا ہے کہ یہ بالکل ادب پارہ ہے۔ اتنا اچھا بیان ہوتا ہے اس کا۔ تو صحافت اور ادب ہمارے ہاں بیسویں اور اکیسویں صدی میں اتنے قریب آ گئے ہیں کہ ہم فرق نہیں کر پاتے اور اسی لیے جو صحافی کا فریضہ ہے وہ ادیب سے توقع کرتے ہیں کہ وہ اسے پورا کرے گا۔ حالاں کہ وہ پورا ہوتا رہتا ہے، صحافی کے کام کو آپ کو اس طور سے دیکھنا چاہیے۔ جب شہر کا کوئی مسئلہ ہوتا ہے تو ہم خط لکھتے ہیں اخبار میں، اور اخبار کے ایڈیٹر سے توقع کرتے ہیں کہ وہ اس پر ایڈیٹوریل نوٹ لکھے گا، اور وہ لکھتے بھی ہیں تو افسانہ نگار تو ایڈیٹوریل نوٹ نہیں لکھے گا۔ وہ تو افسانہ لکھے گا۔

طالب علم: ایک صحافی اور ایک ادیب دونوں لکھتے ہیں۔ لیکن جب صحافی لکھتا ہے تو اس کا معاشرے پر کیا اثر پڑتا ہے اور ادیب لکھتا ہے تو اس کا معاشرے پر کیا اثر پڑتا ہے۔

ایک اور طالب علم: کیا ان میں Diffreniate کر سکتے ہیں کہ ادیب کے لکھنے کا زیادہ اثر ہوتا ہے یا صحافی کے لکھنے کا؟

انتظار حسین: دیکھیے صحافی کے لکھنے کا اثر فوراً ہوتا ہے، اور نظر آتا ہے آپ کو یہ یہ اثر ہوا۔

کوئی ایسا کالم لکھا جاتا ہے، کوئی ایسا ایڈیٹوریل لکھا جاتا ہے، جس کا فوری اثر نظر آتا ہے۔ حکومت ہل جاتی ہے۔ فوری اقدامات ہوتے ہیں۔ لوگوں میں ردِعمل بہت جلدی ظاہر ہوتا ہے اور جو شعر کہا جائے گا، افسانہ لکھا جائے گا، اس کا اثر آپ کو اس طرح فوری نظر نہیں آئے گا لیکن وہ اپنا اثر کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ کرتا ہے۔ وہ اس کا اثر مختلف نوعیت کا ہوتا ہے لیکن وہ دیرپا ہوتا ہے۔ اس کی مثال یوں لیجیے کہ یہ میڈیا ہے۔ سیریل جو لکھا جاتا ہے، جب ایک اپیسوڈ نشر ہوتا ہے تو دوسرے دن سارے شہر میں اس کی خبر ہوتی ہے، اشفاق احمد جیسے لکھتے تھے تو دوسرے دن سب کو پتا ہوتا تھا کہ اشفاق احمد نے یہ لکھا ہے اور اس کے اثرات نظر آتے تھے۔ مجھے یہ تجربہ ہے، میں ویسے سیریل رائٹر نہیں رہا اور ڈرامہ بھی میں نے ٹی وی پہ کم لکھا ہے لیکن کبھی کبھی ایسا ہوا ہے کہ کبھی ڈرامہ لکھا اور دوسرے دن کسی دکان پر گیا تو دکان دار نے پہچان لیا۔ یا ٹی وی پہ کسی مذاکرے میں گیا تو لوگوں نے کہا، اچھا، اچھا، آپ رات ٹی وی پر آئے تھے۔ تو یہ فوری اثر ہوتا ہے۔ یا ڈرامے کے بارے میں کہ اچھا، اچھا، آپ کا ڈرامہ رات ہم نے دیکھا تھا۔ کبھی میرے افسانے پر اس طریقے سے مجھے داد نہیں ملی۔ تو میں سوچتا ہوں کہ میں ڈرامہ ہی لکھتا رہتا ٹی وی کے لیے! (ہنستے ہیں) لیکن وہ میرا میدان ہی نہیں تھا۔ تو یہ اثر جو ہوتا ہے افسانے کا، شاعری کا یوں ہوتا ہے۔ شاعری کا اثر ہوتا ہے کہ بعض نظم ایسی لکھی جاتی ہے کہ فوری طور پر اس کے اثرات نظر آتے ہیں۔ جیسے فیض صاحب کی نظم جو میں نے ابھی حوالہ دیا۔ یہ نظم جب چھپی تو اس کے فوراً بعد جیسے پر لگ گئے ہوں اس نظم کو۔ ہندوستان سے پاکستان تک یہ نظم دہرائی جانے لگی اور بھی تو شاعری ہوئی تھی ـــ۔ منٹو صاحب کے افسانوں نے اس طریقے سے اثر نہیں کیا۔ منٹو صاحب کا افسانہ لوگوں نے پڑھا، پڑھتے پڑھتے اس کا اثر ہوا۔ لیکن فیض صاحب کی نظم کو پر لگ گئے۔ شاعری میں یہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر جعفر احمد: یہ فیض صاحب کی کس نظم کی طرف اشارہ ہے آپ کا؟

انتظار حسین: یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر۔

ڈاکٹر جعفر احمد: یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر ــــ

انتظار حسین: وہ تو فوراً مشہور ہو گئی۔ ہمارے ایک دوست تھے ترقی پسند تھے، عارف المتین۔ وہ بہت غصے سے کہتے تھے کہ یہ جو نظم ہے تو میں اس سے پہلے نظم لکھ چکا تھا، اس میں یہ مضمون تھا اور یہی باتیں تھیں۔ تو میں دل سے کہتا تھا کہ بھئی، اظہار کا فرق بھی تو ہوتا ہے۔ یہ نظم عارف عبدالمتین تمھارا اظہار اور وہ فیض صاحب کا اظہار فرق تو ہوتا ہے۔ (ہنستے ہیں) بات تم نے شاید وہی کہی ہوگی لیکن فیض نے جب بات کہی تو وہ ایک پورا تخلیقی اظہار تھا۔

طالب علم: سر میرا سوال یہ تھا کہ ٹیچرز ہمیں جو لیکچرز دیتے ہیں، ان میں انھوں نے

تنقید تو ہمیں پڑھائی، افسانے کو پڑھایا۔ تنقید نگار جو افسانے کا تجزیہ کرتا ہے وہ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اور افسانہ نگار جو ہے، وہ مشاہدات پر مبنی ایک کہانی Create کرتا ہے۔ تو بعض شعرا یہ کہتے ہیں کہ تنقید نگار کی ہمیں ضرورت نہیں ہے، ہم جو کہتے ہیں وہ ہمارے سامعین سنتے ہیں۔ بیچ میں تنقید نگار کون ہوتا ہے اس بات کو Clear کرنے میں۔ آپ کی نظر میں تنقید نگار کی ادب میں کتنی اہمیت ہے؟

انتظار حسین: ٹھیک ہے، آپ نے بڑا جائز سوال کیا ہے اور ہمارے ہاں عام طور پر یہ ہوتا ہے۔ وہ ادیب، وہ لکھنے والے جنھیں تنقید میں زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہوتی وہ بہت غصے میں ہوتے ہیں کہ نقاد بیچ میں کہاں سے آ گیا۔ تو ایک زمانے میں واقعی نقاد ہمارے درمیان نہیں تھا اور شاید اس زمانے میں نقاد کا کوئی جواز تھا ہی نہیں۔ وہ تو پورا معاشرہ جو تھا، اس کی تربیت اس طریقے سے ہوتی تھی کہ شاعر پڑھا جاتا تھا اور فوراً اس کی تفہیم ہوتی تھی اور اس زمانے میں اساتذہ یا سمجھ دار لوگ ہوتے تھے، وہ یہ کام کرتے تھے۔ تنقید کی زیادہ محتاج نہیں تھی وہ شاعری۔ پورا معاشرہ recieves کر رہا تھا اس شاعری کو۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد کا جو عہد ہے ناں، اس عہد میں تنقید کی روایت قائم ہوئی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس وقت سے نقاد کا بڑا ایک رعب چلا آ رہا ہے۔ (وقفہ) تو میرے خیال میں اس زمانے میں، ۶۷ء کے بعد، پھر مقدمہ شعر و شاعری لکھا گیا، مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات لکھی تو ان کا بہت اہم رول نظر آتا ہے۔ ان دونوں نقادوں کا بہت اہم رول ہے۔ اب بھی ہے۔ مولانا شبلی کا بھی حوالہ آیا تھا۔ بھئی پہلے میر انیس کو سمجھا جاتا تھا کہ یہ ٹھیک ہے، مجلسوں میں مرثیہ پڑھتے ہیں۔ وہ تو مولانا شبلی نے جب لکھا تو پتہ چلا کہ مرثیہ صرف یہ نہیں ہے کہ مجلسوں میں آپ نے مذہبی تقاضوں کے تحت سن لیا، وہ مرثیے کو مولانا شبلی امام باڑے سے باہر لے آئے اور جو Mainstream تھا شاعری کا، اس میں شامل کر دیا اور بتایا کہ یہ انیس جو ہے، یہ شاعر جو ہے صرف ایسا نہیں ہے کہ آپ اسے امام باڑے میں سنیں اور مجلس میں سنیں، یہ ہماری ٹھیٹھ شاعری، صفِ اول کی جو شاعری ہے، اس میں اس کا مرثیہ آتا ہے تو یہ Assesment ہمیں شبلی نے بتایا۔ اس سے پہلے ہمیں اس کا شعور ہی نہیں تھا اور یہ جو نئی شاعری ہمارے ہاں پیدا ہوئی، راشد ہیں، میرا جی ہیں، فیض ہیں، یہ لوگ ہیں، ان کی شاعری کی تفہیم کرنے والا نقاد اگر وسیلہ نہ بنتا تو ہمارے لیے بہت مشکل تھا، کیوں کہ یہ تو بالکل نیا شاعر تھا۔ نیا اظہار ہمارے لیے بہت مشکلات پیدا کر رہا تھا۔ وہ روایتی لوگ جو تھے، وہ کہتے تھے کہ یہ کیسی باتیں کر رہا ہے، انھوں نے زبان کا ستیاناس کر دیا ہے، ان کے کلام سے مثالیں لائی جاتی تھیں کہ دیکھیے زبان کا یہ حشر کر دیا۔ فیض سے مثالیں لائی جاتی تھیں۔ میرا جی تو خیر تھا ہی مطعون۔ تو مجھے لگتا ہے کہ نقاد کا بڑا اہم رول ہے اور تنقید ہمارے ادبی اظہار کا حصہ ہے۔ اس سے مفر نہیں ہے۔ اب ٹھیک ہے، اگر کوئی نقاد میرے ساتھ ناانصافی کرتا ہے تو میں اس نقاد کے بارے میں

جو بھی رائے قائم کروں اور میرا اس سے جو بھی رشتہ ہو لیکن میں تنقید کا جو رول ہے اس سے انکار نہیں کر سکتا ہوں اور ادبی تنقید کی جو بُری بھلی روایت اردو میں ہے، نہ اس سے انکار کر سکتا ہوں۔

طالب علم: سر آپ نے اپنا یہ جو ناول لکھا ہے ''بستی'' اس میں آپ نے بنگلہ دیش اور پاکستان کے معاملات زیرِ بحث لائے ہیں؟ ایک ادیب کی حیثیت سے آپ کیا سمجھتے ہیں کہ یہ واقعی المیہ ہے پاکستان کے لیے کہ اس کا ایک حصہ کٹ کر الگ ہو گیا، یا پھر یہ بنگلہ دیشیوں پر ہونے والے ظلم کا اختتام تھا؟

انتظار حسین: یہ اس پر ابھی گفتگو ہو چکی ہے اور باتیں بہت ---- یعنی اس ناول سے ہٹ کر میں کوئی تشریح نہیں کر سکتا۔ بھئی، جو کچھ ہے وہ اس ناول میں ہے۔ اصل میں اب آپ کا تعلق مجھ سے نہیں ہے، اس ناول سے ہے۔ (وقفہ) جب لکھنے والا ایک تحریر لکھ دیتا ہے تو پھر لکھنے والا درمیان میں نہیں رہتا، پھر آپ کا اور اس تحریر کا براہِ راست تعلق ہوتا ہے اور اسے تشریح بھی نہیں کرنی چاہیے اور اگر تشریح کرے گا تو زیادہ غلط کرے گا۔ اس پر آپ اعتبار نہ کریں۔ یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ غالب نے اپنے شعروں کی تشریح بالعموم نہیں کی۔ بعد میں بعض شعر جو انھوں نے خارج کر دیے تھے اور نسخۂ حمیدیہ میں ہیں، اگر غالب کو یہ احساس ہوتا کہ میں نے بڑا شعر کہا ہے اور اس میں معنی کی تہیں ہیں، تو وہ اس کو فراموش نہ کرتا۔ لیکن معلوم یہ ہوا کہ شاعر کو خود بھی کبھی کبھی پتہ نہیں ہوتا، پورے طریقے سے پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کیا اظہار کر رہا ہے۔ اگر آپ اس سے اس کے معنی پوچھیں گے اور وہ معنی بتائے گا، اس سے شعر کے معنی محدود ہو جائیں گے۔ غالب کے اشعار میں تہیں آپ کو نظر آتی ہیں، نقادوں کو اور قارئین کو، اگر ان اشعار کی تشریح خود غالب کر دیتا تو محدود ہو جاتا کہ غالب خود کہہ رہے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں، بات ختم ہوئی۔ تو شعر اور افسانے میں آپ لکھنے والے کے بیان پر بھروسہ نہ کریں۔ اسی ناول کے متعلق بھی میں یہ کہوں گا کہ میں جو کہہ رہا ہوں، اس پر بھروسہ نہ کریں۔ ناول پر بھروسا کریں۔

آصف فرخی: سوال بہت ہو گئے۔ کوئی اور سوال رہ گیا ہے اس وقت یا گفتگو ختم کریں۔

طالب علم: ایک سوال اور ہے، یہ کہ جس طرح ہمارے قومی وجود کو آج بھی بہت سے دھچکے لگ رہے ہیں، زخم لگ رہے ہیں، بلوچستان کا معاملہ ہے، کشمیر کا معاملہ ہے، سیاسی مسئلے ہیں۔ اس وقت بھی بہت ساری tensions میں اور ہماری پوری قوم زندگی ہے وہ بڑی سنگین ہے۔ آپ نے بنگلہ دیش کے بارے میں کہا تھا کہ وہ ہم سے دور تھا، وہ ہر فرد تجربہ نہیں بنا، گاؤں والوں کو نہیں پتہ چلا۔ آج جو پاکستان میں ہو رہا وہ ہمارے عوام کے سامنے ہے، وہ صبح شام دیکھ رہے ہیں، سن رہے ہیں۔ لیکن میں کبھی بھی نہیں سمجھتی کہ ہمارے نارورن ایریاز الگ ہو سکتے ہیں۔ تو ہم تو ابھی بھی اسی طرح کے ماحول میں ہیں اور یہ چیزیں بڑھتی جا

رہی ہیں۔ اس کے بارے میں بے شمار چیزیں لکھی گئی ہیں۔ آپ کی اپنی نظر میں کیا صورت حال ہے؟ ۷۱ء میں اس میں فرق ہے؟

انتظار حسین: یہ اس عہد کے حوالے سے آپ نے کہا جو کچھ ہو رہا ہے؟

طالب علم: جی، اس عہد کے بارے میں۔

انتظار حسین: تو یہ واقعہ ہے کہ اس وقت نہ صرف پاکستان ایک بہت بڑے آشوب سے دوچار ہے بلکہ پوری دنیائے اسلام۔ مسلمانوں کی پوری دنیا جو ہے اس پر آشوب کا عالم ہے۔ یہ اتنا کچھ ہو رہا ہے اس وقت، اور اس کے اثرات ہمیں اپنے ادب میں، عام زندگی میں زیادہ نظر نہیں آ رہے۔ ایسا کیوں ہے، اس کا بھی کسی کو تجزیہ کرنا چاہیے۔ اول تو اس وقت جس طریقے سے ہمارے حواس، ہماری عقلیں معطل ہو گئی ہیں، اس دور میں آ کر، مجھے لگتا ہے کہ ہمارا ادب وہ بھی کسی تعطل کا شکار ہے۔ اس طریقے سے جو واقعات گزر رہے ہیں، انہیں جس طریقے سے recieve کرنا چاہیے شاید کر نہیں رہا۔ یا شاید کر رہا ہو کسی سطح پر جیسا کہ انھوں نے ابھی اشارہ کیا تھا۔ اس کا اظہار آئندہ چل کر ہو گا۔ تو فوری طور پر اس کے اثرات نظر نہیں آ رہے۔ میں اس کا تجزیہ نہیں کر سکتا۔ تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ادب اس کے اثرات قبول نہیں کر رہا۔ ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر اس کے اثرات سے ظاہر ہوں۔ اس وقت مجھے یہی نظر آتا ہے کہ ہمارے لکھنے والے اس پورے آشوب کو پتہ نہیں کس نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے تو بہت بڑا آشوب نظر آتا ہے اور مجھے تو اب ۔ ۔ ۔ پہلے ایک نعرہ ہوا کرتا تھا اسلام خطرے میں ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اب اسلام خطرے میں ہے اور مسلمانوں کے ہاتھوں خطرے میں ہے، امریکا کے ہاتھوں نہیں۔ خود مسلمانوں کے ہاتھوں خطرے میں ہے۔

آصف فرخی: اچھا ۱۹۷۱ء کے واقعے کی بات کریں یا آج جو آشوب ہمارے سامنے ہے لمحہ بہ لمحہ آ رہا ہے یا آشکار ہو رہا ہے، آپ نے دیکھا کہ ناول یا افسانہ یا ادب کس طرح سے اس واقعے کی مختلف گرہوں کو کھولتے ہیں اور کتنے سارے سوال اس سے پیدا ہوتے ہیں، یہ جو گفتگو کا سلسلہ چلے گا، ہم اس میں بار بار پلٹ کر ان سوالوں کی طرف آئیں گے، خاص طور پر آخر میں ان محترم خاتون نے جو سوال پوچھا تھا یا پھر آپ کا جو سوال تھا، ان سوالوں کی طرف ہمیں دوبارہ آنے کی ضرورت پڑے گی جب ہم بات آگے بڑھائیں گے۔ اس پورے سلسلے میں ''بستی'' کا حوالہ بار بار آئے گا۔ آج کی بات ختم کرنے کے لیے میں ''بستی'' کا ایک ٹکڑا آپ کو پڑھ کر سنانا چاہتا ہوں۔ یہ ناول جس طرح پاکستان کی تحریک سے شروع ہوا، ذاکر کا بچپن ہم نے دیکھا تو بہت سے واقعات کے بعد ذاکر کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ ہندوستان میں اس کی بھولی بسری یاد ہے تو وہ ایک خط لکھنے کا ارادہ کرتا ہے اور اس ارادے کی تکمیل ہوتے تو ہم نہیں دیکھتے بلکہ وہ صرف سوچ لیتا

ہے کہ وہ ایک خط لکھے گا۔ وہ عرفان سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ میں ایک خط لکھنا چاہتا ہوں۔

(پڑھتے ہوئے)

"یار" وہ عرفان سے مخاطب ہوا، "میں اسے خط لکھنا چاہتا ہوں۔"

"اب" عرفان اس کا منہ تکنے لگا۔

"ہاں اب۔"

"اب جبکہ۔۔۔" عرفان پتہ نہیں کیا کہنا چاہتا تھا، بولتے بولتے چپ ہو گیا۔

"ہاں اب جبکہ۔۔۔" کچھ کہتے کہتے رکا، پھر اور طرف نکل گیا۔

"اس سے پہلے کہ۔۔۔" الجھ کر چپ ہو گیا۔

اس سے پہلے کہ۔۔۔ اس نے اپنے ذہن میں سلجھنے کی کوشش کی۔۔۔ اس سے پہلے۔۔۔ اس سے پہلے کہ اس کی مانگ میں چاندی سے بھر جائے اور چڑیاں چپ ہو جائیں، اور اس سے پہلے کہ چابیوں کو زنگ لگ جائے، اور گلی کے کواڑ بند ہو جائیں۔۔۔ اور اس سے پہلے کہ چاندی کی ڈوری کھولی جائے اور سونے کی کٹوری توڑی جائے اور گھڑا چشمے پہ پھوڑا جائے اور چندن کا پیڑ اور ساگر میں سانپ اور۔۔۔

چپ کیوں ہو گئے؟" عرفان ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

"خاموش۔" افضال نے انگلی ہونٹوں پہ رکھ کر عرفان کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ "مجھے لگتا ہے کہ بشارت ہو گی۔"

"بشارت؟ اب کیا بشارت ہو گی؟ عرفان نے تلخ مایوس لہجے میں کہا۔

"کاکے، بشارت ایسے ہی وقت میں ہوا کرتی ہے، جب چاروں طرف۔۔۔" کہتے کہتے رکا۔ پھر سرگوشی میں بولا: "یہ بشارت کا وقت ہے"

آصف فرخی

یہ "بستی" کا اختتامی صفحہ ہے جو میں نے آپ کے سامنے پڑھا، عزیز طالب علمو۔ اور انتظار صاحب، بشارت کے اس وقت کی نشان دہی کے لیے آپ کا ایک بار پھر شکریہ۔

۱۰/مارچ ۲۰۰۷ء

کراچی یونیورسٹی

☆☆☆☆

محمد عاصم بٹ

یوسف حسن: طرح دار علمی اور عوامی شخصیت

اپنے ہم عصروں میں یوسف حسن کی شخصیت گہری اور چمکدار انفرادیت کی حامل تھی۔ ان کا طرز بود و باش، خیالات اور زندگی کو سمجھنے کا انداز سب سے جداگانہ تھا۔ وہ مزدور تحریک سے وابستہ رہے۔ نظریاتی طور پر ترقی پسند خیالات کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے۔ کارل مارکس کی فکر کے دلدادہ تھے اور اسے انسانی زندگی کے معاشی و سماجی آلائم کے خاتمے کی کلید سمجھتے تھے۔ ان کے گھر میں جہاں ان کی بیٹھک تھی، ان کے کمپیوٹر کے گردا گرد کتابوں، رسالوں اور ایسے پرنٹس کے انبار پڑے دکھائی دیتے تھے جو انھوں نے انٹرنیٹ سے کارل مارکس کی تحریروں اور اس فکر پر لکھے گئے تنقیدی مقالوں کے لیے ہوتے تھے۔ یہ ہمیشہ سینکڑوں کی تعداد میں ہوتے۔ ان کے لکھنے کی میز پر دستے کی صورت میں کاغذ پڑے نظر آتے تھے جن پر وہ نوٹس لیتے۔ ان نوٹس کو جمع کر لیا جائے تو انھیں ایک قابل مطالعہ کتابی صورت میں مرتب کیا جا سکتا ہے۔

یوسف حسن مزدور تحریک کے کارکن، رہنما اور دانشور تھے۔ مزدور جلسوں میں حاضری دیتے، تقریریں کرتے، جلوسوں میں شریک ہوتے۔ ان مزدوروں کی طرح جیتے مرتے تھے۔ ان کے ساتھ فٹ پاتھوں پر بیٹھ جاتے، تھڑا ہوٹلوں میں چائے پیتے، ویگنوں بسوں میں سفر کرتے۔ وہ اندر سے ایک مزدور ہی تھے۔ قلم کے مزدور۔ انھوں نے قلم سے جہاد کیا اور جس نظریے کو وہ راست سمجھتے تھے، اس کے فروغ کے لیے زندگی بھر کوشاں رہے۔

یوسف حسن نے عمر عزیز اردو ادب کی تدریس میں بسر کی۔ آپ ایک شفیق استاد تھے۔ اشاعت کتب کے کاروبار سے بھی وابستہ رہے۔ کتابوں کی فروخت کے لیے ایک دکان بھی ’گندھارا بکس‘ کے نام سے قائم کی جو ایک عرصہ تک راولپنڈی میں علم و ادب کا گہوارہ اور کتاب سے محبت کرنے والوں کی مرکز نگاہ بنی رہی۔ یوسف حسن کی شخصیت میں ایک ساتھ کئی شخصیتیں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ سبھی اپنی جگہ اہم تھیں لیکن ان تمام حیثیتوں میں جو یوسف حسن کی ذات سے منسوب تھیں، ان کی جو حیثیت دب کر رہ گئی اور جو ان کی شخصیت کا سب سے اہم حوالہ تھی، وہ ایک شاعر کی حیثیت تھی۔

یوسف حسن کا ایک شعر ان کی طبیعت کی روانی اور ندرت خیال کی مثال کے طور پر یہاں پیش کرنا چاہوں گا۔

یوسف یہ کون ہم کو خلا میں اچھال کر
اندازہ کر رہا ہے زمیں کے کھنچاؤ کا

اور یہ چند اشعار بھی آپ کی داد کے مستحق ہیں۔

بن گئے پاؤں کی زنجیر پہاڑی رستے
چند قدموں کی مسافت تھی، سفر میلوں کا

کس طرح شعلہ بجاں خاک بسر آیا ہوں
تو نے دیکھا ہے تو دنیا کو نظر آیا ہوں

کوئی پرتو ہے نہ سایہ اس کا
جس کے ہونے سے ہے ہونا اپنا

اسی کھنڈر میں مرے خواب کی گلی بھی تھی
گلی میں پیڑ بھی تھا، پیڑ پہ ثمر بھی تھا

یوسف حسن کے ابتدائی دور کی شاعری حسن و رومان جیسے موضوعات پر مبنی ہے لیکن بعد میں اس میں فکری گیرائی و گہرائی بڑھی اور ترقی پسند رجحانات نے ان میں اظہار کی راہ پائی۔ ان کا رومان پسند شاعر ہی انھیں ترقی پسندی اور اشتراکیت پسندی کے خارزار کی طرف لایا اور استحصال کے خلاف احتجاج پر آمادگی کی راہ پر ڈالا۔ زندگی سے، اور عام لوگوں سے یوسف حسن کی جڑت غیر معمولی طور پر مضبوط اور گہری ہے۔ اسی مزاج کی افتاد نے ان کے زاویہ نگاہ اور شخصیت و فن کو ایک خاص رنگ دیا۔

لیکن ان کی شاعری، جو گاہے بگاہے مختلف جرائد میں باقاعدگی سے شائع ہوتی رہی، کبھی کتابی صورت میں سامنے نہیں آسکی۔ یہ شاعری مجموعی طور پر ایک سے زائد کتابوں کے مواد کے برابر تو ہوگی اور یقیناً ان کے کاغذات میں موجود ہوگی۔ ہم جو یوسف حسن سے نیازمندی کا دم بھرتے اور ان کے حجرے پر حاضر ہوتے تھے، کبھی ان سے شعری مجموعہ کی اشاعت سے متعلق سوال اور اسے چھپوانے پر اصرار کرتے اور پوچھتے کہ کیوں اب تک شعری مجموعہ نہیں چھپوایا تو ہمیشہ آپ کا جواب ایسے سوالوں پر یوں ہوتا کہ 'جالے ویکھ رہیا ہاں'۔

ہمارا خیال تھا کہ آپ کی شاعری میں بڑا حصہ جوانی کے دور میں لکھی گئی شاعری پر مشتمل تھا اور یقیناً حسن و رومان کے ذکر کے بغیر نہیں تھا۔ لیکن اب عمر کے اس حصے میں شاید وہ ان اشعار کو چھپوانے سے گریزاں تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ انھیں یا تو مسترد کرتے رہتے یا ان میں پختگی عمر کے ساتھ پیدا ہونے والے

نئے ذہنی رجحانات کی روشنی میں ترامیم کرتے رہتے تھے۔

کبھی ہم دوست مل کر ان سے اصرار کرتے کہ مسودہ آپ ہمارے حوالے کر دیں۔ ہم پیسے ملا کر اسے چھپوانے کا بندوبست کر لیں گے۔ ان کا جواب ہوتا: "جلدی کیا ہے بھئی۔ مسودہ کون سا بھاگا جا رہا ہے۔ دیکھ رہا ہوں۔"

ہم کہتے کہ یہی وقت ہے۔ اسے چھپ جانا چاہیے۔ اور یہ کہ اگر یہ اب نہ چھپا تو پھر کبھی نہیں چھپ سکے گا۔ تو وہ اکتا کر کہتے: "بس ایچ ای اے۔"

یوسف حسن سے میری ملاقات راولپنڈی میں ان کی دکان پر ہوئی جو انھوں نے کالی ٹینکی سٹاپ کے قریب ہی ایک پلازے میں قائم کر رکھی تھی۔ راولپنڈی اور اسلام آباد سے سینئر اور جونیئر لکھنے اور پڑھنے والوں کی بڑی تعداد اس دکان سے رجوع کرتی۔ ان میں سے چند ایک تو ایسے تھے جو روزانہ شام کو دکان پر حاضری دیتے۔ یوں رات تک وہاں اہل علم و ادب کی بڑی تعداد اکٹھی ہو جاتی۔ یہ بیٹھک برسوں وہاں قائم رہی۔

یہ بیٹھک جس مختصر دکان میں قائم کی گئی تھی، وہاں کتابوں اور کاغذوں کے انبار سے ڈھکا ہوا ایک میز سامنے کی دیوار سے لگا رکھا ہوتا تھا جس کے پیچھے یوسف حسن بیٹھے جیسے مسلسل سگریٹ پھونکتے۔ ان کا رخ دکان کے بیرونی دروازے کی طرف ہوتا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ کتابوں سے لدے پھندے لوہے کے شیلف قطار میں کھڑے ہوتے۔ کمرے میں آمنے سامنے کرسیاں پڑی ہوتی تھیں۔ شرکا زیادہ ہو جاتے اور ایسا اکثر ہوتا تھا تو برابر کی دکان سے مزید کرسیاں منگوالی جاتی تھیں۔ حتی کہ کتابوں کے بندھے ہوئے ڈبوں پر بھی لوگ بیٹھ جاتے۔ رات ہوتے ہوتے وہاں عمومی طور پر بیس ایک لوگ اکٹھے ہو جاتے۔ خصوصی محافل میں یہ تعداد کئی گنا ہو جاتی تھی۔

ان بیٹھکوں میں مارکس ازم پر بات ہوتی، سرمایہ داریت کے پرخچے اڑائے جاتے، ادبی امور زیر بحث لائے جاتے۔ لطیفے سنائے جاتے، ذاتی باتیں کی جاتی تھیں، اور گزرے ہوؤں کو یاد کیا جاتا۔ اختلافی موضوعات پر بحثیں بھی کی جاتی تھیں۔ اختلاف کو خوش آمدید کہا جاتا۔ بات دلیل سے کرنے پر اصرار کیا جاتا۔ جذباتی ہونے کی ممانعت تھی۔ یوسف حسن کبھی اختلافی گفتگو کا برا نہیں مانتے تھے۔ بلکہ زیادہ توجہ سے ایسی بحثوں میں حصہ لیتے۔ ساتھ ساتھ لطیفے بھی جاری رہتے، چائے بھی منگوائی جاتی۔ ہنسی دل لگی کی باتیں بھی ہوتی تھیں۔ وہ کبھی غصے میں نہیں آتے تھے۔ ان کی گفتگو میں شاذ ہی کبھی بے ربطی آتی۔ دلیل سے بات کرتے۔ دوستوں کی طرح سمجھاتے، اور ساتھ ساتھ سر ہلا کر ایسا اشارہ بھی دیتے کہ جیسے وہ بات کرنے والے کو بھی سمجھ رہے ہوں۔ بات کرنے والے کو حوصلہ بھی دیتے رہتے، اسے ڈٹے رہنے پر اصرار کرتے۔ خود بھی پیچھے نہ ہٹتے

تھے۔ نہ الجھتے، نہ الجھانے کی کوشش کرتے اور نہ کبھی ہار مانتے تھے۔ کبھی جب فضا بحث کے تناؤ سے مکدر ہو جاتی تو کسی کو کہتے ”چل یار چاء تے پلا۔“

مالی و دیگر دگرگوں حالات کی وجہ سے وہ دکان بند ہو گئی تو انھوں نے کتابیں اٹھا کر اپنے گھر میں رکھ لی تھیں۔ کتابوں کے حوالے سے ہمارا ان سے ایک اور رشتہ بھی تھا۔ انھوں نے مجھ جیسے بہتوں کے اکاؤنٹس اپنے رجسٹر میں کھولے ہوئے تھے۔ ہم وہاں جاتے تو وہ بتاتے کہ دیکھو یہ کتاب نئی آئی ہے، یا یہ کتاب نایاب تھی، لیکن اب چھپی ہے۔ پھر اس کے مندرجات پر بات ہوتی۔ وہ ہماری آتش شوق کو بڑھاتے۔ اور کتاب ہمیں تھما دیتے۔ شروع میں تو ہم کسی طور پوری قیمت ادا کر کے کتاب خریدتے رہے لیکن پھر انھوں نے خود ہی رعایت دی کہ پوری رقم یک مشت دینے کی ضرورت نہیں۔ تم لوگ بھی نوکری پیشہ ہو۔ تھوڑا تھوڑا کر کے ادا کرتے رہو۔ لیکن ادائیگی ضرور کرنا۔ مہینے کے مہینے تنخواہ ملنے پر کوئی پانچ سو روپے پیش کرتا، کوئی دو سو اور کوئی سو۔ سب کے حساب میں سے اتنی رقم منہا کر لی جاتی۔ ہمارے اکاؤنٹس میں واجب الادا رقم کبھی کبھار دس ہزار سے بھی زیادہ ہو جاتی۔ لیکن وہ چکائی جاتی، یونہی پانچ پانچ سو یا سو سو روپے کر کے۔ اس شاہانہ سہولت نے ہمیں کتابوں کے معاملے میں مالا مال کر دیا تھا۔

اسی دکان میں گندھارا فورم بھی قائم کیا گیا اور پھر اس کے تحت ایک عرصے تک ماہانہ بنیادوں پر سیمینار بھی کروائے گئے۔ زیادہ تر سیمینار لیکچرز پر مشتمل ہوتے تھے۔ کسی ماہر علم و ادب سے بات کرنے کو کہا جاتا، اور پھر سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوتا جس میں سب سے فعال خود یوسف حسن ہی کی ذات ہوتی۔ وہ بے تکلفی اور سادگی کے ساتھ سوال پوچھتے تھے اور کبھی ان کی گفتگو معمولی سے بھی تعصب سے آلودہ نہیں ہوتی تھی۔ جن سے نقطۂ نظر کا مستقل اختلاف تھا، ان سے یوسف حسن کی گفتگوئیں زیادہ سہل، خوش گوار اور لطیف ہوتی تھیں۔

ان کی بیٹھکوں میں جو احباب اکثر و بیشتر تشریف لاتے تھے، ان میں جلیل عالی، ڈاکٹر سرور کامران، شفیع ضامن، ڈاکٹر نوازش علی، ڈاکٹر رشید امجد، اختر عثمان اور عمران جہانگیر شامل تھے۔ ان کے علاوہ بھی ایک کھیپ نئے اور پرانے لکھنے والوں کی وہاں شام کو اکٹھی ہوتی تھی۔ ان میں ڈاکٹر سعید احمد، داؤد رضوان، کامران کاظمی، ڈاکٹر صلاح الدین درویش، ڈاکٹر روش ندیم اور ڈاکٹر ارشد معراج اور راقم شامل ہوتے تھے۔

آپ اس بات کے سخت خلاف تھے کہ مارکسی نقطۂ نظر کی حمایت کرتے ہوئے مذہب کی مخالفت کی جائے۔ مارکس نے مذہب کو افیون کہا تھا تو اس کا سیاق و سباق مختلف تھا۔ یوسف حسن مذہبی آدمی نہیں تھے، لیکن وہ غیر مذہبی بھی نہیں تھے۔ عام انسانوں کی طرح ان میں خوف بھی تھا، اور ٹیڑھ بھی۔ نماز نہ پڑھنے کی حد تک غیر مذہبی تھے۔ لیکن مذہب مخالف نہیں تھے۔

”مذہبی ہو کر بھی مارکسی ہوا جا سکتا ہے۔“ وہ اصرار کے ساتھ کہتے۔ وہ خاص کر مولانا حسرت موہانی کی مثال دیتے۔ آپ کی اپنی زندگی بھی خود اس مثال سے موافق تھی۔

ایک مرتبہ آپ نے مارکس ازم اور انفرادیت اور فرد کی آزادی پر ایک مضمون لکھا اور وہ کسی اخبار میں چھپوایا۔ اس مضمون نے اس موضوع پر خاصی دھواں دھار بحث کو ہوا دی۔ ہم نئے لکھنے والوں کی کھیپ ان سے جا کر بحثیں کرتی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ مارکس ازم میں انفرادیت اور فرد کی آزادی کی گنجائش نہیں ہے۔ اس نقطے پر بحث چھڑ گئی۔ یوسف حسن کا کمال یہ تھا کہ وہ آپ کو ایسی خفیہ ہلہ شیری دیتے کہ لگتا آپ نے کیا ہمت کی تھی اور کیسے دھڑ لے سے ان سے اختلافی بحث شروع کر دی تھی۔ حالاں کہ آپ اکسائے گئے ہوتے تھے۔ آپ کو ورغلایا گیا ہوتا تھا۔ کھینچ کھانچ کر اس بحث میں گھسیٹا گیا ہوتا تھا۔ میں نے اپنی بات پر زور دیا کہ مارکس کے لیے فرد کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ معاشرے کی بات کرتا ہے۔ اس کے لیے جز و اہم نہیں ہے، کل اہم ہے۔

شاید میں نے یہ بات ناپختگی سے کچھ زور دے کر کہی تھی۔ انھوں نے دیر تک اس کی وضاحت میں مارکس ازم کی باریکیاں واضح کیں۔ مارکس ازم سے متعلق جو نکات یوسف حسن کو معمولی سا جذبات کا تڑکا لگا دینے کے بعد ان سے سننے کو ملتے تھے، وہ ان کی عام گفتگوؤں میں ممکن نہیں تھے۔

میں نے حجت کرتے ہوئے کہا کہ ریاست خود ایک طبقہ ہے۔ جو استحصال کرتا ہے۔ انھوں نے کہا، ”آسی ہیگلے او، پوسٹ ماڈرنسٹ۔“ میں نے اس پر بھی اختلاف اور احتجاج کیا تو کہنے لگے، کہ پوسٹ ماڈرنسٹ پہلے مارکسی ہی تھے۔ مارکس ازم پر مشکل وقت آیا تو یہ اس سے علیحدہ ہو گئے۔ کچھ سرمایہ داریت کی چکا چوند سے متاثر ہوئے اور نئی ترقیوں نے نئے ذہنوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ پھر گفتگو کے آخر میں بولے ”بس ایہی جیہی گل اے۔“

شگفتہ بیانی بھی آپ کی شخصیت کا ایک خاصہ تھی۔ کئی ایک جملے یوسف حسن کے کہے ہوئے آج بھی ہماری یادداشتوں کو جالتے ہیں۔ ایک موقع پر جب ایک شاعر نے ادبی مجلس میں اپنی شعری کاوش برائے تنقید پیش کرنے سے پیشتر اس کی فوٹو کاپیاں کروانے کی اجازت چاہی تو اس سے کہا کہ فلاں دکان سے فوٹو کاپی کروا یئے گا جہاں لکھا ہوا ہے، ’اصل سے بہتر‘۔

ان کی کتابوں کی دکان میں محفل گرم تھی خوب گرما گرم بحثیں ہو رہی تھیں۔ کسی نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا ’اجازت دیجیے میں چلتا ہوں۔‘

یوسف حسن نے جواب دیا۔ ”دھیان سے۔ ذرا پرے ہو کر چلیے گا۔ پہلے ہی یہاں بہت گھڑمس ہے۔“

اپنی صحت سے انھوں نے اتنی ہی بے اعتنائی برتی، جتنی انھیں اس طرف توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ بہت کم لوگوں کو پتہ تھا کہ انھیں کینسر ہوگیا تھا۔ شاید انھوں نے کبھی اس کا علاج بھی ڈھنگ سے نہ کرایا ہو۔ اور کیا پتہ اس کے بگڑ جانے تک انھیں اس کا علم ہی نہ ہوا ہو۔

چند برس پہلے میں لاہور منتقل ہوگیا تو ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ رابطہ بھی نہیں رہا۔ لیکن ان کے بارے میں خبریں ملتی رہیں۔ کبھی وہ لاہور آتے تو ملاقات کی صورت نکلتی۔ ایک بار پرانی انارکلی میں وہ ترقی پسند تنظیم کے چند اراکین کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ اسی تنظیم کے تحت منعقد کی گئی کسی تقریب میں تشریف لائے تھے۔ وہاں ہوٹل کے باہر فٹ پاتھ پر کرسی پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ میں بھی پاس ہی جا بیٹھا۔ ''او وہ لاہور یے آئے۔'' انھوں نے مسکرا کر کہا۔ کچھ ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں میں نے پھر سے ان کے شعری مجموعے کی اشاعت کی بابت سوال کیا۔ بولے ''تے فیر ساریاں نوں کہہ کے چھپوا دوو۔''

میں نے کہا کہ سارے تیار ہو جائیں گے، آپ ہی نہ بھاگ جایئے گا۔ تو کہنے لگے کہ ''اچھا فیر۔ جا لے ٹھہرو، میں اک واری فیر ویکھ لواں۔ سمجھیا کرو۔ ویکھنا ضروری ہوندا اے۔''

اس بات کو چند سال بیت گئے۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ ہسپتال میں ہیں۔ پھر ان کی سناؤنی آ گئی۔ الطاف حسین اسد نے ان کی وفات پر انگریزی میں مضمون لکھا تو خیال آیا کہ ان سے ملاقاتوں اور ان سے جڑی یادوں کا ایک مختصر خزانہ میرے پاس بھی موجود ہے اور ابھی تازہ تھا۔ میں نے فقط ان یادوں کو صفحوں پر بکھیرنے کی کوشش کی ہے۔

کسی بھی زندہ شے کا نیست ہو جانا ناگزیر ہے کہ چلے جانے سے مفر ممکن نہیں ہے لیکن ہر شے کائناتی نظام میں کچھ جگہ رکھتی ہے جو اس کے چلے جانے سے عارضی طور پر خالی ہو جاتی ہے اور یہ خلا پُر ہونے میں وقت لیتا ہے۔ یوسف حسن کے چلے جانے سے جو خلاء اس کائناتی نظام میں پیدا ہوا ہے وہ چاہے بھر جائے، ان کے جاننے اور چاہنے والوں کے دلوں میں ایک طویل عرصے تک یا شاید کبھی پُر نہیں ہوگا۔ ان کے جانے سے دنیا کی خوبصورتی میں مزید کمی آ گئی ہے۔ ایک خوبصورت، بھلے مانس، طرح دار اور محبت کرنے والا شخص ہمارے درمیان میں سے اٹھ کر چل دیا۔ محفل کو سُونا کر گیا۔

☆☆☆☆

ادریس بابر

یوسفی صاحب: آبِ گُم سے خوابِ گُم تک

ایک زمانے تک باقی ساری دنیا جس بچے کے لیے، خود اسی کے بقول، بیرون- بیکانیری گیٹ تھی، وہ بڑا ہوا تو ساری دنیا کو اس گیٹ کے اندر کھینچ لایا۔ وہ بھی کسی تیغ و تبر کے بل بوتے پر نہ کسی طبل و علم کے زور شور سے۔ بلکہ محض اپنے قلم کی طاقت سے۔ ایک بار جو اس چراغ تلے بیٹھ گیا، وہ روشنی کے اس محیط سے کبھی نہ نکل پایا جس کا نام مشتاق احمد یوسفی ہے۔

یوسفی صاحب کے لیے تفضیل-کل سے ادھر کم ہی کوئی صیغہ استعمال ہوا ہے۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یوسفی صاحب کے مزاح کے بارے میں بہت اچھا یا کم اچھا کافی کچھ کہا جاتا رہا ہے اور یقینی بات ہے کہ مزید بھی کہا جائے گا۔ اس سلسلے میں جو بات متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی وہ چراغ تلے کے معصوم شرارتی انشائیوں سے لے کر خاکم بدہن کے بھرپور و سرور مزاح تک اور زرگزشت کے سنجیدہ مسخاکوں سے لے کر آب-گم کے بھرپور بے پناہ اسلوب تک ایک شاندار، جاندار ارتقا ہے۔

جیسے اینڈ سنز سے کوئی کتاب خریدے بغیر خوشی خوشی نکلیں تو ممکن ہے تھڑے ہی پر آپ کا ٹاکرا پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم-اے بی-ٹی (گولڈ میڈلسٹ) سے ہو رہے۔ ان کا بایاں پاؤں ٹھیک وہاں پڑ رہا ہوگا جہاں ۔ ۔ ۔ اور دایاں بھی، آداب! گلی کی نکڑ پر خان سیف الملوک خان ابدالی سمیت آپ کے منتظر ہوں تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ بشارت میاں کا خاندانی "ٹال" زیادہ دور نہیں جہاں ایک اور بردبہ کے خاندانی خان سے مل کر مرگ-کمبوہ چشتے وارد کا نعرہ بلند کریں تو تعجب کیسا۔

یہ سراغ لگانا تو کسی محقق کا درد-سر ہو سکتا ہے کہ مشتاق احمد یوسفی نے اپنا ادبی ہمزاد محض اتفاق سے دریافت کیا تھا یا خوب سوچ سمجھ کر چنا تھا۔ لیکن یہ طے ہے کہ مرزا عبدالودود بیگ کا ورود اردو ادب کے حق میں نہایت مسعود ثابت ہوا۔ شفیق الرحمان کے شیطان اور رضیہ، محمد خالد اختر کے چچا عبدالباقی اور بھتیجے بختیار خلجی کی طرح یوسفی کے کرداروں کا نگار خانہ وسیع بھی ہے اور رنگا رنگ بھی۔ لطیفی سے اینڈرسن تک، فینی سے فاروقی تک، بائی فوکل کلب سے دھیرج گنج تک ۔ ۔ ۔ یادش بخیریوں کا ایک جہان آباد ہے۔ تاہم مرزا کی ذات ہی نہیں بات بھی الگ ہے۔

شامِ شعرِ یاراں کی گھپ اندھیری رات میں غروب ہونے سے پہلے تک اردو مزاح کا آفتاب نصف النہار پر ہی تھا۔ نئی صدی کے آغاز میں یوسفی صاحب کی پہلی تین کتابوں کے کمپوزنگ شدہ ایڈیشن بازار میں برآمد ہوئے تو دیکھ کر ذرا خوشی نہ ہوئی۔ ان جملہ لطایف الحیل کے ایک طرح سے ضائع جانے کا دکھ کوئی ان کے چاہنے والوں سے پوچھے جو کسی بھی مصنف اور اس کے کاتب کے درمیان دلچسپ ترین مکالموں سے عبارت تھے، اور جنھوں نے ان کتابوں کے پیش لفظ تک کو ایک ادبی شہکار کا درجہ دے ڈالا تھا۔

ناقدین کا کہنا ہے اور بجا بھی ہے کہ جنسیات پر کبھی ڈھکا چھپا اظہار تو کہیں کھلم کھلا وار ان کے کام کو خالص مزاح کے بلند تر درجے سے اتار کر بلکہ بعض اوقات تو دھکا مار کر ضلع جگت کی سطح پر لے آتا رہا ہے۔ پھر اس کے بالکل برعکس صورت حال کا سامنا تب ہوتا ہے جب ان کا اعلانیہ محدود مشاہدہ ان کے مبینہ لامحدود مطالعے کا ساتھ نہیں دے پاتا۔ سارے جہاں کا علم ہماری نظر میں ہے۔ اور ہماری نظر ہے کہ جنس سے ہٹ کر نہیں دیتی۔

گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ کے لائبریرین کو سختی سے ممانعت تھی کہ اس اسٹوڈنٹ کو ایک بھی غیر نصابی کتاب ایشو ہوئی تو دونوں کی خیر نہیں۔ آخر اسے پورے ڈویژن میں ٹاپ کرنے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا نہ کہ کوئی شاعر ادیب بننے کے لیے۔ تدبر سے کام فرمانے والے خیر خواہوں کو کم خبر تھی کہ اس نوجوان مسلم پر نصاب ہی میں شامل خدائے سخن کی مشہور غزل کے مطلع نے صادق آنا تھا، اور ان سب تدبیریں نے الٹ کے رہ جانا تھا۔

اپنے دوسرے اسکالرشپ سے اس نے جو پہلی کتاب خریدی وہ اردو کی آخری کتاب تھی۔ جو خوش قسمتی سے محض نام کی حد تک آخری ثابت ہوئی۔ اس کے بعد کتابوں کا جو پرا گا اس کی زندگی میں آیا، اس میں تمام کتابیں طنز و مزاح پر مبنی تھیں۔ حماقتیں، مزید حماقتیں، اور لہریں۔ خمارِ گندم اور بجنگ آمد۔ (چاکیواڑہ میں وصال اسے اگلے سال نصیب ہوا) اور، خاکم بدہن، سب سے بڑھ کر وہ کتاب جو اس نے تانگے میں بیٹھتے ہی کھولی تو مسکراہٹ سے قہقہے تک کی منزل اردو بازار سے گھر تک کے مختصر سفر سے بھی کہیں پہلے طے ہو گئی۔

گھر سے تو وہ انجینئر بننے نکلا تھا، لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اس لڑکے کی تحریریں ادھر ادھر ادبی رسالوں جریدوں میں چھپنے لگیں۔ اکادمی ادبیات کو جانے کیا سوجھی کہ اسے ادیبوں دانشوروں کی قومی کانفرنس میں بلا بھیجا گیا۔ سینئرز سے مکالمے کے لیے ہمہ تن گوش، مشاہیر سے ملاقات کے لیے پرجوش ہم عصروں کے مقابلے میں وہ اپنے یا دوسروں کے فوٹو کھینچنے سے پتا نہیں کیوں دور ہی دور رہا۔ پھر بھی اپنے فیورٹ دیو قامت

ناول نگار کے ساتھ فوٹو کے لیے اسے ایک دوست سے درخواست کرتے ہیں۔

دوسرے فوٹو کے لیے اس کی بھاگ دوڑ البتہ دیدنی تھی۔ خود اسی کی سی نا قابل رشک صحت کا مالک، منحنی ادیب کانفرنس کے اس کم عمر ترین مندوب اور اپنے گمنام ترین فین کی بوکھلاہٹ دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہا۔ مسکراتا ہی نہیں، ہلکا پھلکا سا شرماتا بھی رہا، جیسے فوٹو اس کے اپنے اصرار پر ہی تو لی جا رہی ہو۔

آج کوئی بیس برس بعد، دل نوازی کی وہ عطا دلبری کی وہ ادا یاد کیا آئی، کہ وہ یوسفی مسکان ان یعقوبی آنکھوں میں نمی بن کے پھیل گئی۔

☆☆☆☆

شاخِ زماں آئینہ ہے، باغ مکاں آئینہ ہے

(بین الاقوامی ادب سے تراجم)

ڈورس لیسنگ

انگریزی سے ترجمہ۔ حمید رازی

سؤر

زمیندار نے ہفتے کی شام مزدوروں کو تنخواہ کی ادائیگی کر دی۔ یہ کام اختتام کو پہنچا تو ساتھ ہی اندھیرا چھا گیا اور رسوئی میں ٹنگی لالٹین کی روشنی سے درخت اور اس کے نیچے کالے چہرے چمک اُٹھے۔ اس ہفتے کی تنخواہ وصول لینے کے بعد لوگ تتر بتر ہونے کے بجائے درخت کے نیچے کھڑے ہو گئے اور وقت گزاری کے لیے گپ شپ میں مشغول ہو گئے۔ جب آخری شخص کو بھی ادائیگی ہو گئی تو زمیندار بولا "اب خواتین اور لڑکوں کو بھی بلاؤ، ہر کوئی یہاں موجود ہونا چاہیے"۔ نوکر جو میز کے قریب ہی کھڑا تھا اور لوگوں کو آواز دے رہا تھا، آگے بڑھا اور یہ حکم دُہرا دیا مگر کسی اور لہجے میں۔ وہ لوگوں کو سالوں سے ایسے ہی آوازیں دیتا تھا۔ مجمعے میں کچھ ہل جل ہوئی وہ خواتین جو درختوں کے نیچے منتظر تھیں، آگے بڑھیں تو اُن کے لباس روشن ہو گئے۔

اب آدھے روشن چہروں کو اُمید تھی کہ یہ رسم جلد ہی اختتام کو پہنچے گی اور وہ اپنی جھونپڑیوں میں آگ کے قریب جا سکیں گے۔ کسی کے کہے بنا ہی وہ اور قریب آ گئے۔ زمیندار نے بولنا شروع کر دیا، جیسے زمین سے باتیں کر رہا ہو، جو اُس کے سامنے بچھی پڑی ہو اور اندھیرے کی وجہ سے آنکھ اوجھل ہو۔ وہ پہلے بھی یہ کئی بار کر چکا تھا لیکن آج وہ بہت غصے میں تھا۔ اسے علم تھا یہ صرف وقت کا ضیاع ہے، اسے یاد آیا کہ سورج کی روشنی میں فصل کیسے چمک اٹھتی ہے، اس یاد سے اُس کے لہجے میں مزید کڑواہٹ آ گئی۔

مسئلہ یہ تھا کہ رات کو کالے ہاتھ چھلیاں توڑ لیتے اور وہ چوروں کو کبھی بھی پکڑ نہ سکا۔ اگلی صبح وہ قدموں کے نشان دیکھتا، اس نے ہر جتن کیا، ڈرایا دھمکایا، راشن گھٹایا اور جرمانہ بھی کیا لیکن اس سے کوئی فرق نہ پڑا۔ جب فصل آتی وہ اندازے سے کم نکلتی۔

جب ہر کوئی اس بات کو جانتا ہے تو دسویں بار بتانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ وہ سوال تھا جو زمیندار نے لوگوں کے چہروں پر لکھا پڑھ لیا۔ لوگ تنگ پڑ چکے تھے۔ انھیں جھونپڑیوں میں جانے کی جلدی تھی جہاں گرم کھانا اُن کا منتظر تھا، زمیندار کو غصہ آ گیا اور گفتگو کرنی بند کر دی اور زور سے مکا میز پر مارا تا کہ ہر کوئی اس کی جانب متوجہ ہو جائے۔

"جولس" زمیندار بولا۔ ایک لمبا تڑنگا شخص آگے بڑھا۔ وہ دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک لگ رہا تھا۔

زمیندار نے اس کی طرف دیکھا اور لڑائی کے لیے کلاوہ مار لیا۔ وہ سالوں سے کھیتوں میں کام کر رہا تھا، زمیندار اُسے پیار سے بوڑھا بد معاش کہتا ہوتا تھا۔ وہ اسے اچھا لگتا تھا اور وہ عرصے سے اکٹھے تھے۔ جولس آدھا سال پانی بھرتا، جڑی بوٹیوں کا علاج کرتا اور گھاس کاٹتا۔ فصل آنے کا وقت آتا تو اس کی قدر و منزلت اور بڑھ جاتی۔

"جولس ادھر آؤ۔" زمیندار بولا اور کرسی کے ساتھ پڑی بندوق اٹھائی۔ جولس ساون میں دن کے وقت جھونپڑی میں سوتا اور رات کو کھیتوں کی حفاظت کرتا جہاں ہرن اور سؤر فصل پر حملہ کرتے۔ سؤر تو ایک ہی رات میں کئی ایکڑ ستیاناس کر دیتے۔ اُس نے بندوق پکڑی اور کاندھے پر اس کا وزن محسوس کیا۔ وہ کچھ مایوس سا لگ رہا تھا۔

"جولس، اس سال جو شے بھی نظر آئے پھڑکا دینا۔"

"تم سمجھ گئے ہو؟"

"جی مالک۔"

"ہر شے، ہرن، بابون اور سؤر، جو بھی دیکھو چھوڑو گے نہیں، آواز بھی آئے تو گولی چلا دینا"، لوگوں میں ہل جُل ہوئی اور کچھ شور بھی ہوا۔ "اگر دو ٹانگوں والا سؤر نظر آئے تو پھر بھی ایسا ہی کرنا ہے۔ میری زمینیں سؤروں کے لیے نہیں؟

جولس کچھ نہ بولا، وہ کاندھے پر بندوق رکھ کے لوگوں سے مخاطب ہوا۔

"اب تم جا سکتے ہو" کچھ دیر بعد اس کے سامنے خالی میدان پڑا تھا۔ وہ اندھیرے رستے پر اُن کے ننگے پاؤں کی آواز اور غصے بھری باتیں سن سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے جولس؟"

"میں اس سال گولی نہیں چلاؤں گا۔" زمیندار کسی اور بات کا منتظر تھا، وہ اپنے حکم پر پریشان نہ ہوا۔ جولس کئی سالوں سے یہاں کام کر رہا تھا۔ اُس نے کبھی کسی پر گولی نہیں چلائی تھی۔ چور ہر سال اپنا کام دکھا جاتے اور وہ بندوق لیے پھرتا رہتا۔ وہ گھس بیٹھیوں کو ڈرانے کے لیے ہمیشہ ہوائی فائر کرتا۔ یہ سب ڈراوا ہی تھا، ہو سکتا ہے اس دھمکی سے کچھ ڈراکل ڈر جاتے ہوں، ورنہ سب کو پتہ تھا وہ ہوائی فائر کرتا ہے۔

چھلیاں چوری ہو جاتیں اور وہ کچھ نہ کر پاتا۔

"تم گولی کیوں نہیں چلاؤ گے؟" زمیندار نے پوچھا۔

"اس کی وجہ میری بیوی ہے، میں آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔" جولس بولا۔

"ہاں تیری بیوی!" زمیندار کو یاد آ گیا۔ جولس پرانے زمانے کی روح تھی، اُس کی دو بیویاں تھیں۔

پہلی میں سے کئی بچے تھے جب کہ نئی نے اس کا ناک میں دم کر رکھا تھا جب سے پچھلے سال سے نئی بیوی آئی تھی، وہ راتیں باہر رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔

"دن کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے" زمیندار نے مذاق سے پوچھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اندر چلا گیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ اسے اپنے ہی لوگوں پر محافظ بننا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اُس نے کبھی مالک کا پورا حکم نہ مانا۔ وہ رات جھاڑیوں میں پھرنے کے بجائے گھر رہنا چاہتا تھا۔ اُسے پچھلے سال سے یہ کام اچھا نہیں لگتا تھا، اس سال تو اور بھی بُرا لگ رہا تھا۔ جب وہ باہر ہوتا تو ایک نوجوان اُس کی خوبصورت بیوی کے پاس آیا کرتا تھا۔

ایک دفعہ اس نے بیوی کو مارنے کے لیے چھڑی بھی اٹھائی، پھر نیچے پھینک دی۔ وہ بوڑھا تھا اور دوسرا شخص جوان۔ بیوی کو پیٹنے کا کیا فائدہ۔ اُس نے مالک سے بھی بات کی لیکن اُس نے بھی کچھ نہ کیا۔ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس نے یہی لفظ دہرائے، اور لالٹین کو اس انداز سے پکڑا تا کہ اس کی روشنی جھاڑیوں تک جا سکے۔

"جولس! میں تمھاری بیوی کے بارے میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ خود اس کی حفاظت کرو۔ اچھا پھر خدا حافظ۔"

زمیندار اندر چلا گیا اور باہر اندھیرا پھیل گیا وہ خاموشی سے انتظار کرتا رہا کہ اُس کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو جائیں۔ پھر وہ پاؤں کے نیچے پتھر محسوس کرتے ہوئے رستے کی کھوج میں چل پڑا۔

اُس نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ لیکن جب اُسے گھر نظر آیا تو اسے لگا وہ مزید نہیں چل پائے گا اور وہ ادھر ہی کھڑا ہو گیا۔ اُسے جھونپڑی سے اُٹھتے کالے بادل نظر آئے۔ وہ اپنی تکونی شکل کی جھونپڑی دیکھ سکتا تھا جس میں اُس کی بیویاں کھانا پکانے کے بعد اُسکی منتظر تھیں۔ لیکن وہ کھانا کھانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے گھر کے اندر اپنی پہلی بیوی کا سامنا کرنا دشوار لگ رہا تھا۔ وہ اس کا مذاق اڑاتی تھی اور جوان بیوی اس سے طنزیہ گفتگو کرتی تھی۔ وہ تھکا اور اُکا ہوا تھا اور اپنے دوستوں سے دور ہوتا جا رہا تھا جو شام سے کسی شغل میلے کی تیاری میں مگن تھے۔ اُسے اپنے اندر جلن کسی زخم کی مانند محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کھیتوں میں نہیں جانا چاہتا تھا اور نہ ہی اندھیرے میں دشمن جھاڑیوں کے قریب سے گزرنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ اُس رات کچھ کھائے بغیر ہی وہ ڈیوٹی کے لیے روانہ ہو گیا۔ لیکن اگلی راتیں وہ کہیں نہ گیا، وہ سارا دن کمبل اوڑھ کے سویا رہتا اور منہ سورج کی جانب کر لیتا جیسے یہ اُس کے دل کے درد کا مداوا کرے گا۔ جب شام ہوئی، وہ جلد ہی کھانا کھا کر باہر چلا گیا۔

وہ جھونپڑی کے قریب کچھ دیر کے لیے خاموش کھڑا رہا۔ اسے اپنا آپ بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کسی مقصد کے بغیر ادھر کھڑا رہا جیسے اُس کی ٹانگیں چلنے سے انکاری ہو گئی ہوں وہ سارا ہفتہ زمینوں کی حفاظت

نہ کر سکا۔ جانور کھلے عام فصل پر حملہ آور ہوتے رہے، اسے کسی شے کی پرواہ نہ تھی۔ وہ ساری رات اپنی جھونپڑی کا پہرہ دیتا اور کبھی نہ سوچتا اندر کیا ہو رہا ہے۔ بس اپنی آنکھیں ادھر گاڑے رکھتا۔ جب آگ بجھ جاتی تو گھر کے اندر چلا جاتا جیسے لمبا راستہ چل کے آیا ہو۔

اگلے دن لوگوں نے شراب پینی تھی۔ وہ وہاں جا سکتا تھا لیکن وہ شام کے وقت باہر نکل گیا۔ اُس نے دیکھا، اس کی بیوی اُس کے باہر جانے پر خوش ہوئی تھی۔ وہ درخت کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ بندوق پکڑی اور جھونپڑی کی نگرانی کرنے لگا، وہ پتہ نہیں کیا کیا سوچتا رہا۔ اُسے وہ نوجوان یاد آ گیا جسے اُس نے کچھ دن پہلے اپنی بیوی کے قریب دیکھا تھا۔ اُسے جب یہ منظر یاد آیا تو بندوق پر اُسکی گرفت مزید سخت ہو گئی۔ پھر سانس لینے کے لیے اس نے بندوق نیچے رکھ دی اور بازوؤں کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ آج اس کے اندر اعتماد لوٹ آیا تھا۔ وہ درخت سے ٹیک لگائے گھوڑے پر انگلیاں رکھ کے محافظ بن کے کھڑا رہا۔ جب اُس نے نوجوان کے بارے میں سوچا تو اُسے وہ ہرن یاد آ گیا جسے اُس نے گزشتہ سال مارا تھا جس کی زبان سے مٹی لگی ہوئی تھی اور جس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔

اچانک بہتا لہو، مرے ہرن کا جسم اور اُس کی بیوی کے ساتھ ہنستا ہوا نوجوان، سب کچھ اُس کے دماغ میں بیٹھ گیا اور اُس کے اندر دباؤ اور بڑھ گیا۔ اُس نے لمبا سانس لیا اور بندوق پھر اٹھا لی۔ کسی دوست کی مانند اسے قریب کیا اور درختوں کے درمیان سے گھر کو دیکھنا شروع کر دیا۔

سورج ڈوب چکا تھا مگر اس کی لالی ابھی باقی تھی جہاں وہ کھڑا تھا وہاں رات لگ رہی تھی۔ جھونپڑیوں کے درمیان لوگ نظر آ رہے تھے، وہ باتیں کر رہے تھے، ہنس رہے تھے اور ناچنے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ آگ جل پڑی تھی اور دھوئیں کے بادلوں میں چنگاریاں نظر آ رہی تھیں۔ ڈھول دھیمے دھیمے بج رہے تھے، جلد ہی ناچ شروع ہونے والا تھا۔ لوگ میلوں سے آ رہے تھے۔ لگتا تھا لوگوں کو ناچنے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرنا پڑے گا۔

اُس نے تین بار کسی کے چلنے کی آواز سنی۔ اُس نے نوجوان کو دیکھنے کے لیے اپنی گردن موڑی۔ وہ دھیرے دھیرے یہاں سے گزرا کرتا تھا۔ اُس کی نظر جولس کی جھونپڑی پر ہوتی تھی۔ جولس چپ کر کے کھڑا ہو گیا اور اپنا سانس روک لیا۔ درختوں کے کالے سائے نے اسے گھیر ڈالا ہوا تھا۔ اُس نے جوان کو دیکھا۔ وہ چلتا ہوا آگ کے قریب پہنچ گیا اور اُن لوگوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا جو اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ اسے کسی نے گھاس نہ ڈالی۔ پھر وہ اُس کی جھونپڑی کے اندر چلا گیا۔

کئی گھنٹے گزر گئے۔ وہ ناچتے لوگوں کو دیکھتا رہا اور ڈھول کی آواز بھی سنتا رہا جب کہ تارے اُس

کے سر پر چمک رہے تھے۔ پھر اُس نے سوچا چھوٹی سی جھونپڑی میں کیا ہو رہا ہوگا۔ اب آگ بجھ چکی تھی اور ناچنے والے کمبلوں میں گھس گئے تھے۔ اُس کی کمر پیچھے چاند چھوٹا اور اونچا نظر آ رہا تھا اور درخت اپنے کالے سائے رستوں پر ڈال رہے تھے۔ وہ اب صبح کی خوشبو سونگھ سکتا تھا اُس نے نوجوان کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ جولس نے اپنے پیر ہلائے۔ بندوق اپنے بازو پر رکھی اور گھوڑے کو اپنی انگلیوں سے محسوس کیا۔

جب نوجوان اُس کے قریب سے گزرا تو وہ تھکن سے چور لگ رہا تھا۔ جولس بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلنا شروع ہو گیا۔ درختوں کی ٹہنیوں سے ٹکرانے کے باعث شبنم کے قطرے اُس کی ٹانگوں پر پڑ رہے تھے۔ یہ ٹھنڈی ٹھار رات تھی۔ وہ اُس کے اتنا قریب تھا کہ بندوق سے اسے چھو سکتا تھا۔ جولس آرام آرام سے چل رہا تھا اور سارا وقت یہ سوچتا جا رہا تھا کہ اُس نے کس طرح ہرن کو دس قدموں کے فاصلے سے فائر کر کے مارا تھا۔ جب وہ ایکڑوں پر پھیلی مکئی کے قریب پہنچا تو جولس بلی کی مانند چلنا شروع ہو گیا۔ نوجوان تھکاوٹ اور شراب کے نشے کے باعث گرتا پڑتا جا رہا تھا اور اُس کے پاؤں کی تھپ تھپ کی آواز آ رہی تھی۔ جولس کے اندر اِس شخص سے نفرت شعلہ بن چکی تھی۔ چال ڈھال سے لگتا ہی نہیں تھا یہ وہ وہی نوجوان ہے جو اس کی بیوی سے ہنسی مذاق کیا کرتا تھا۔

جب وہ شکار کرنے والے مقام پر پہنچے، جولس وہیں کھڑا ہو گیا اور نوجوان کو آگے جانے دیا۔ اُس نے بندوق کاندھے تک اٹھائی۔ بیرل کو تاروں کی جانب کیا تو اُسے اِک چمک نظر آئی۔ وہ منتظر رہا اور نوجوان کو مکئی کی طرف جاتے دیکھتا رہا، پھر ٹھیک وقت پر گھوڑا دبا دیا اور دوسرا فائر کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ چیختا اور جسم کو گھسیٹتا ہوا مکئی کی فصل میں غائب ہو گیا جولس نے بندوق نیچے کر لی اور دردیلے الفاظ سننے لگ گیا۔ اسے لگا جیسے کوئی نیند میں باتیں کر رہا ہو۔

وہ ٹہنیوں اور پتوں میں سے گزرتا اُس تک پہنچ گیا۔ جب اُس کا جسم ٹھنڈا پڑ گیا تو اُس نے پتے ہٹا کے اسے دیکھا، اُس کے جسم میں چھوٹا سا سوراخ ہو گیا تھا اور زمین پر پڑا لہو کا رنگ کالا ہو گیا تھا۔ اُس کا چہرہ زمین کے ساتھ دبا ہوا تھا۔ "سؤر" جولس نے چاند کی طرف منہ کر کے کہا۔ پھر اُس نے اُس کے جسم کو ٹھڈا مارا، "اور کچھ نہیں صرف اِک سؤر"۔

اُس نے یہ الفاظ ایک بار پھر دہرائے، صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ ان کی گونج کیسے سنائی دیتی ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

جوگندر پال

ہندی سے ترجمہ: **حنیف باوا**

مختصر کہانیاں

(۱)

نہیں اس پہاڑ پر سبزہ نہیں اُگتا۔ کیوں نہیں اُگتا۔ ارے بابو، جس مورکھ نے پیٹ میں اتنے قیمتی پتھر سجا کر رکھے ہوں تو اُسے بے فکری کی نیند کیسے آئے؟ ہاں ذرا سا سو کر ٹھر ٹھرا ہو تو سینے پر سبزہ آئے۔

ہاں بابو، میں ہر ایک سے نفرت کرتا ہوں۔ ماں باپ سے۔ بھائی بہن سے۔ دوستوں سے۔ ہر ایک سے۔

نہیں۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ کسی سے نفرت مت کرو۔ نہ بابو، تمھاری بات، مان لوں تو اکیلا رہ جاؤں گا۔

----

(۲)

نہیں رحمان بابو جو اللہ کو پیارے ہوتے ہیں، وہ زندگی بھوگ کر ہنستے کھیلتے اُس کے پاس لوٹ جاتے ہیں۔ نہیں بابوٗ۔ موت تو ایک نعمت ہے۔ جنھیں اپنے گھور بڑھاپے کی بائےہَوں میں بھی مرنا نصیب نہیں ہوتا۔ اللہ اس پر رحم کرے۔ وہ تو اپنے کیے دھرے کی سزا بھوگتے۔ اپنا جنم جیے جانے کی تدبیر کیے جاتے ہیں۔ اللہ رحم کرے ساری زندگی کسی کی نہ سُنی، اب تو اپنے آپ کو اپنی مرضی سے سپرد کر دے۔

----

(۳)

اس بچے پر ہنس کیوں رہے ہو۔ رحمان بابوٗ؟ ہوں، سیٹی بجائے جا رہی ہے۔ ہاں بابو، ہر بار اپنی سیٹی کی آواز جو سن کر کیسے کھل کھلا کر ہنس پڑتا ہے اور ہنستے ہنستے ایک بار پھر سیٹی میں اپنی ساری سانس چھوڑ دیتا ہے۔

نہیں بابوٗ، یہی تو بڑے بھی کرتے ہیں۔ نہیں، دیکھو بچہ اب سیٹی نہ بجا پانے پر کیوں کر ٹپٹا رہا ہے۔ بابوٗ، ہم سب بڑے بھی تو یہی کرتے ہیں۔ اللہ سے دعا مانگو رحمان بابوٗ، سب کی سیٹیاں بجتی رہیں۔

----

(۴)

تمھیں اپنی آخری کہانی کا انتظار ہے بابو؟ اور تمھیں یقین ہے کہ تمھاری یہ آخری کہانی، تمھاری سب سے بڑی کہانی ہوگی۔

یقیناً ہوگی بابو، پر اُسے لکھو گے کیوں کر؟

تمھی نے تو مجھے بتلایا تھا کہ ہر کہانی، کہانی کار کی واردات ہوتی ہے۔

نہیں بابو تمھی نے تو بتلایا تھا کہ ہر شخص کی سب سے بڑی واردات اُس کی موت ہوتی ہے۔

ذرا سوچو بابو، اپنی یہ سب سے بڑی کہانی لکھنے کے لیے اپنی موت کو کیسے جیو گے؟

نہیں بابو، جی بھی لیے تو مرو گے کیسے؟

مجھے افسوس ہے بابو، اپنی آخری کہانی نہیں لکھ پاؤ گے۔

----

(۵)

پہلے بھی لوگ جھوٹ بولا کرتے تھے بابو، مگر یہ بڑے ایمان والے، اسی لیے عدالتوں نے فیصلہ کرلیا کہ ہر مقدمے سے پہلے انھیں خدا اور ایمان کی قسم کھانے کو کہا جائے۔ ہاں، یوں ہر مجرم کو مقدمہ شروع ہونے سے پہلے ہی دھر لیا جاتا۔

ہاں اُسی وقت سے عدالتیں خدا کی قسم سے ہی ہر کیس کی چھان بین کرتی آرہی ہیں۔

ٹھیک کہتے ہو بابو، اب تو خدا کی گواہی کا موقع تھا پر مجرم اتنا کارگر جھوٹ بولتے ہیں کہ بے گناہ فوراً اپنے جرم کو قبول کرکے عدالتی رحم کے لیے ہاتھ پھیلا دیتے ہیں۔

----

(۶)

میرے کلینک میں ایک روبوٹ آنکلا۔ رحمان بابو، چیک اَپ کے بعد میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ بتانے لگا: میں تھکا تھکا سا رہنے لگا ہوں ڈاکٹر۔ اور اس کی شکایت سُن کر مجھے یہ فکر ہونے لگی کہ کہیں اس میں جان تو نہیں پڑ گئی؟

☆☆☆☆

ارون کمار جین

ہندی زبان سے ترجمہ: تنویر غلام حسین

پیٹ کی آگ

آج پرشانت بہت خوش تھا۔ تین سال کی بھاگ دوڑ کے بعد اُسے ایک پرائیویٹ کمپنی میں کار ڈرائیور کی نوکری مل گئی تھی تنخواہ تین ہزار روپے تھی۔ کئی اُمیدواروں کے درمیان کافی سورس، سفارش اور منت والتجا کے بعد اُسے یہ کام ملا تھا۔

پُرجوش پرشانت سوچ رہا تھا۔ سبھی افراد اُس سے اپنی اپنی آس لگائے ہوئے تھے، والد کی خواہش تھی کہ بیٹا کچھ کما کر اُن کا علاج کروائے تاکہ تندرست ہو کر وہ بے کار پڑی ہوئی زمین سے کچھ فصل لے سکیں اور ماں کی خواہش تھی کہ بیٹا سالوں پرانے مکان کی مرمت کروا کر ایک دو نئے کمرے بنوا دے کیوں کی کل بہو گھر آئے گی تو اُس کے لیے گھر ٹھیک ہونا چاہیے، اُن کی اپنی زندگی تو اسی طرح تنگ حالی میں کٹ گئی۔ چھوٹی دونوں بہنیں، سمن اور سُوربھی چاہتی تھیں کہ بھیا اُنھیں نئے کپڑے اور سائیکل لا کر دے اور وہ اُس پر سکول جایا کریں دونوں کو نت نئے کپڑے پسند تھے لیکن گھر کے خراب حالات اُنھیں معلوم تھے لہٰذا تہواروں پر بھی دونوں خاموش رہتی تھیں اور کبھی کوئی پوچھتا تو کہتیں ”نہیں بھیا! یہی کپڑے اچھے ہیں کیا کرنا ہے نئے لے کر۔ لیکن اُن کی آنکھوں کے بھاؤ اور دوسری سہیلیوں کے نئے کپڑوں کی طرف دیکھتی حسرت بھری نگاہیں، پرشانت سے چھپی نہیں رہ پاتی تھیں۔ مگر وہ بھی مجبور تھا، وہ صرف گھر کے سبھی افراد کی خوشی کے لیے خدا سے صرف دُعا ہی کر سکتا تھا۔

”لیکن اب وہ اُن کی سبھی حسرتیں آہستہ آہستہ پوری کر دے گا“ یہ سوچتے ہوئے پرشانت کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا۔

آدھی رات کو دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سے میٹھی نیند سویا پرشانت چونک اُٹھا، آنکھیں ملتے ہوئے جوں ہی اُس نے دروازہ کھولا، سامنے اُس کے گاؤں کا ہی ایک ساتھی شمبھو کھڑا تھا۔

کیا ہے شمبھو بھائی؟ اِتنی رات ۔۔۔؟

”بہت بُری خبر ہے پرشانت ۔۔۔ ورنہ اِتنی رات کو تیرے پاس کیوں آتا“ کہتے کہتے شمبھو ہانپنے لگا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

لیکن بات کیا ہے؟ پرشانت کا دل کسی بُری خبر اور خدشے سے کانپ اُٹھا ’’بات یہ ہے۔۔۔ تیرے والد کی وفات ہو گئی ہے۔۔۔ کچھ دیر پہلے ہی میرے مالک کے پاس گاؤں سے فون آیا ہے۔‘‘

یہ سنتے ہی پرشانت کا سر چکرا گیا اور وہ وہیں دھم سے بیٹھ گیا۔ ’’والد صاحب چلے گئے۔۔۔ اُن کے علاج کے لیے ہی تو میں بھٹک رہا تھا، اب کیا کروں گا میں؟

کیوں کروں گا نوکری؟ پرشانت کے دل میں درد اُٹھا۔

کیا سوچنے لگے پرشانت؟

شمبھو کی آواز سے وہ چونک اُٹھا۔

’’میں نوکری چھوڑ دوں گا، گاؤں میں رہوں گا۔‘‘ پرشانت بڑبڑایا۔ ’’نوکری چھوڑ دے گا؟ لیکن کیوں؟ کتنے پاپڑ بیلنے کے بعد تمھیں یہ نوکری ملی ہے، پھر کس طرح اپنی بیوہ ماں کا پیٹ بھرے گا، کیسے اپنی چھوٹی بہنوں کو پڑھائے گا؟ کیسے بنائے گا نوتا گھر؟

شمبھو نے چونک کر اُس سے کہا۔

’’لیکن، لیکن‘‘ پرشانت کے منہ سے لفظ شاید روٹھ سے گئے۔

’’ارے گر تو دو دن نہیں آیا تو تیری نوکری خود ہی چلی جائے گی‘‘ اُسے اپنی سُنائی دی، اور اُس کے کانوں میں صاحب کی آواز گونجنے لگی۔ ’’دیکھو پرشانت! یہ نوکری ملٹری کی نوکری کی طرح ہے تمھیں ڈیوٹی کے لیے ہر وقت تیار رہنا ہے کوئی ریسٹ نہیں، کوئی ڈیوٹی ٹائم نہیں۔ سمجھے‘‘ یہ صاحب کی واضح تنبیہہ تھی۔ اور ہاں! اگر تم اتنی سخت ڈیوٹی نہ کر سکو تو میرے پاس اور بھی آدمی ہیں۔ لہجہ عام لیکن لفظ کڑوے تھے۔ ’’نہیں سر! میں پوری مستعدی سے بھی کام کروں گا۔ ملٹری کے جوان کی طرح پرشانت نے اُسے مطمئن کیا تھا۔

’’۔۔۔ اب کیسے مانگے گا صاحب سے چھٹی؟ اور کیا گارنٹی ہے کہ لوٹنے پر تجھے صاحب پھر سے نوکری دے دے گا؟

پرشانت نے خود سے سوال پوچھا۔

لیکن والد صاحب کی آخری رسومات، دکھی ماں کو تسلی۔۔۔؟ بلکتی بہنوں کے آنسو۔۔۔ کون کرے گا یہ۔۔۔؟ ارے تو ہی تو اکلوتا بیٹا ہے اُن کا، اُس کا دل پھوٹ پھوٹ رو پڑا۔

آخری رسومات کو گاؤں والے کر دیں گے، ماں بھی کچھ دنوں میں سنبھل جائے گی۔ یہ پیٹ کی آگ تو زندگی بھر جلے گی۔۔۔ اُسے کیسے بُجھائے گا؟ ماں بہنیں، دادی سبھی کے پیٹ ہیں۔ حقیقت پسندانہ پرشانت کا یہ کٹھور فیصلہ تھا۔

خیالات کے بھنور میں مرے ہوئے والد کا جسم، روتی بلکتی بیوہ ماں، تسلی کو ترستی بہنیں اور تکلیف سے کراہتے اُسے خود کے روم روم سے، خاندان کی، مستقبل کی ذمہ داریاں بھاری پڑیں۔

"ماں اور چھوٹی بہنوں کے پیٹ کی آنچ وہ نہیں سہہ پائے گا۔۔۔ وہ کل بھی ڈیوٹی کرے گا۔"

پرشانت نے کٹھور فیصلہ لے لیا۔

شمبھو میرے بھائی! میں گاؤں نہیں جاؤں گا، تم جاؤ۔۔۔ کہہ دینا میں گاڑی لے کر کئی دنوں سے باہر گیا ہوا ہوں۔"

روتے سکتے ہوئے پرشانت نے کہا۔

اُس نے اپنی گھڑی اور جیب کے بچے پیسے شمبھو کے ہاتھوں میں رکھ دیے، باپ کی آخری رسومات کے لیے۔

"اور دیکھ ماں کو۔۔۔ چھوٹی بہن۔۔۔ اور دادی۔۔۔"

کہتے کہتے اُس کا گلہ رُندھ گیا، الفاظ روٹھ گئے اور آنکھیں بھرنے لگیں۔ شمبھو نے بھی ڈبڈباتی آنکھوں سے اُس کا کندھا دبایا۔ پرشانت شمبھو سے لپٹ کر پھوٹ کر رو پڑا۔

☆☆☆☆

سویتلانا الیگزووچ
تلخیص و ترجمہ: مبشر احمد میر

لیفٹینینٹ کی موت

''اگر کوئی خط نہ ملے تو پریشان مت ہونا۔'' انھوں نے لکھا، ''پہلے والے پتے پر خط بھیجتی رہنا۔ دو مہینے تک کوئی خط نہ آیا۔ مجھے خیال تک نہ آیا کہ وہ افغانستان میں ہیں۔ میں تعیناتی کے نئے مقام پر ان سے ملنے جانے کی تیاریوں میں سامان سمیٹتی رہی۔

انھوں نے خط میں اپنے جنگ کے محاذ پر ہونے کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ لکھا، ہم دھوپ تاپنے اور مچھلیاں پکڑنے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی ایک تصویر بھی بھیجی، جس میں وہ ریت میں دھنسے ہوئے ایک گدھے پر سوار تھے۔ ان کے گھر پہنچنے تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ محاذِ جنگ پر ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی ان کی عادی نہ ہو، چناں چہ پدرانہ شفقت کا اظہار نہیں کرتے تھے، شاید اس کا سبب یہ تھا کہ ابھی وہ بہت چھوٹی تھی۔ تاہم اب کی بار آئے تو گھنٹوں بیٹھے اسے تکتے رہتے، ان کی آنکھوں میں اتنی افسردگی ہوتی کہ مجھے ڈر لگنے لگتا۔ چھٹیوں میں دیر سے جاگنا ان کا معمول تھا، میں اٹھ کر بچی کو تیار کرتی تھی، لیکن اس مرتبہ صبح سویرے اٹھ جاتے، خود اسے کنڈر گارڈن لے جاتے، ہمیشہ کندھوں پر بٹھا کر لے جانا پسند کرتے، چھٹی سے کافی پہلے اسکول کے گیٹ پر پہنچ جاتے۔ چند مرتبہ ہم تھیٹر یا سینما بھی گئے، لیکن وہ باہر جانے کی بجائے گھر رہنا پسند کرنے لگے تھے۔

میں انھیں ان کی مطلوبہ محبت نہ دے سکی۔ کام پر جانے کے لیے تیار ہو رہی ہوتی یا ان کا کھانا تیار کرنے باورچی خانے میں ہوتی، وہ وقت بھی انھیں ناگوار گزرتا۔ آج کلاس رہنے دو، میں گھر ہوں، آج چھٹی کر لو۔ انھوں نے ایئر پورٹ پہنچنے میں جان بوجھ کر دیر کر دی، تاکہ ہمیں مزید دو دن مل جائیں۔ آخری رات وہ بہت پیارے لگ رہے تھے، میں سسک رہی تھی لیکن وہ کچھ نہیں بول رہے تھے، چپ چاپ مجھے تکے جا رہے تھے۔ آخر میں مجھے کہنے لگے، ''تمھارا! تمھیں اگر کبھی کوئی مرول جائے، مجھے بھول نہ جانا۔''

میں بولی، ''ایسا نہ کہو۔ وہ تمھیں کبھی نہیں ماریں گے، میں تم سے اتنی محبت کرتی ہوں کہ وہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔''

وہ ہنسنے لگے، ''بھول جاؤ، میں بڑا ہو گیا ہوں۔''

میں نے مزید بچوں کے بارے میں بات کی لیکن ان کا کہنا تھا کہ انھیں مزید بچے نہیں چاہییں۔

"جب میں واپس آجاؤں گا، پھر اور پیدا کر لینا۔ تم اکیلی انھیں کیسے سنبھالوگی۔"

پھر وہ چلے گئے، میں انتظار کرنے کی عادی ہو گئی لیکن جب بھی کوئی جنازہ گاڑی دیکھی، مجھے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوتا، میں رونا اور آنسو بہانا چاہتی، میں گھر کی جانب دوڑتی، جہاں ایک دیوار پر صلیب آویزاں تھی۔ اس کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکتی اور دعا کرتی۔ "خداوندا! میری خاطر انھیں سلامت رکھنا۔ انھیں مرنے نہ دینا۔"

جس روز یہ سانحہ ہوا، میں فلم دیکھنے گئی تھی۔ میری نظریں پردے پر تھیں، مگر میں کھوئی ہوئی سی تھی اور مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ ایسا تھا، جیسے میں کسی کا انتظار کر رہی ہوں یا مجھے کسی جگہ جانا ہو۔ فلم ختم ہونے تک میرا وجود نشست سے بندھا رہا، لیکن ذہن کسی ویرانے میں بھٹکتا رہا۔ اب مڑ کر دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ لازماً اس وقت وہ اپنی زندگی کی ہارتی ہوئی لڑائی لڑ رہے ہوں گے۔

ایک ہفتہ قبل مجھے ان کی خیریت کی اطلاع ملی تھی۔ ان دنوں کئی مرتبہ میں نے پڑھنے کے لیے کوئی کتاب اٹھائی لیکن کچھ پڑھے بغیر واپس رکھ دی۔ میں نے ان کے دو خط بھی وصول کیے، معمول کے مطابق مجھے خوش ہونا چاہیے تھا، مجھے انھیں بوسہ دینا چاہیے تھا۔ مگر اب کی بار ان کے خط دیکھتے ہوئے میں یہ سوچ کر افسردہ ہو جاتی کہ مجھے اور کتنا عرصہ ان کا انتظار کرنا ہوگا۔

جنگ میں ان کے کام آنے کے نو دن بعد صبح پانچ بجے مجھے ٹیلی گرام ملا، جسے کسی نے چپکے سے دروازے کے نیچے سے اندر کھسکا دیا تھا۔ ٹیلی گرام ان کے والدین کی جانب سے تھا۔ "چلی آؤ! پیٹیا گزر گیا۔" روتے روتے میری ہچکی بندھ گئی، رونے کی آواز سے بچی بھی جاگ گئی اور خود پر گزرنے والی قیامت سے بے خبر، میرے ساتھ رونے لگی۔

گھر میں معمول کے اخراجات کے لیے چند روبل تھے۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ کیا کروں، کیسے کروں، یا کہاں جاؤں؟ میں نے بچی کو سرخ کمبل میں لپیٹا اور سڑک پر جا کھڑی ہوئی۔ بس کے آنے میں کافی دیر تھی، البتہ خوش قسمتی سے ایک ٹیکسی رک گئی۔

میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا، "مجھے ایئرپورٹ جانا ہے۔"

یہ بتاتے ہوئے کہ وہ چھٹی کے بعد گھر جا رہا ہے، وہ شیشہ بند کرنے لگا۔

"میرا خاوند افغانستان میں مارا گیا ہے۔"

ایک لفظ کہے بغیر وہ باہر نکلا اور ٹیکسی میں سوار ہونے میں میری مدد کی۔ وہ مجھے میری ایک سہیلی کے گھر لے گیا، جس نے مجھے کچھ رقم ادھار دی۔ ایئرپورٹ کے عملے کا کہنا تھا کہ ماسکو کی کوئی نشست نہیں ہے اور مجھے اپنے بیگ سے وہ منحوس ٹیلی گرام نکال کر انھیں دکھانا پڑا۔ ممکن ہے یہ کسی دفتری کی غلطی ہو، میں خود کو کہہ رہی

تھی، اگر میں خود کو یہ یقین دلاتی رہوں کہ وہ زندہ ہیں تو وہ زندہ ہوں گے ۔ میں رو رہی تھی اور سب لوگ مجھے دیکھ رہے تھے ۔ انھوں نے مجھے ایک مال بردار جہاز پر، جو مکئی لے کر ماسکو جا رہا تھا، سوار کر دیا ۔ جہاں سے مجھے 'مانسک' جانے والا جہاز مل گیا ۔ اس کے بعد بھی میں 'دوروغی' سے، جہاں پیٹیا کے والدین رہتے تھے، ڈیڑھ سو کلومیٹر دور تھی ۔ میرے بار بار منتیں کرنے کے باوجود کوئی ٹیکسی والا مجھے وہاں لے جانے پر آمادہ نہ ہوا ۔ آخر ایک ٹرک والے کو مجھ پر ترس آ گیا ۔ بڑی مشکل سے آدھی رات کو دو بجے 'دوروغی' پہنچنے میں کامیاب ہوئی ۔

"شاید یہ سچ نہ ہو ۔"

"یہی سچ ہے، تمھارا! یہی سچ ہے ۔"

صبح ہم ملٹری کمشنریٹ گئے ۔ انھوں نے سرد مہری سے ہمیں بتایا: "جب نعش پہنچے گی ۔ آپ لوگوں کو مطلع کر دیا جائے گا ۔" 'مانسک' میں صوبائی ملٹری کمشنریٹ کے دفتر فون کرنے سے پہلے ہم نے دو دن انتظار کیا ۔ ان کا کہنا تھا، بہتر یہی ہوگا کہ نعش وصول کرنے ہم خود جائیں ۔ جب ہم مانسک پہنچے تو ایک اہل کار نے ہمیں بتایا کہ تابوت غلطی سے 'نووی غی' بھیج دیا گیا ہے ۔ 'نووی غی' وہاں سے سو کلومیٹر دور تھا ۔ جس وقت ہم وہاں پہنچے دفتر کا وقت ختم ہو چکا تھا اور ایک چوکی دار کے علاوہ، جو اپنی کوٹھڑی میں تھا، کوئی اہل کار نہیں تھا ۔

"یہاں ہم ایک تابوت ۔ ۔ ۔ ۔"

"وہاں دیکھ لیں" اس نے ایک جانب اشارہ کیا: "تابوت پڑا ہے ۔ اگر آپ کا ہو تو اسے لے جا سکتے ہیں ۔"

باہر کھلے میں ایک تابوت پڑا تھا ۔ جس پر چاک سے "سینئر لیفٹیننٹ ڈونیار" گھسیٹا ہوا تھا ۔ میں نے اس جگہ سے تختہ ہٹایا، جہاں تابوت کی کھڑکی ہوتی ہے ۔ ان کا چہرہ سلامت تھا لیکن شیو بری طرح بڑھی ہوئی تھی ۔ کسی نے انھیں نہلایا نہیں تھا ۔ تابوت کافی چھوٹا تھا اور اس میں سے بدبو آ رہی تھی ۔ میں، اس کے سامنے، جو کبھی مجھے ساری دنیا سے عزیز تھا، گھٹنوں کے بل جھکی ۔ انھوں نے اس حالت مجھے میرا شوہر لوٹایا کہ میں اس کا بوسہ بھی نہ لے سکی ۔

وہ میرے آبائی قصبے 'یازل' میں آنے والا پہلا تابوت تھا ۔ لوگوں کی آنکھوں میں دکھائی دینے والی دہشت، اب بھی مجھے یاد ہے ۔ جس وقت اسے دفن کیا گیا، میں بھی قبرستان میں تھی ۔ جب فوجی بینڈ کی الوداعی دھن میں اسے قبر میں اتارا جا رہا تھا، قبرستان ایک دہشت ناک چھناکے سے گونج رہا تھا ۔ مجھے سفید بجری پر گرتے اولوں کے تڑخنے کی یاد آ گئی ۔

میں نے ان کے ابا اور اماں سے زیادہ بات نہ کی ۔ میرا خیال تھا کہ ان کی اماں مجھ سے نفرت کرتی

ہیں، کیوں کہ میں زندہ تھی جب کہ وہ زندہ نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا، میں پھر سے شادی کرلوں گی۔ اب وہ کہتی ہیں، ''تمھیں دوبارہ شادی کرلینی چاہیے۔'' لیکن اس وقت میں ان سے آنکھیں ملاتے ہوئے گھبراتی تھی۔ پیٹیا کے ابا اپنے حواس کھو بیٹھے تھے۔ ان کا دماغ چل بے چل ہو گیا تھا۔ ''ایسے جوان کو قبر میں اتارنا، حرامزادے، انھوں نے اسے ماردیا۔'' میری ساس نے اور میں نے بھی انھیں بتانے کی کوشش کی کہ حکومت نے ان کی قربانی کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں میڈل دیا ہے اور یہ بھی کہ ہمیں اپنی جنوبی سرحدیں محفوظ رکھنے کے لیے افغانستان کی ضرورت ہے۔ لیکن وہ کچھ سننے پر آمادہ نہیں تھے۔ ایک ہی بات بار بار دہراتے،

''حرامزادے، انھوں نے اسے ماردیا۔''

بدترین ابھی آگے تھا، مجھے اس سوچ کو اپنانا تھا کہ میرے لیے کچھ نہیں بچا، کچھ نہیں ہے، کوئی نہیں ہے، جس کا انتظار کروں۔ میں خواب میں ڈر کر اٹھ بیٹھتی، میرا تمام وجود پسینے سے تر ہوتا۔ میں یہ سوچ کر گھبرا جاتی، پیٹیا واپس آئیں گے لیکن انھیں معلوم نہیں ہوگا کہ ان کی بیوی اور بیٹی کہاں ہیں۔ میرے پاس اچھے وقتوں کی صرف یادیں بچی تھیں۔

جس دن ہماری ملاقات ہوئی، ہم نے اکٹھے ڈانس کیا۔ دوسرے دن ہم باغ میں گھومنے گئے، اگلے دن انھوں نے مجھ سے شادی کی درخواست کی۔ ''میری منگنی ہو چکی ہے۔'' میں نے انھیں بتایا، ''درخواست رجسٹری آفس میں ہے۔'' وہ چلے گئے۔ اگلے دن ان کا خط ملا۔ جس میں موٹے حروف میں سارے صفحے پر پھیلا ہوا لکھا تھا۔

''اووف''

سردیوں میں ہمارے گاؤں میں ہماری شادی ہوگئی۔ یہ افراتفری میں کی گئی مضحکہ خیز شادی تھی۔ ہمارے ہاں لوگ خوابوں کی تعبیر سے قسمت کا اندازہ کرتے۔ میں نے بھی ایک خواب دیکھا، جس کے بارے میں، صبح اٹھ کر، میں نے اپنی امی کو بتایا، ''امی! میں نے ایک خوب صورت جوان دیکھا، جس نے فوجی وردی پہنی ہوئی ہے۔ وہ ایک پل پر کھڑا مجھے بلا رہا ہے۔ جب میں اس کی طرف بڑھنے لگتی ہوں، وہ پرے جانے لگتا ہے، حتیٰ کہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔''

''کسی فوجی سے شادی نہ کرنا۔ ورنہ تنہا رہ جاؤ گی۔'' میری امی نے تعبیر بتائی۔

پیٹیا کے پاس دو دن کی رخصت تھی۔ ''چلو، رجسٹری آفس چلتے ہیں۔'' دروازے میں داخل ہونے سے پہلے وہ پکارے۔

رجسٹری آفیسر نے ہم دونوں کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور کہنے لگا، ''دو مہینے کا انتظار کیوں؟ جوان!

جاؤ! برانڈی لاؤ۔ اتنی دیر میں ہم کاغذی کارروائی مکمل کرتے ہیں۔‘‘ ایک گھنٹے کے اندر ہم میاں بیوی تھے۔ باہر برفانی ہوائیں چل رہی تھیں۔

’’دولھے میاں! دلھن کو لے جانے والی ٹیکسی کہاں ہے؟‘‘

’’ابھی آیا!‘‘ وہ باہر گئے اور میرے لیے ایک نیلا روس ٹریکٹر روکا۔

کئی سالوں تک میں خواب میں ہم دونوں کو برفانی راستے پر اس ٹریکٹر پر سفر کرتے دیکھتی رہی۔

آخری مرتبہ پیٹیا رخصت پر گھر آئے تو دروازے پر تالا لٹک رہا تھا۔ انھیں اپنے آنے کی اطلاع دینے کے لیے ٹیلی گرام کرنے کا وقت نہیں ملا تھا۔ میں اپنی ایک سہیلی کی سالگرہ منانے اس کے فلیٹ پر گئی ہوئی تھی۔ جب وہ دروازے پر پہنچے، موسیقی بج رہی تھی، سبھی خوش تھے، قہقہے لگ رہے تھے۔ وہ ایک اسٹول پر بیٹھ گئے، ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، یا شاید میری آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں اور میں اپنے آنسوؤں کے عکس میں ان کے آنسو دیکھ رہی تھی۔ سالگرہ سے واپسی پر انھوں نے بتایا، ’’جس وقت میں تمھیں ملنے آ رہا تھا، میرے گھٹنے کپکپا رہے تھے، جیسے ہم پہلی مرتبہ مل رہے ہوں۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ ہم پکنک منانے گئے۔ ہم نے جھیل کے کنارے کیمپ لگایا، رات کو لکڑیاں اکٹھی کر کے آگ جلائی۔ آگ تاپتے ہوئے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہنے لگے، ’’تم تصور نہیں کر سکتیں، کسی دوسرے ملک کی خاطر مرنا، مجھے کتنا ناپسند ہے۔‘‘

ان کی موت کے وقت میری عمر چوبیس سال تھی۔ ان ابتدائی مہینوں کے دوران، میں کسی ایسے آدمی سے، جو مجھے چاہتا ہو، شادی کر سکتی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی، مجھے کیا چاہیے۔ میرے اردگرد زندگی معمول کے مطابق تھی۔ ایک صاحب گاؤں میں مکان بنا رہے تھے، دوسرے کار کا سودا کر رہے تھے۔ کسی نے فلیٹ لیا تھا اور قالین خریدنے یا باورچی خانے کے لیے ہاٹ پلیٹ خریدنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ گزشتہ عظیم جنگ کے دوران پورے ملک میں ہر فرد غم زدہ تھا، سب عورتیں مل کر جانے والوں کی یاد میں آنسو بہاتی تھیں۔ ہر شخص نے کسی کو کھویا تھا اور اسے علم تھا کہ اس نے کس کی خاطر قربانی دی ہے۔

کیٹرنگ کالج میں، جہاں میں کام کرتی تھی، ایک سو افراد کا عملہ تھا۔ ان میں صرف میں تھی، جس نے اپنا خاوند کھویا، دوسروں کے لیے یہ بس اخبار میں چھپنے والی ایک خبر تھی۔

برسوں بعد میں نے ایک ٹیلی وژن پروگرام میں سنا کہ افغان جنگ قوم کے لیے باعثِ ندامت ہے۔ میرا جی چاہا، سکرین توڑ دوں۔ اس دن مجھ سے میرا شوہر دوسری مرتبہ کھو گیا۔

☆ ☆ ☆ ☆

(سویتلانا الیکزوچ کی رپورٹ 'نوجوانوں کے تابوت' سے ماخوذ)

ولادیمیر نابا کوف

انگریزی سے ترجمہ: سجاد بلوچ

علامتیں اور نشانیاں

انھیں حالیہ برسوں میں چوتھی بار اس مخمصے کا سامنا تھا کرنا پڑ رہا تھا کہ اُس نوجوان کی سالگرہ کے موقع پر کون سا تحفہ لے کر جائیں جو دماغی طور پر صحت مند نہیں تھا اور لاعلاج تھا۔ اُس کی کوئی خواہشات نہیں تھیں۔ انسانی ہاتھ کی بنائی ہوئی اشیا اس کے لیے یا تو برائی کے پھوڑے تھے، مہلک عمل کے ساتھ متحرک پھوڑے جنھیں صرف وہی دیکھ سکتا تھا، یا نا قابلِ قبول سہولتیں کہ جن کی اُس کی تجریدی دنیا میں کوئی افادیت نہیں تھی۔ کئی اشیا کو رد کرنے کے بعد، جو ممکنہ طور پر اسے ناراض یا خوفزدہ کر سکتی تھیں (مثلاً کوئی بھی آلہ نما چیز ممنوعہ تھی) اُس کے والدین نے ایک لطیف اور چھوٹا سا ٹرائفل لیا۔ یہ ایک ٹوکری تھی جس میں دس عدد چھوٹے چھوٹے جار تھے، جن میں پھلوں کی جیلی کی مختلف اقسام بھری ہوئی تھیں۔

اُس کی پیدائش کے وقت ان کی شادی کو کافی عرصہ گزر چکا تھا؛ اور اب تو کئی برس بیت چکے تھے اور ان کی عمریں کافی زیادہ ہو چکی تھیں۔ اس کی ماں کے مٹیالے بھورے بال بے ترتیبی سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ سستے سیاہ کپڑے پہنتی تھی۔ دیگر ہم عمر خواتین کے برعکس (جیسا کہ مس سول، جو ان کی ہمسائی تھی، اس کا چہرہ پینٹ سے زرد اور کاسنی ہوتا تھا اور ہیٹ پھولوں کا گلدستہ تھا)، وہ بہار کی عیب جُو روشنی کو اپنا صاف چہرہ پیش کرتی تھی۔ اس کا شوہر جو پرانے ملک میں ایک کامیاب کاروباری شخص تھا، اب نیویارک میں تھا اور مکمل طور پر اپنے بھائی اسحاق پر انحصار کرتا تھا، جو چالیس سال کے قیام کے ساتھ حقیقی امریکی تھا۔ وہ کبھی کبھار اسحاق سے ملتے تھے اور اس کا نام شہزادہ رکھا ہوا تھا۔

اُس دن، ان کے بیٹے کی سالگرہ کے دن، سب کچھ غلط ہو رہا تھا۔ زیرِ زمین ریل گاڑی دو سٹیشنوں کے درمیان برقی رو منقطع ہونے کے باعث رک گئی اور کوئی چوتھائی گھنٹہ انھیں اپنے دلوں کی فرض شناس دھڑکنوں اور اخبارات کی سرسراہٹ کے علاوہ کچھ سنائی نہ دیا۔ انھیں آگے سے جو بس پکڑنا تھی، وہ بھی تاخیر کا شکار تھی اور انھیں نکڑ پر کافی دیر انتظار کرنا پڑا۔ اور جب بس آئی تو وہ ہائی سکول کے باتونی بچوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ وہ جب سینےٹوریم کی طرف چلے تو بارش نے آلیا۔ انھیں ایک بار پھر انتظار کرنا پڑا اور ان کے بیٹے کی کمرے میں موجودگی کی بجائے، جیسا کہ عام طور پر ہوتا تھا (اس کا مغموم چہرہ اداس اور الجھا ہوا، داڑھی

بڑھی ہوئی اور کیل مہاسوں سے داغ دار ہوتا)، ایک نرس کمرے میں آئی، جسے وہ جانتے تھے، اور اس نے کھل کر وضاحت کی کہ اس نے پھر سے خودکشی کی کوشش کی ہے۔ اس نے ساتھ ہی بتایا کہ وہ اب ٹھیک ہے لیکن شاید اس کے والدین سے ملاقات اسے پریشان کر دے۔ یہاں کام کرنے والے اتنے کم ہیں اور چیزیں اتنی آسانی سے گڈمڈ یا خراب ہو جاتی ہیں کہ انھوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ان کے والدین کو دفتر میں نہ چھوڑا جائے بلکہ جب اگلی بار وہ آئیں تب اسے لایا جائے۔

عمارت کے باہر ماں نے چھتری کھولنے کے لیے اپنے شوہر کا انتظار کیا اور پھر اس کا بازو پکڑ لیا۔ وہ اپنا گلا صاف کر رہا تھا، جو وہ پریشانی کے عالم میں ہمیشہ کرتا تھا۔ وہ سڑک کی دوسری جانب بس سٹاپ کی اوٹ تک پہنچ گئے اور اس نے چھتری بند کر دی۔ کچھ قدموں کے فاصلے پر، ایک جھولتے اور پانی جھاڑتے درخت کے نیچے، پانی کے گڑھے میں پرندے کا چھوٹا سا بے پر بچہ بے چارگی سے پھدک رہا تھا۔

زیرِ زمین ریل گاڑی کے سٹیشن تک لمبے سفر میں اس نے اور اس کے شوہر نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی اور وہ جب بھی شوہر کے بوڑھے ہاتھوں کی طرف دیکھتی، جو چھتری کے دستے کو پکڑے ہوئے ہل رہے تھے اور ان کی پھولی ہوئی رگیں اور بھورے داغوں والی جلد دکھائی دے رہی تھی، وہ آنسوؤں کا بڑھتا ہوا دباؤ محسوس کرتی۔ اس نے اپنے دماغ کو کسی اور طرف مائل کرنے کے لیے جب ادھر ادھر دیکھا تو اسے ہلکا سا دھچکا لگا، ہمدردی اور حیرت کا ملا جلا دھچکا۔ اس نے دیکھا کہ مسافروں میں سے ایک لڑکی جس کے بال سیاہ تھے اور بھدے سے انگوٹھوں کے سرخ ناخن تھے، ایک بوڑھی عورت کے کاندھے پر سر رکھے رو رہی تھی۔ اس عورت کی شکل کس سے ملتی ہے؟ وہ اسے ربیکا بورسووا لگی، جس کی بیٹی کئی برس قبل منسک میں ایک سلووچک کے ساتھ بیاہی گئی تھی۔

جب ان کے بیٹے نے آخری بار ایسا کرنے کی کوشش کی تھی تو ڈاکٹرز کے مطابق یہ تخلیقیت کا شاہکار تھا؛ وہ کامیاب ہو جاتا اگر ایک حاسد مریض نے یہ نہ سوچا ہوتا کہ وہ اڑنا سیکھ رہا ہے اور اسے بروقت روک دیا۔ وہ دراصل دنیا میں ایک سوراخ کر کے بھاگنا چاہ رہا تھا۔

اس کے خبط کا نظام ایک سائنسی رسالے میں شائع ہونے والے تحقیقی مضمون کا موضوع تھا، جو سینے ٹوریم میں ڈاکٹر نے انھیں پڑھنے کو دیا تھا۔ لیکن اس سے کافی عرصہ پہلے وہ اور اس کا شوہر اپنے لیے اس الجھاؤ کو واضح کر چکے تھے۔ اس مضمون کا نام Referential mania تھا۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے اور اس میں مریض یہ تصور کرتا ہے کہ اس کے گرد و پیش ہونے والی ہر چیز اس کی شخصیت اور وجود سے جڑی ہوئی ہے۔ وہ باقی لوگوں کو اس سازش سے باہر سمجھتا ہے کیوں کہ وہ خود کو دوسرے لوگوں سے بہت زیادہ ذہین سمجھتا ہے۔

وہ جہاں بھی جاتا ہے، عظیم فطرت اس پر سایہ فگن رہتی ہے۔ گھورتے آسمان پر بادل ایک دوسرے کو اشاروں کے ذریعے اس کے بارے میں تفصیلی معلومات بھیجتے ہیں۔ اس کے انتہائی اندرونی خیالات رات کے وقت اشاروں سے اظہار کرتے درختوں کی طرف سے عام حروف میں زیر بحث آتے ہیں۔ کنکر یا داغ یا سورج کے دھبوں کی ترتیب ایک عجیب طریقے سے وہ پیغامات دیتی ہے جن کا سمجھنا اس کے لیے ضروری ہے۔ ہر چیز ایک راز ہے اور ہر چیز کے لیے وہ ایک خیال ہے۔ اس کے چاروں اور جاسوس پھیلے ہیں۔ ان میں سے کچھ الگ مشاہدہ کرنے والے ہیں، جیسا کہ شیشے کی سطحیں اور ساکت تالاب؛ دوسرے، جیسا کہ دکانوں کی کھڑکیوں میں ٹنگے کوٹ متعصب گواہ ہیں، دلوں کو مارتے پیٹنے والے: ان کے علاوہ پھر وہی (بہتا پانی، طوفان) پاگل پن کی حد تک ہیجانی، اس کے بارے میں مسخ شدہ رائے رکھتے ہیں اور اس کے کاموں کی مضحکہ خیز انداز میں غلط تعبیر کرتے ہیں۔ اسے ہمیشہ مستعد رہنا چاہیے اور زندگی کا ہر لمحہ اور نمونہ اشیا کے تموج کو کھولنے میں صرف کرنا چاہیے۔ وہ جس ہوا میں سانس لیتا ہے وہ فہرست کے مطابق مرتب ہوتی ہے اور اس کا اندراج ہوتا ہے۔ وہ جس شوق کو اکساتا ہے، صرف قریب کے ماحول تک محدود ہے، لیکن افسوس ایسا نہیں ہے! فاصلے سے وحشی رسوائی کے دھارے حجم اور پرگوئی میں بڑھ جاتے ہیں۔ خون کے ذروں کے خاکے، لاکھوں گنا بڑے کیے جاتے اور وسیع میدانوں میں اڑائے جاتے ہیں؛ اور اس سے بھی دور عظیم ناقابل برداشت مضبوطی اور بلندی، سنگ خارا اور کراہتے ہوئے صنوبر، اس کے وجود کی حتمی سچائی کے طور پر اکٹھے ہوتے ہیں۔

جب وہ طوفان اور زیر زمین ریل کی گندی ہوا سے باہر نکلے، دن کی روشنی کی تلچھٹ گلی کی روشنیوں کے ساتھ مل رہی تھی۔ وہ رات کے کھانے کے لیے مچھلی خریدنا چاہتی تھی، سو اس نے جیلی جار کی ٹوکری اسے پکڑائی اور اسے گھر جانے کا کہا۔ وہ اپنے گھر کی طرف مڑا، تیسرے درجے تک چڑھا اور پھر اسے یاد آیا کہ اس نے تو دن کے وقت چابیاں بیوی کو دے دی تھیں۔

وہ اس خاموشی میں سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور خاموشی ہی میں اٹھا جب دس منٹ بعد وہ نقاہت سے مسکراتے ہوئے اور اپنی بے وقوفی پر ناپسندیدگی سے سر ہلاتے ہوئے خود کو گھسیٹتی ہوئی سیڑھیاں چڑھی۔ وہ اپنے دو کمروں کے فلیٹ میں داخل ہوئے اور وہ جلدی سے آئینے کی طرف گیا۔ اپنے منہ کے کونوں کو انگوٹھوں کے ذریعے دبایا، ایک خوفناک ماسک جیسی بناوٹ سے اس نے اپنی نئی بے آرام کرنے والی دانتوں کی مصنوعی بتیسی نکالی۔ اس نے روسی زبان کا اخبار پڑھا جو اس کی بیوی نے میز پر بچھایا ہوا تھا۔ پڑھتے پڑھتے اس نے ایسی چیزیں کھائیں جنھیں کھانے کے لیے دانتوں کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اس کا موڈ جانتی تھی اور خود بھی خاموش تھی۔

جب وہ بستر پر چلا گیا، وہ دیوان خانے میں تاش کے پتوں اور پرانی تصویروں کے البم کے ساتھ بیٹھی رہی ۔ تنگ سے صحن کے پار، جہاں بارش اندھیرے میں کوڑے دان سے ٹکرا رہی تھی، کھڑکیاں نیم روشن تھیں اور ان میں سے ایک میں سیاہ پاجامہ پہنے ایک مرد ہاتھ سر کے نیچے باندھے ہوئے اور کہنیاں اوپر اٹھائے ہوئے، ایک بکھرے ہوئے بستر پر منہ چھت کی طرف کیے لیٹا ہوا دیکھا جا سکتا تھا ۔ اس نے پردہ نیچے کر دیا اور تصویریں دیکھنے لگی ۔ بچپن میں وہ اکثر بچوں کی نسبت زیادہ حیرت میں مبتلا دکھائی دیتا تھا ۔ لپزگ میں ان کی جرمن ملازمہ اور اس کے موٹے منہ والے منگیتر کی تصویر البم سے باہر گر گئی ۔ اس نے کتاب کے صفحے الٹے: منسک، انقلاب، لپزگ، برلن، دوبارہ لپزگ، گھر کے سامنے والا ترچھا منظر، بری تصویر ۔ اور یہ رہی لڑکے کی تصویر جب وہ چار برس کا تھا، ایک پارک میں، شرماتے ہوئے، ماتھے پر تیوری چڑھائے ہوئے، ایک بےقرار گلہری سے دوسری طرف دیکھتے ہوئے جیسا کہ وہ کسی بھی دوسرے اجنبی سے پرے دیکھتا ہو ۔ یہ چچی روسا کی تصویر تھی، ایک بدمزاج، ناراض، کھلی کھلی آنکھوں والی بوڑھی خاتون، جو اس وقت تک بینکوں کے دیوالیہ پن، ریل حادثوں اور کینسر کے بڑھنے جیسی بری خبروں کی زد میں رہی جب تک کہ جرمنوں نے اسے موت کے گھاٹ نہ اتار دیا، ان تمام لوگوں کے ساتھ جن کے بارے میں وہ پریشان رہتی تھی ۔

لڑکا، چھ برس کا ۔ ۔ ۔ یہ تصویر تب کی ہے جب وہ انسانی ہاتھوں پیروں سے پرندوں کی حیران کن تصویریں بناتا تھا اور ایک بڑی عمر کے بندے کی طرح بےخوابی کے مرض کا شکار تھا ۔ اس کا کزن اب شطرنج کا معروف کھلاڑی تھا ۔ لڑکا، اب آٹھ برس کا تھا، جسے سمجھنا کافی مشکل ہو چکا تھا، جو راہداری میں دیوار پر لگے کاغذ سے خوفزدہ تھا، جو کتاب میں شامل ایسی تصویر سے خوفزدہ تھا جس میں محض ایک دلکش منظر تھا جس میں ایک پہاڑی پر چٹانیں تھیں اور پرانے چھکڑے کا ایک پہیہ سوکھے ہوئے درخت کی ایک شاخ سے لٹک رہا تھا ۔ وہ اب دس برس کا تھا، یہ وہ سال تھا جب ان لوگوں نے یورپ کو چھوڑا ۔ اسے وہ شرمندگی یاد تھی، وہ افسوس، سفر کی ذلت آمیز مشکلات اور بھدے، شریر، جاہل بچے جن کے ساتھ وہ مخصوص بچوں کے سکول میں پڑھتا تھا، اسے وہاں اس وقت داخل کرایا گیا تھا جب وہ امریکہ پہنچے تھے ۔ اور پھر اس کی زندگی میں وہ وقت آیا، جب نمونیہ سے طویل افاقے کے بعد، جب اس کے وہ چھوٹے چھوٹے ڈر جنہیں اس کے والدین بےوقوفی میں حیرت انگیز صلاحیتوں والے بچے کی بےوقوفیاں قرار دیتے تھے، شدید ہو گئے، جیسا کہ ایسا ہونا تھا، وہ مدلل ملاپ کے دھوکوں کے گہرے الجھاؤ میں تبدیل ہو گئے، اور عام ذہنوں کے لیے مکمل طور پر ناقابلِ رسائی بن گئے ۔

یہ سب اور مزید بہت کچھ اس نے قبول کیا، کیوں کہ آخر کار زندگی ایک کے بعد ایک خوشی کے کھو

جانے کو قبول کرنے کا ہی نام ہے، اس کے معاملے میں نہ صرف خوشیاں بلکہ بہتری کے موہوم امکانات تک کھو جانے کو قبول کرنے کا۔ اس نے سوچا، دکھ کی متواتر لہروں کے بارے میں جو کسی نہ کسی وجہ سے اسے اور اس کے شوہر کو برداشت کرنا پڑی تھیں: ناقابلِ تصور انداز میں ان کے بیٹے کو نقصان پہنچانے والی غیر مرئی دیوہیکل قوتیں؛ دنیا میں کوملتا کی بے شمار مقدار؛ اس کوملتا کی قسمت، جو یا تو تباہ کر دی گئی یا ضائع، یا پاگل پن میں ڈھل گئی؛ نظر انداز شدہ بچے جو گندے کونوں میں خود کلامی کرتے ہیں؛ خوبصورت گھاس جسے کسانوں سے چھپایا نہیں جا سکتا۔

یہ نصف شب کا عمل ہوگا جب دیوان خانے سے اس نے اپنے شوہر کے کراہنے کی آواز سنی، اور وہ گھسٹتا ہوا اندر داخل ہوا، شب خوابی کے لباس پر پرانا اوورکوٹ پہنے ہوئے جسے اس نے استر خوانی کالر کے ساتھ لگایا ہوا تھا جو اسے عمدہ نیلے غسل خانے میں سب سے زیادہ پسند تھا۔

’’میں نہیں سو سکتا!‘‘ وہ چلایا۔

’’تم کیوں نہیں سو سکتے؟‘‘ اس نے پوچھا۔ ’’تم تو بہت تھکے ہوئے تھے۔‘‘

’’میں اس لیے نہیں سو سکتا کہ میں مر رہا ہوں،‘‘ اس نے کہا، اور صوفے پر لیٹ گیا۔

’’کیا معدے کا مسئلہ ہے؟ کیا تم چاہتے ہو کہ میں ڈاکٹر سولوو کو بلاؤں؟‘‘

’’نہیں ڈاکٹر کو نہیں بلانا،‘‘ اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ ’’ڈاکٹروں کو جہنم میں ڈال دو! ہمیں اسے جلد از جلد وہاں سے نکالنا چاہیے۔ نہیں تو ہم ذمہ دار ہوں گے۔۔۔ ذمہ دار!‘‘ وہ جلدی سے بیٹھ گیا، دونوں پاؤں فرش پر رکھے، اپنی بھینچی ہوئی مٹھی سے ماتھے کو ٹھونکا۔

’’ٹھیک ہے۔‘‘ اس نے نرمی سے کہا۔ ’’ہم کل صبح اسے گھر لے آئیں گے۔‘‘

’’مجھے تھوڑی سی چائے چاہیے۔‘‘ اس کے شوہر نے کہا اور باتھ روم کی طرف چلا گیا۔

مشکل سے نیچے جھکتے ہوئے اس نے کچھ تاش کے پتے اور ایک دو تصویریں اٹھائیں جو فرش پر گر گئی تھیں۔۔۔ دلوں کی داس، بکم کا نہلا، بکم کا اکا، ملازمہ ایلسا اور اس کا وحشی پریمی۔ وہ جواں جذبوں کے ساتھ اونچی آواز میں بولتے ہوئے واپس آیا ’’میں نے سوچ لیا ہے۔ ہم اسے سونے والا کمرہ دیں گے۔ ہم میں سے ہر ایک باری باری رات کا ایک حصہ اس کے قریب گزارے گا اور دوسرا حصہ صوفے پر۔ ہمیں ڈاکٹر دستیاب ہے جو ہفتے میں کم از کم دو بار اس کا معائنہ کرے گا۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ شہزادہ کیا سوچتا ہے۔ ویسے اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں، کیوں کہ یہ کافی سستا پڑے گا‘‘

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ یہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے کے حساب سے خلافِ معمول وقت تھا۔ وہ کمرے کے

درمیان میں کھڑا پاؤں سے ایک چپل ٹٹول رہا تھا جو اتر گیا تھا، اور اس نے بچوں کی طرح دانتوں کے بغیر منہ کھول کر بیوی کو دیکھا۔ کیوں کہ وہ اس سے زیادہ انگریزی جانتی تھی، سو ہمیشہ وہی فون سنتی تھی۔

"کیا میں چارلی سے بات کر سکتی ہوں؟" ایک لڑکی کی سست سی آواز نے اسے کہا۔

"تم کون سا نمبر ملا رہی ہو؟ ------ نہیں، تم نے غلط نمبر ملایا ہے۔"

اس نے ریسیور آہستہ سے نیچے رکھا اور اس کا ہاتھ دل کی طرف گیا۔ "اس نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔" اس نے کہا۔

وہ جلدی سے مسکرایا اور اپنی خودکلامی شروع کر دی۔ جوں ہی دن چڑھے گا وہ اسے لے آئیں گے۔ اس کی اپنی حفاظت کے لیے وہ تمام چاقو چھریاں ایک مقفل دراز میں رکھیں گے۔ انتہائی بری صورتحال میں بھی اس نے کبھی کسی اور کو نقصان نہیں پہنچایا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔

اسی بے سری، متجسس نوجوان آواز نے چارلی کا پوچھا۔

"تمھارے پاس غلط نمبر ہے۔ میں تمھیں بتاتی ہوں تم کیا کر رہی ہو، تم صفر کے ہندسے کی بجائے او (o) دبا رہی ہو۔" اس نے دوبارہ فون بند کر دیا۔

وہ غیر متوقع، مسرت انگیز چائے پینے بیٹھ گئے۔ وہ اونچی آواز میں چسکیاں لے رہا تھا؛ اس کا چہرہ چمک رہا تھا؛ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ اپنا گلاس دائرے میں گھماتا تاکہ چینی اچھی طرح حل ہو سکے۔ اس کے گنجے سر کی ایک طرف رگ نمایاں دکھائی دے رہی تھی، اور اس کی ٹھوڑی پر چاندی جیسے کھڑے بال نظر آ رہے تھے۔ سالگرہ کا تحفہ میز پر پڑا تھا۔ جب اس نے چائے کا ایک اور گلاس بھرا، اس نے اپنی عینک لگائی اور خوشی سے چمکتے ہوئے پیلے، سبز اور سرخ چھوٹے چھوٹے جاروں کا پھر سے معائنہ کیا۔ اس کے بھدے نم ہونٹوں سے رواں لیبل ادا ہونے لگے --- خوبانی، انگور، ساحلی آلوچے، سفرجل۔ وہ جنگلی سیب تک پہنچا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجی ---

☆ ☆ ☆ ☆

یاسوناری کاواباتا

انگریزی سے ترجمہ: **خالد فرہاد دھاریوال**

مسّا

کل رات مجھے اس مسّے کے بارے میں خواب آیا۔ محض لفظ 'مسّا' کے ذکر سے تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے۔ کتنی بار تم نے اس مسّے کی وجہ سے مجھے ڈانٹا ہے۔ وہ میرے دائیں کندھے پر ہے یا یوں کہیں کہ میری پشت پر اوپر کی طرف ہے۔ "یہ پہلے ہی بڑا ہوتا جا رہا ہے۔ اور کھیل اس سے۔ جلد ہی اس میں سے کونپلیں نکلنے لگیں گی۔"

تم مجھے یہ کہہ کر چھیڑتے تھے، لیکن جیسا تم کہتے تھے، وہ جسامت میں ایک بڑا مسّا تھا، گول اور ابھرا ہوا۔ بچپن میں بستر پر پڑی پڑی میں اپنے اس مسّے سے کھیلتی رہتی۔ جب پہلی بار تم نے اسے دیکھا تو مجھے کتنی شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔ میں روئی بھی تھی اور مجھے تمھارا حیران ہونا یاد ہے۔

"سیوکو اسے مت چھوو۔ تم اسے جتنا چھوو گی، وہ اتنا ہی بڑا ہوتا جائے گا۔" میری ماں بھی مجھے اسی وجہ سے اکثر ڈانٹتی تھی۔ میں ابھی چھوٹی ہی تھی۔ بعد میں اپنے مسّے کو میں اکیلے میں ہی چھوتی تھی۔ یہ عادت بن گئی، حالاں کہ میں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتی تھی۔

جب تم نے پہلی بار اس پر غور کیا تب بھی میں چھوٹی ہی تھی، حالاں کہ میں آپ کی بیوی بن چکی تھی۔ پتہ نہیں تم، ایک مرد، کبھی یہ سمجھ پاؤ گے کہ میں اس کے لیے کتنی شرمندہ تھی، لیکن دراصل یہ شرمندگی سے بھی کچھ زیادہ تھا۔ یہ ڈراؤنا ہے میں سوچتی۔ اصل میں مجھے تب شادی بھی ایک خوفناک چیز لگتی تھی۔

مجھے لگا تھا کہ میرے تمام راز ظاہر ہو گئے ہیں، جیسے تم نے بھید کی سب تہیں ایک ایک کر کے ادھیڑ دی ہیں۔ وہ راز، جن سے میں بھی ناواقف تھی۔ اور اب میرے پاس کوئی پناہ گاہ نہیں بچی تھی۔

تم آرام سے سو گئے تھے۔ حالاں کہ میں نے کچھ راحت محسوس کی تھی، لیکن وہاں ایک تنہائی بھی تھی۔ کبھی کبھی میں چونک اٹھتی اور میرا ہاتھ اپنے ہی مسّے تک پہنچ جاتا۔

"اب تو میں اپنے مسّے کو چھو بھی نہیں سکتی۔" میں نے اس کے بارے میں اپنی ماں کو خط لکھنا چاہا، لیکن اس خیال سے ہی میرا چہرہ سرخ ہو جاتا۔

"مسّے کے بارے میں بیکار میں کیوں فکرمند رہتی ہو؟" تم نے ایک بار کہا تھا۔ میں مسکرا دی تھی،

لیکن اب مڑ کر دیکھتی ہوں تو لگتا ہے کہ کاش، آپ بھی میری عادت سے ذرا محبت کر پاتے۔

میں مسّے کو لے کر اتنی فکرمند نہیں تھی۔ ظاہر ہے، لوگ خواتین کی گردن کے نیچے چھپے مسّے کو نہیں ڈھونڈتے پھرتے۔ اور چاہے مسّا بڑی جسامت کا کیوں نہ ہو، اسے بدنما نہیں مانا جا سکتا۔ تمھیں کیا لگتا ہے، مجھے اپنے مسّے سے کھیلنے کی عادت کیوں پڑ گئی؟ اور میری اس عادت سے تم اتنا چڑتے کیوں تھے؟

''بند کرو،'' تم کہتے، ''اپنے مسّے سے کھیلنا بند کرو۔'' تم نے مجھے نہ جانے کتنی بار اس کے لیے جھڑکا۔ ''تم اپنا بایاں ہاتھ ہی اس کے لیے استعمال کیوں کرتی ہو؟'' ایک بار تم نے چڑ کر غصے میں پوچھا تھا۔

''بایاں ہاتھ؟'' میں اس سوال سے چونک گئی تھی۔ یہ سچ تھا۔ میں نے اس پر کبھی غور نہیں کیا تھا، لیکن میں اپنے مسّے کو چھونے کے لیے ہمیشہ اپنا بایاں ہاتھ ہی استعمال کرتی تھی۔

''مسّا تمھارے دائیں کندھے پر ہے۔ تم اسے اپنے دائیں ہاتھ سے آسانی سے چھو سکتی ہو۔''

''اچھا؟'' میں نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا۔ ''لیکن یہ عجیب بات ہے۔''

''یہ بالکل عجیب نہیں ہے۔''

''لیکن مجھے اپنے بائیں ہاتھ سے مسّا چھونا زیادہ قدرتی لگتا ہے۔''

''دایاں ہاتھ اس کے زیادہ قریب ہے۔''

''دائیں ہاتھ سے مجھے واپس جا کر مسّے کو چھونا پڑتا ہے۔''

''پیچھے؟''

''جی ہاں۔ مجھے گردن کے سامنے بازو لانے یا بازو اس طرح پیچھے، میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا ہوتا ہے۔'' اب میں چپ چاپ عاجزی سے تمھاری ہر بات پر ہاں میں ہاں نہیں ملا رہی تھی۔ حالاں کہ تمھاری بات کا جواب دیتے ہوئے میرے ذہن میں آیا کہ جب میں اپنا بایاں ہاتھ اپنے آگے لائی تو ایسا لگا جیسے میں تمھیں پرے ہٹا رہی تھی، جیسے میں اپنے آپ سے معانقہ کر رہی تھی۔ ''میں اس کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کر رہی ہوں'' میں نے سوچا۔

میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا، ''لیکن اس کے لیے بائیں ہاتھ کو استعمال کرنا غلط کیوں ہے؟''

''چاہے بایاں ہاتھ ہو یا دایاں، یہ ایک بری عادت ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔''

''کیا میں نے تمھیں کئی بار یہ نہیں کہا کہ تم کسی ڈاکٹر کے پاس جا کر اس کو نکلوا دو؟''

''لیکن میں ایسا نہیں کر سکی۔ مجھے ایسا کرنے میں شرم آئے گی۔''

‘‘یہ تو ایک معمولی بات ہے۔’’

‘‘اپنا مسّا ہٹوانے کے لیے کون کسی ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے؟’’

‘‘بہت سے لوگ جاتے ہوں گے۔’’

‘‘چہرے کے درمیان میں اُگے مسّے کے لیے جاتے ہوں گے، لیکن مجھے شک ہے کہ کوئی اپنی گردن کے نیچے اُگے مسّے کو ہٹوانے کے لیے کسی ڈاکٹر کے پاس جائے گا۔ ڈاکٹر ہنسے گا۔ اسے پتہ لگ جائے گا کہ میں اس کے پاس اس لیے آئی ہوں، کیوں کہ میرے شوہر کو وہ مسّا پسند نہیں ہے۔’’

‘‘تم ڈاکٹر کو بتا سکتی ہو کہ تم اس مسّے کو اس لیے ہٹوانا چاہتی ہو، کیوں کہ تمھیں اس سے کھیلنے کی بری عادت ہے۔’’

‘‘میں اسے نہیں ہٹوانا چاہتی۔’’

‘‘تم بہت اڑیل ہو۔ میں کچھ بھی کہوں، تم خود کو تبدیل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرتی۔’’

‘‘میں کوشش کرتی ہوں۔ میں نے کئی بار اونچے کالر والے کپڑے بھی پہنے ہوئے تھے تاکہ میں اسے نہ چھو سکوں۔’’

‘‘تمھاری ایسی کوشش زیادہ دن نہیں چلتی۔’’

‘‘لیکن میرا اپنے مسّے کو چھونا کیا اتنا غلط ہے؟’’ انھیں ضرور لگ رہا ہوگا کہ میں ان سے بحث کر رہی ہوں۔

‘‘یہ غلط نہیں بھی ہو سکتا، لیکن میں تمھیں اس لیے منع کرتا ہوں، کیوں کہ مجھے تمھارا ایسا کرنا پسند نہیں۔’’

‘‘لیکن آپ یہ کیوں ناپسند کرتے ہو؟’’

‘‘اس کی وجہ جاننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ تمھیں اس مسّے سے نہیں کھیلنا چاہیے۔ یہ ایک بری عادت ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم ایسا کرنا بند کردو۔’’

‘‘میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ میں ایسا کرنا بند نہیں کروں گی۔’’

‘‘اور جب تم اسے چھوتی ہو تو تمھارے چہرے پر وہ عجیب کھویا سا تاثر ابھر آتا ہے۔’’

شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو کچھ ایسا تھا کہ تمھاری بات براہ راست میرے دل میں اتر گئی۔ اور میں اتفاق میں سر ہلانا چاہتی تھی۔

‘‘اگلی بار جب تم مجھے ایسا کرتے دیکھو تو میرا ہاتھ پکڑ لینا۔ میرے چہرے پر ہلکی چپت لگا دینا۔’’

‘‘لیکن کیا تمھیں یہ بات پریشان نہیں کرتی کہ گزشتہ دو تین سالوں سے کوشش کرنے کے بعد بھی تم

اپنی اتنی معمولی سی عادت بھی نہیں بدل سکی ہو؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں تمھارے الفاظ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

میرے گلے کے آگے سے میری پشت کی طرف جاتا ہوا میرا بایاں ہاتھ، یہ ادا ضرور کچھ اداس اور کھوئی سی لگتی ہوگی۔ حالاں کہ میں اس کے لیے 'تنہائی' جیسا کوئی لفظ استعمال کرنے سے ہچکچاؤں گی۔ حقیر اور کم تر، صرف خود کو بچانے میں مگن ایک عورت کی ادا۔ اور میرے چہرے کے تاثرات سے بالکل ویسا ہی لگتا ہوگا جیسا تم نے بتایا تھا، 'عجیب، کھویا سا'۔

کیا یہ اس بات کی علامت تھی کہ میں نے تمھیں کامل خود سپردگی نہیں بخشی تھی، جیسے ہمارے درمیان اب بھی کوئی خلا باقی تھا۔ اور کیا میرے سچے تاثرات تب میرے چہرے پر نمایاں ہو جاتے تھے، جب میں اپنے مٹے کو چھوتی تھی اور اس سے کھیلتے وقت تصورات میں کھو جاتی تھی، جیسا کہ میں بچپن سے کرتی آئی تھی؟

لیکن یہ اس لیے ہوتا ہوگا، کیوں کہ آپ پہلے ہی مجھ سے غیر مطمئن تھے، تبھی تو آپ اس چھوٹے سے معاملے کو اتنا طول دیتے تھے۔ اگر آپ مجھ سے خوش رہے ہوتے، آپ مسکرا دیتے اور میری اس عادت کے بارے میں زیادہ سوچتے ہی نہیں۔

وہ ایک ڈراونی سوچ تھی۔ تب میں کانپنے لگتی جب اچانک مجھے یہ خیال آتا کہ کچھ ایسے مرد بھی ہوں گے جنھیں میری یہ عادت دلکش لگتی ہوگی۔

یہ میرے لیے تمھارا پیار ہی رہا ہوگا جس کے سبب تم نے اس طرف پہلی بار توجہ دی۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن یہ ٹھیک ان چھوٹی موٹی چڑانے والی چیزوں کی طرح ہوتا ہے، جو بعد میں بڑھ کر بگڑ جاتی ہیں اور ازدواجی تعلقات میں اپنی جڑیں پھیلا لیتی ہیں۔ حقیقی شوہر اور بیوی کے درمیان ان ذاتی پاگل باتوں کا کوئی اثر نہیں پڑتا، لیکن مجھے لگتا ہے کہ دوسری طرف ایسے میاں بیوی بھی ہوتے ہیں جو ہر بات پر خود کو ایک دوسرے کے خلاف پاتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ وہ جوڑے جو آپس میں سمجھوتہ کر کے چلتے ہیں، ایک دوسرے سے محبت ہی کرتے ہوں۔ نہ ہی ایسا ہے کہ جن کی رائے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، وہ جوڑے ایک دوسرے سے نفرت ہی کرتے ہوں۔ حالاں کہ میں یہ ضرور سوچتی ہوں، اور یہ سوچنے سے خود کو روک نہیں پاتی کہ یہ بہتر ہوتا، اگر تم مٹے سے کھیلنے کی میری عادت کو نظر انداز کر دیتے۔

اصل میں تم میری پٹائی پر آمادہ ہو گئے۔ میں روئی اور میں نے پوچھا کہ تم اتنے متشدد کیوں ہو گئے ہو؟ صرف اپنا مٹا چھونے کی مجھے ایسی سزا کیوں ملے؟ اپنی جلدی تو چھوڑ رہی تھی میں۔ ''تمھاری اس بیماری کا علاج کیا ہے؟'' غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں تم نے کہا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ تم کیسا محسوس کر رہے تھے اور تم نے

ابھی جو کیا تھا، اس کے بارے میں میری ناراضی بھی جاتی رہی۔ اگر میں نے کسی اور کو یہ بتایا ہوتا تو وہ آپ کو بداطوار شوہر کہتا۔ لیکن چوں کہ ہمارے تعلقات ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں کوئی معمولی بات بھی ہمارے درمیان کشیدگی بڑھا دیتی تھی، جب تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا، تو جیسے اس نے دراصل مجھے اچانک نجات دلا دی۔

’’میں اس عادت کو کبھی نہیں چھوڑ پاؤں گی، کبھی نہیں۔ میرے ہاتھ باندھ دو۔‘‘ میں نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر تمھارے سینے کی طرف بڑھا دیے۔ گویا میں خود کو تمھارے حوالے کر رہی تھی۔

تم چکرا گئے۔ تمھارے غصے نے تمھیں نرم بنا دیا تھا، جذبات سے عاری کر دیا تھا۔ تم نے میری کمر بند میں سے ڈوری لے کر اس سے میرے ہاتھ باندھ دیے۔

میں اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں سے اپنے بالوں کو سنوارنے کی کوشش کرنے لگی اور مجھے خوشی ہوئی، جب میں نے تمھیں اپنی طرف جھانکتے ہوئے دیکھا۔ میں نے سوچا کہ اس بار میری یہ عادت چھوٹ ہی جائے گی۔ حالاں کہ اس وقت بھی اس مسّے کا ہلکا سا ذکر ہی کسی کے لیے خطرناک تھا۔

کیا میری مسّا چھونے کی عادت دوبارہ لوٹ آنے کی وجہ سے ہی آخر میں میرے لیے تمھارا بچا کھچا پیار بھی ختم ہو گیا؟ کیا تم مجھے یہ بتانا چاہتے تھے کہ تمھیں مجھ سے کوئی امید نہیں تھی اور میں جو چاہے کر سکتی تھی؟ اب جب میں اپنے مسّے سے کھیلتی، تم ایسے ظاہر کرتے جیسے تم نے یہ سب دیکھا نہیں۔ تم مجھ کو کچھ نہ کہتے۔

پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ میری وہ عادت جو ڈانٹنے اور پیٹنے سے بھی نہیں گئی، ایک دن اپنے آپ چھوٹ گئی۔ ڈرانے دھمکانے والا کوئی بھی حربہ کارگر ثابت نہیں ہوا۔ وہ عادت خود بہ خود چلی گئی۔

’’کیا تم جانتے ہو، اب میں اپنے مسّے سے نہیں کھیلتی ہوں۔‘‘ میں نے کہا جیسے مجھے اس کے بارے میں ابھی پتہ چلا ہو۔ تم غرائے اور تم نے ایسے ظاہر کیا جیسے تمھیں اس بات کی کوئی پروا نہ ہو۔

اگر تمھارے نزدیک یہ کوئی معاملہ ہی نہیں تھا، تو پھر تم مجھے اس کے لیے ڈانٹتے کیوں تھے؟ میں چاہتی تھی کہ تم مجھ سے اس کے بارے میں پوچھو، لیکن تم تھے کہ مجھ سے بات ہی نہیں کر رہے تھے۔

جیسے مسّا چھونے کی میری عادت کی تمھیں کوئی پروا نہ ہو، جیسے میں جو چاہوں کرنے کے لیے آزاد ہوں، تمھارے چہرے کے تاثرات تو یہی بتاتے تھے۔ میں نے خود کو رنجیدہ محسوس کیا۔ تمھیں تنگ کرنے کے لیے ہی سہی، میں اپنے مسّے کو تمھارے سامنے دوبارہ چھونا چاہتی تھی، لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ میرے ہاتھوں نے ہلنے سے انکار کر دیا۔ میں نے خود کو تنہا محسوس کیا۔ اور مجھے غصہ آیا۔

جب تم آس پاس نہیں تھے، اس وقت بھی میں نے اپنے مسّے کو چھونے کے بارے میں سوچا، لیکن

نہ جانے کیوں یہ مجھے شرمناک اور نفرت انگیز لگا اور ایک بار پھر میرے ہاتھوں نے ہلنے سے انکار کر دیا۔

میں نے فرش کی طرف دیکھا اور اپنے دانتوں سے اپنا ہونٹ کاٹنے لگی۔

''تمھارے مسّے کو کیا ہوا؟'' میں انتظار کرتی رہی کہ تم مجھ سے یہ پوچھو گے، لیکن اس کے بعد تو ہماری باہمی گفتگو سے لفظ 'مسّا' ہی غائب ہو گیا۔

اور شاید اس کے ساتھ ہی ہمارے درمیان کئی اور چیزیں بھی غائب ہو گئیں۔

جب تم مجھے ڈانٹا کرتے تھے، ان دنوں میں کچھ کیوں نہیں کر سکی؟ میں کتنی نکمی عورت ہوں۔

پھر تم سے بچھڑ کر، میں اپنے مائیکے لوٹ آئی۔ انہی دنوں میں نے ایک بار ماں کے ساتھ غسل کیا۔

''اب تو اتنی خوبصورت نہیں رہی جتنی پہلے تھی، ساؤ کو!'' وہ بولی، ''شاید تو بڑھتی ہوئی عمر کے خلاف مدافعت نہیں کر سکتی۔''

میں نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی پہلے جیسی ہی نظر آتی تھی، گول مٹول، لیکن تر و تازہ جلد والی۔

''اور تمھارا وہ مسّا پہلے انتہائی پرکشش ہوا کرتا تھا۔''

اس مسّے کی وجہ سے مجھے واقعی تکلیف سہنی پڑی تھی لیکن میں اپنی ماں سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی۔ میں نے کہا، ''لوگ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر با آسانی مسّے کو ہٹا سکتا ہے۔''

''اچھا؟ ڈاکٹر! لیکن داغ تو رہ ہی جائے گا۔'' میری ماں کتنی پرسکون اور خوش طبع تھی۔ ''ہم تمھارے مسّے کے بارے میں باتیں کر کے ہنسا کرتے تھے۔ ہم کہتے کہ شادی کے بعد بھی سیو کو اپنے مسّے سے کھیلتی ہو گی۔''

''جی ہاں، میں اس سے کھیلتی تھی۔''

''ہمارا خیال تھا کہ تم ایسا کرتی ہو گی۔''

''یہ ایک بری عادت تھی۔ میں نے یہ کب شروع کیا ہو گا؟''

''پتہ نہیں، بچوں کے بدن میں کب مسّے نظر آنے لگتے ہیں؟ دودھ پیتے بچوں کے تو مسّا نہیں ہوتا۔''

''میرے بچوں کے بدن پر کوئی مسّا نہیں۔''

''اچھا؟ لیکن جیسے جیسے بچے بڑے ہونے لگتے ہیں، وہ نظر آنے لگتے ہیں۔ اور پھر وہ غائب نہیں ہوتے۔ لیکن اس جسامت کا مسّا عام طور پر نہیں ہوتا۔ جب تو ننھی سی بچی تھی، یہ مسّا تبھی سے وہاں ہو گا۔'' میری ماں میرے کندھے کی طرف دیکھ کر ہنسی۔

مجھے یاد آیا، جب میں چھوٹی تھی تو میری ماں اور میری بہنیں کبھی کبھار اس مسّے کو چھوتی تھیں۔ وہ مسّا تب انتہائی پُرکشش لگتا تھا۔ کیا یہی وجہ نہیں تھی، جس نے مجھے بھی اس مسّے سے کھیلنے کا عادی بنا دیا؟

میں بستر پر لیٹی ہوئی اپنے مسّے سے کھیلتی رہی۔ میں یاد کرنے کی کوشش کرتی رہی کہ جب میں کمسن تھی، کیا تب بھی میں اس مسّے سے کھیلتی تھی۔

یہ بہت عرصہ پہلے کی بات تھی، جب میں پچھلی بار اپنے اس مسّے سے کھیلی تھی۔ پتہ نہیں کتنے سال پہلے کی بات ہو گی۔

تم سے دور اپنے مائیکے گھر میں جہاں میری پیدائش ہوئی تھی، میں اپنے مسّے کے ساتھ جیسے چاہوں کھیل سکتی تھی۔ یہاں مجھے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔

لیکن یہ بھی معقول نہیں تھا۔

جیسے ہی میری انگلی نے اس مسّے کو چھو لیا، میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں برسوں پہلے کی بات سوچنا چاہتی تھی، جب میں چھوٹی تھی، لیکن جب میں نے مسّے کو چھو لیا تو مجھے صرف تم یاد آئے۔

میں ایک بری بیوی کے طور پر مردود ٹھہری ہوں، اور شاید مجھے طلاق بھی دے دی جائے گی، لیکن یہ تو میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ یہاں مائیکے میں بستر پر لیٹے ہوئے مجھے صرف تمھارا ہی خیال آئے گا۔

میں نے اپنے گیلے تکیے پر کروٹ بدلی۔ مجھے جھپکی آ گئی اور مجھے خواب بھی اسی مسّے کا آیا۔

جب میں بیدار ہوئی تو میں نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ کمرہ کہاں کا تھا، لیکن آپ وہاں موجود تھے۔ ممکنہ طور پر ہمارے ساتھ کوئی اور عورت بھی تھی۔ میں شراب پی رہی تھی۔ یقیناً میں نشے میں تھی۔ میں کسی چیز کے لیے تم سے تکرار کر رہی تھی۔

میری بری عادت پھر عود کر آئی۔ میں نے مسّے کو چھونے کے لیے اپنا بایاں ہاتھ آگے بڑھا لیا۔ ہمیشہ کی طرح میرا بازو میری چھاتی کے آگے سے ہو کر پیچھے کی طرف جا رہا تھا، لیکن چھوتے ہی مسّے کو کیا ہو گیا؟ کیا وہ اکھڑ کر میری انگلیوں میں نہیں آ گیا؟ بغیر کسی درد کے وہ جلد پر سے ایسے نکل آیا جیسے یہ دنیا کی سب سے فطری بات ہو۔ میری انگلیوں میں وہ مسّا ٹھیک کسی بھنے ہوئے لوبیے کے دانے کی طرح محسوس ہوا۔

کسی بگڑی ہوئی بچی کی طرح میں نے تم سے ضد کی کہ میرے اس مسّے کو اپنی ناک کے پاس موجود اپنے مسّے کے قریبی گڑھے میں ڈال لو۔

میں نے اس مسّے کو تمھاری طرف دھکیلا! میں ہاتھ پیر پٹک کر چلائی۔ میں نے تمھاری آستین پکڑ لی

اور تمھارے سینے سے لگ گئی۔ جب میری نیند کھلی، میرا تکیہ ہنوز گیلا تھا۔ میں اب بھی رو رہی تھی۔ حالاں کہ میں انتہائی تھکاوٹ محسوس کر رہی تھی، مجھے ایسا بھی محسوس ہوا جیسے میں ہلکی ہو گئی ہوں، جیسے ایک بھاری بوجھ میرے سر سے اتر گیا ہے۔

کچھ دیر تک میں شادمانی سے لیٹی رہی، یہ سوچتے ہوئے کہ کیا میرا مسّا واقعی غائب ہو گیا تھا۔ اسے چھونے میں بھی مجھے وقت ہو رہی تھی۔ میرے مسّے کی پوری کہانی بس یہی ہے۔ میں اب بھی اسے اپنی انگلیوں کے درمیان کسی سیاہ دانے سا محسوس کر سکتی ہوں۔

تمھاری ناک کے پاس اُگے ہوئے اس چھوٹے سے مسّے کے بارے میں میں نے تو کبھی زیادہ نہیں سوچا۔ اور نہ ہی میں نے اس کے بارے میں کبھی بات ہی کی۔ پھر بھی مجھے لگتا ہے کہ تمھارا وہ مسّا ہمیشہ میرے دھیان میں رہا ہے۔

یہ کتنی عمدہ کہانی بن جائے گی، اگر تمھارا وہ مسّا واقعی سوج جائے، کیوں کہ تم نے اس کے اوپر میرا مسّا رکھ لیا ہے اور اس بات سے مجھے کتنی خوشی ہوگی اگر مجھے پتا چلے کہ تم نے میرے مسّے کے بارے میں خواب دیکھا تھا۔

ایک بات میں بھول ہی گئی۔ تمھیں میرے چہرے کی اداسی کا شکوہ تھا اور میں یہ اتنی اچھی طرح جانتی تھی کہ مجھے لگتا جیسے تمھاری خفگی میرے لیے تمھارے پیار کی علامت ہے۔ مجھے بھی محسوس ہوتا کہ جب میں اپنے مسّے کو انگلیوں سے چھو رہی ہوتی تو میرے اندر کی ساری ناقص چیزیں جیسے باہر آ جاتیں۔

مجھے لگتا ہے کہ ایک حقیقت جس کا ذکر میں نے پہلے بھی کیا ہے، مجھے دہرانی نہیں چاہیے۔ شاید میری ماں اور بہنیں میرے بچپن میں جس طرح میرے مسّے کو پیار سے سہلاتی تھیں، اسی سبب مجھے اپنے مسّے کو چھو کرنے کی عادت پڑ گئی ہوگی۔

''مجھے لگتا ہے، بچپن میں جب میں اپنے مسّے سے کھیلتی تھی تو آپ مجھے ڈانٹتی تھیں،'' میں نے ماں سے کہا۔

''جی ہاں، لیکن یہ صرف بچپن کی ہی بات نہیں ہے۔''

''تو مجھے کیوں ڈانٹتی تھی، ماں؟''

''کیوں؟ کیوں کہ یہ ایک بری عادت تھی، اس لیے۔''

''لیکن جب آپ مجھے اپنے مسّے سے کھیلتے ہوئے دیکھتی تھیں تو کیسا محسوس کرتی تھیں؟''

''دیکھو۔'' ماں اپنا سر ایک طرف جھکا کر بولی، ''مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔''

”صحیح کہا، لیکن میرے ایسا کرنے پر کیا تمھیں مجھ پر افسوس ہوتا تھا؟ یا تم یہ سوچتی تھیں کہ میں نفرت انگیز کام کرنے والی ایک گندی لڑکی تھی؟“

”میں نے اس بارے میں کبھی زیادہ نہیں سوچا۔ تمھارے چہرے پر اداسی کا تاثر دیکھ کر مجھے لگتا تھا کہ تم اپنے مٹے سے نہ کھیلو تو اچھا ہے۔“

”کیا آپ میری اس حرکت سے چڑتی تھیں؟“

”جی ہاں، مجھے تھوڑی فکر ہوتی تھی۔“

اگر یہ سچ ہے تو کیا میرا کھوئے ہوئے انداز میں اپنے مٹے کو سہلانا بچپن میں میری طرف سے اپنی ماں اور بہنوں کی محبت کو یاد کرنے کا میرا ایک طریقہ نہیں تھا؟

جن لوگوں سے میں محبت کرتی تھی، کیا میں ان کے بارے میں سوچتے ہوئے ایسا نہیں کر رہی تھی؟

یہی وہ بات ہے جو مجھے تم سے ضرور کہنی ہے۔

کیا میرے مٹے کے بارے میں تمھارا تاثر شروع سے آخر تک غلط نہیں تھا؟

جب میں تمھارے ساتھ ہوتی تھی تو کیا میں کسی اور کے بارے میں سوچ سکتی تھی؟

بار بار میں سوچتی ہوں کہ میری جس حرکت سے تمھیں اتنی چڑ ہے کیا وہ میری اس محبت کے اظہار کا ایک طریقہ نہیں تھا، جسے میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی تھی۔

مٹے سے کھیلنے کی میری عادت تو ایک انتہائی معمولی بات تھی، اور میں اس کے دفاع میں کوئی بہانہ نہیں بنا رہی، لیکن تمھاری نگاہوں میں مجھے ایک بری بیوی بنا دینے والی وہ تمام چیزیں بھی کیا اسی طرح شروع نہیں ہوئی تھیں؟ کیا ایسا نہیں تھا کہ شروع شروع میں وہ سب بھی تمھارے لیے میری محبت کے اشارے ہی تھیں جو تمھارے لیے بعد میں اس لیے غیر شائستہ ہو گئیں، کیوں کہ تم نے ان کی سچائی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا؟

اب جب میں یہ سب لکھ رہی ہوں، تو کیا اپنے ساتھ ہوئی ناانصافی کی بات کر کے میں ایک بری بیوی جیسا سلوک کر رہی ہوں؟ جو بھی ہو، یہ کچھ چیزیں ہیں، جو تمھیں بتانا ضروری ہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆

ایوالڈو ویوریو

انگریزی سے ترجمہ: **اعظم ملک**

تلاش

فورمینٹرا کا بوڑھا ڈسیوٹ، مجھے لگتا تھا کہ دنیا کا سب سے خوش مزاج آدمی ہے اور شاید سب سے غریب بھی۔ مروے کی طرح پیلا رنگ، خمیدہ کمر اور چہرے پر جھریاں۔ اور اس کے کپڑوں پر جگہ جگہ پیوند لگے تھے۔ وہ کالا پوجول میں ماہی گیروں کے محلے کی ایک جھونپڑی میں رہتا تھا۔ اس کے پاس لوہے کے چند ٹوٹے ہوئے بدرنگ سے برتن تھے اور اس کے پاس غوطہ خوری کا مکھوٹا، تیراکی کے لیے ربڑ کے پنجے اور ایک عمدہ ٹیوب تھی۔

مسلسل کئی برسوں سے میں فورمینٹرا آتا رہا تھا اور میں نے ڈسیوٹ کو گووی کے اختتام پر جہاں چٹانیں شروع ہوتی ہیں، جھاڑیوں کے سائے میں لنگر انداز کشتیوں کے درمیان بوڑھے ماہی گیروں کے ساتھ دیکھا تھا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ ماہی گیر نہیں ہے۔

میں اس کی زبان جو ہسپانوی کے معیاری لہجے سے قدرے مختلف تھی، کچھ کچھ سمجھ لیتا تھا۔ وہ ایک ماہی گیر سے اس کی چھوٹی کشتی التجا کے لہجے میں نہیں بلکہ اجازت لینے کے انداز میں مانگ رہا تھا۔ میں تو اسے ماہی گیر سمجھتا تھا اور یہ جان کر مجھے حیرانی ہوئی کہ اس کے پاس کشتی نہیں ہے۔ میں نے فورمینٹرا میں ایک کشتی کرایے پر لے رکھی تھی، سو میں نے اس سے کہا کہ میری کشتی لے جاؤ۔ اس نے شکریے کے ساتھ میری پیشکش قبول کر لی۔

میں کھڑا دیکھتا رہا۔ اس نے کشتی میں اپنی ٹیوب، ربڑ کے پنجے، مکھوٹا، پانی کی صراحی اور کچھ کھانے پینے کا سامان لادا۔ اس کے پاس ڈور کھینچنے والی چرخی اور زیرِ آب کام آنے والی بندوق بھی نہیں تھی۔ میں حیران تھا کہ کیا چیز پکڑنا چاہتا ہے اور اسے کیسے پکڑے گا! میرے دیکھتے دیکھتے وہ افق کی طرف چل پڑا۔ میں اسے تب تک دیکھتا رہا، جب تک کہ وہ افق پر ایک دھبے سا نظر آنے لگا۔

اور پھر میں اس کے بارے میں سب کچھ بھول گیا۔ کالا پوجول میں بھول جانا بڑا آسان ہے اور آسودگی میں آدمی جلدی بھول جاتا ہے۔

ایک دن کی بات ہے، افریقہ کی طرف سے بڑی تیز ہوائیں چل رہی تھیں اور سمندر امس بھرا تھا۔ ماہی گیر

ساحل سمندر پر بانس کی چھت والی جھونپڑی میں بیٹھے شراب پی رہے تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

"وسیوٹ آیا؟"

"ابھی نہیں۔"

"بڑا سنکی ہے۔"

"اتنا سنکی تو نہیں ہے وہ! اس کے ارادے نیک ہیں۔"

"تم ایسا کہتے ہو، تم بھی پاگل ہو۔"

"میں؟ بالکل نہیں۔ میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔"

میں نے پوچھ لیا، "کیا وسیوٹ وہی آدمی ہے، جس کے پاس غوطہ خوری کا سامان ہے۔"

"ہاں، ہاں۔" سب بولے۔

میں نے بھی ایک بوتل منگوالی اور ان کے ساتھ بیٹھ کر پینے لگا۔ انھوں نے مجھے وسیوٹ کی یہ کہانی سنائی:

"آج سے ساٹھ سال پہلے وہ ایک پُرعزم لڑکا تھا اور فورمینٹرا ٹاپو چھوڑ کر کسی غیر ملکی بحری جہاز کے ساتھ چلا گیا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ واپس لوٹ آیا۔ ملک بھر میں گھوم پھر کر اس نے کئی کام دھندے کیے اور آخر میں وہ بارسلونا کے گھاٹ پر قلی کا کام کرنے لگا۔

اس نے ایک خواب دیکھا تھا، مگر انسان کے خواب کب پورے ہوتے ہیں۔ وہ امیر ہسپانوی اور دوسرے سیاحوں کا سامان ڈھوتا۔ آج سے دس سال پہلے تک وہ اپنے ہیٹ پر اپنا نمبر چپکائے، گھاٹ پر کھڑا رہتا، کشتیوں سے اترتے مسافروں کی طرف ہاتھ ہلا ہلا کر چلاتا تھا، "میں ہوں نمبر تیرہ۔"

ایک دن ایک دولت مند امریکی نے اپنی کشتی سے اس کو ہاتھ ہلاتے دیکھا اور اشارے سے اسے بلایا۔ دوسرے قلیوں کو دھکیلتا ہوا وسیوٹ سفید کشتی کے پاس پہنچا۔ وہاں اس دولتمند امریکی نے اس سے کہا، "یہ چھ صندوق ہیں، اور یہ چیز ذرہ دھیان سے، بڑی قیمتی چیز ہے یہ۔"

وسیوٹ مٹی کے اس برتن کو پہچان گیا۔ وہ ایک نایاب فونیشین صراحی تھی۔ پرانے زمانے میں ماہی گیروں کے جال میں ایسی صراحیاں آ جاتی تھیں اور وہ انھیں واپس سمندر میں پھینک دیا کرتے تھے۔ لیکن جب شہر سے معزز لوگ انھیں خریدنے کے لیے آنے لگے، تو ماہی گیروں نے انھیں واپس سمندر میں پھینکنا بند کر دیا۔

وسیوٹ نے سوٹ کیس اپنی پیٹھ پر لادے اور اس بڑی سی گلابی صراحی کو ہاتھ میں اٹھا کر چل پڑا۔ کشتی سے اترنے اور سوار ہونے والے لوگوں کی دھکم پیل جاری تھی۔ اس شور وغوغے میں وہ بھی چیخ رہا تھا۔ وہ گھاٹ تک پہنچ گیا۔ تبھی ایک قلی کشتی کے لنگر سے ٹھوکر کھا کر وسیوٹ پر گر پڑا اور صراحی وسیوٹ کے ہاتھ سے چھوٹ

گئی۔ دو ہزار سال پرانی صراحی ٹھیکروں کا ڈھیر بن گئی۔

دس سال پہلے خلیج ایزا کے ٹاپو کے پایاب پانیوں میں یونانیوں، کنعانیوں اور رومیوں کے نوادرات بہ کثرت ملتے تھے لیکن موجودہ زمانے میں عام طور پر وہاں معمولی چیزیں ہی دستیاب ہوتی تھیں۔ گراں بہا چیزیں مفقود تھیں۔ امریکی سیاح نے پانچ سو ڈالر دے کر اصلی فونیشین صراحی ہونے کی پوری تسلی کر کے اسے ایک ملاح سے خریدا تھا۔ اس کا قلی پر غضبناک ہونا فطری تھا۔

لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وسیٹ جیسا غریب قلی زندگی بھر پانچ سو ڈالر اکٹھے نہیں کر پائے گا۔ اس لیے وہ صبر کر گیا اور اپنا نقصان بھول جانے کو تیار ہو گیا۔

لیکن وسیٹ ویسا نہ کر سکا۔ وہ ان بے مصرف قدیم برتنوں کی قدر و قیمت سے آگاہ تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ صراحی کے ٹوٹنے پر امریکی کے چہرے پر کیسی گہری مایوسی چھا گئی تھی۔ وسیٹ آبرو مند آدمی تھا اور وہ اس امریکی کو ہرجانہ دینا چاہتا تھا۔

جب وہ ہوٹل پہنچے، اس نے امریکی سے اس کا نام اور پتہ مانگا اور ادائیگی کا وعدہ کیا۔ امریکی نے ڈائری کے ایک صفحے پر یہ پتہ لکھ دیا: ''ابراہم لنکن سمتھ، 72 ہڈسن ایوینیو ملوا کی، وسکانسن، یو ایس اے۔'' کاغذ کا یہ ٹکڑا وسیٹ کا سب سے قیمتی اثاثہ بن گیا۔ یہ پتہ اب تلاش کے طویل سفر کی آخری منزل تھا۔

میرا خیال ہے وسیٹ نے خواب دیکھا کہ بالآخر وہ نادر فونیشین صراحی کو بغل میں دبائے ملوا کی وسکانسن پہنچا اور اپنے خیر مقدم اور توصیف سے خوش ہوا۔

وسیٹ جانتا تھا کہ صراحی خریدنے کے لیے مطلوبہ رقم وہ کبھی اکٹھی نہیں کر پائے گا۔ لیکن وہ ویسی صراحی ڈھونڈ تو سکتا تھا۔ جب وہ چھوٹا تھا، زیادہ تر کو ایسی درجنوں صراحیاں مل جاتی تھیں تو اسے اب کیوں نہ ملے گی؟

اس کے بیوی بچے تو تھے نہیں۔ سو اس نے بارسلونا کو الوداع کہنے میں تاخیر نہیں کی، وہ مصروف ساحلی شہر جہاں حقیر معاوضے پر سامان ڈھوتے دن بسر ہوتا تھا اور بے در و دیوار چھت تلے رات گزرتی تھی۔

جو کچھ سامان پاس تھا، سب اس نے بیچ دیا۔ ایزا کا ٹکٹ خریدنے کے بعد اس کے پاس بہت تھوڑے پیسے باقی رہ گئے تھے۔ جہاز کے عرشے سے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو شہر سمندر میں غرقاب دکھائی دیا۔ اور اس نے پہلی بار جانا کہ یہاں گزارہ عرصہ حیات خود ساختہ قید تھی۔ وہ کبھی بھی یہاں کی تنگ و تاریک گلیوں سے آسمان کی وسعتوں کو دیکھ ہی نہیں پایا تھا۔

ایک بار پھر، جیسا کہ اُس کے لڑکپن میں ہوتا تھا، اس نے سمندر کو گاتے ہوئے سنا۔

وہاں پہنچ کر اس نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اس نے اس جگہ کا پتہ لگایا، جہاں آخری بار فونیشین صراحی ملی تھی اور اس نے محسوس کیا کہ ساحل کے قرب وجوار کی سبھی جگہوں سے لوگوں نے تمام صراحیاں ڈھونڈھ نکالی ہوں گی۔

ونسینٹ نے سمندر کی تہہ میں غوطہ خوری کے ماہر سانتا اولالیا ڈیل ریو کے نوجوان ساندک نامی ایک بڑھئی کے سپوت کے ساتھ مشورہ کیا۔ اس مشاورت کے لیے ونسینٹ بذریعہ لاری سانتا اولالیا ڈیل ریو گیا۔ ساندک غوطہ خور نے بتایا کہ پیراکی کا سامان لو اور سمندر میں کود جاؤ۔ ایسے کئی اجنبی مقام ہیں، جہاں پانی بیس تیس ہاتھ گہرا ہے، کسی غار کی تہہ میں وہاں کوئی خزانہ ہاتھ لگ سکتا ہے۔

اب ونسینٹ کو تیرنا آتا نہیں تھا۔ اس کے پاس جو بھی پیسہ بچا تھا، اس سے اس نے ساندک کی ہدایت کے مطابق غوطہ خوری کا ساز وسامان خریدا پھر وہ ایک چھوٹی ڈاک کشتی میں سوار ہو کر فرمینترا واپس آ گیا۔ اس نے ساحل پر ڈیرے ڈال دیے اور بڑی لگن کے ساتھ تیراکی سیکھنے میں جٹ گیا۔

وہ ساٹھ برس کا بوڑھا تھا، تاہم تیراکی سیکھنے کے لیے اس کا عزم جوان تھا۔

جلد ہی اس نے صرف تیرنا ہی نہیں، بلکہ مکھوٹا اور دوسرے ساز وسامان سے لیس ہو کر مینڈک کی طرح گہرا غوطہ لگانا بھی سیکھ لیا۔ وہ سمندر میں دور تک چلا جاتا، جہاں پانی نیلگوں ہو جاتا ہے۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے باتوفی عہد تھا۔ گہرے سمندر کی غیر متوقع خوبصورتی پر وہ مبہوت ہو جاتا۔ وہاں ستارہ مچھلیوں کے غول تھے، چھوٹی آنکھوں والی رنگ برنگی نازک مچھلیاں تھیں جو اس کا تعاقب کرتیں۔ سمندر کی تہہ میں پراسرار غاروں اور چٹانوں تک سورج کی ترچھی کرنیں پہنچتی تھیں۔ وہ سطح آب تک محدود ماہی گیروں کو یہ سب بتاتا۔ اس کے قصے خوف اور حیرت لیے ہوتے۔ سمندر میں اسے زندگی کی آزادی کا پہلی بار احساس ہوا۔

’’آپ وہاں سانس نہیں لے سکتے۔‘‘

’’وہاں اپنی آنکھوں سے دم کشید کرتے ہیں۔‘‘

سمندر کا ایسا مدھر سنگیت اس نے زندگی میں کبھی نہیں سنا تھا۔

’’لیکن سمندر کی تہہ میں صرف خاموشی ہے۔‘‘

’’یہ گنگناتی ہوئی خاموشی ہے۔ جیسے کثیر آلات موسیقی اپنا آہنگ اوپر آسمان کی طرف بھیج رہے ہوں۔‘‘

دن ہفتوں میں ڈھلتے گئے، ہفتے مہینوں میں، مہینے برسوں میں، اور ونسینٹ کی تلاش جاری رہی۔ وہ مانتا تھا کہ اس کے ہاتھوں جو صراحی ٹوٹ گئی ہے، اس کی جگہ دوسری صراحی دینا اس کا فرض ہے۔ ہر نیا دن اس کے لیے خوشی کا دن بھی ہوتا اور تکلیف کا بھی۔ اس کی روزمرہ کی ضرورتیں خود بخود پوری ہو جاتیں۔ اس کی تلاش

ساحلی ماہی گیروں کی زندگی کا حصہ بن گئی تھی اور وہ لوگ اس کے ساتھ سخاوت سے پیش آتے تھے۔

اس طرح ماہی گیروں نے وُنسیٹ کی پوری کہانی مجھے کہہ سنائی۔ افریقہ کی طرف سے چلنے والی تند و تیز ہوائیں سمندر کی گہرائیوں کو پلٹا کر بڑی سبز موجوں میں بدل رہی تھیں۔ اور میں، افق کی طرف دیکھتا ہوا چھوٹی کشتی کو تلاش کر رہا تھا۔ اسی دوران فادر پیڈرو ہماری مجلس میں آ بیٹھے تھے۔ میں ان کی طرف مڑا اور بولا: "فادر، کیا بوڑھے وُنسیٹ کو صراحی مل گئی؟"

موٹے ٹھگنے پادری نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں ملائیں اور نگاہیں افق پر گاڑ دیں، وہ پُرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ افریقہ کی طرف سے آنے والی ہواؤں نے ہماری جھونپڑی کی چھت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

"دیکھیے، بات ایسی ہے،" پادری بولا "وُنسیٹ کو تلاش تھی۔ اہم بات یہ نہیں ہے کہ آدمی کچھ پا لیتا ہے یا نہیں، بلکہ تلاش کی بذاتِ خود اہمیت ہے۔ فقط تلاش کی!"

پچھلے برس سمندر میں جب طوفان آیا تو وہ کشتی جو وُنسیٹ نے ادھار لی تھی، کنارے آ لگی۔

بوڑھا وُنسیٹ پھر دکھائی نہیں دیا۔

لیکن کشتی کے پیندے سے سمندری کائی میں ملفوف ایک صراحی مضبوطی سے بندھی ہوئی تھی۔ صدیوں پرانی صراحی، جو سمندر کی کوکھ سے نکلی تھی۔

چوں کہ میں انگریزی جانتا تھا، اس لیے فادر پیڈرو اور ایک ماہی گیر نے، جو وُنسیٹ کا دوست رہا تھا، مجھ سے کہا کہ میں ملواکی، وسکانسن میں رہنے والے ابراہم لنکن سمتھ کو خط لکھوں کہ آ کر اپنی صراحی لے جائے۔ میں نے خط تو لکھ دیا، لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ کئی اور خط بھی اسی پتے پر لکھے گئے، لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ ہار کر بالآخر میں نے ملواکی شہر کے میئر کو خط لکھا۔ ان کا جواب ملا "اس نام کا کوئی آدمی یہاں نہیں ہے۔"

شاید بوڑھے بیوقوف وُنسیٹ کے صراحی گرا دینے سے چڑ کر اور اس سے چھٹکارا پانے کے لیے امریکی نے یہ نام اختراع کیا تھا۔ یا ممکن ہے، امریکی ملواکی کا ہی رہا ہو۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

(کینیڈین ادب)

☆☆☆☆

رابندر ناتھ ٹیگور
انگریزی سے ترجمہ۔ حمزہ حسن شیخ

پوسٹ ماسٹر

پوسٹ ماسٹر پہلے پہل یولپور کے گاؤں میں اپنے فرائض انجام دیتا تھا۔ اگرچہ گاؤں بہت چھوٹا سا تھا، قریب ہی ایک نیل کی فیکٹری تھی اور اس کا مالک ایک انگریز تھا جس نے اپنے اثر و رسوخ سے وہاں ایک ڈاک خانہ لگوا دیا تھا۔

ہمارے پوسٹ ماسٹر کا تعلق کلکتہ سے تھا۔ وہ خود کو اس پس ماندہ گاؤں میں بن آب مچھلی کی طرح محسوس کرتا تھا۔ اس کا دفتر اور رہائش کا کمرہ ایک اندھیرے گھاس پھوس کی چھپر تلے تھا، جو کہ سرسبز، پتلے سے تالاب سے زیادہ دور نہ تھا جس کو چاروں طرف سے گھیرے خودرو پودوں نے گھیرا ہوا تھا۔

نیل فیکٹری میں کام کرنے والے لوگوں میں سے کسی کے پاس بھی وقت نہیں ہوتا تھا؛ اس کے علاوہ، وہ کسی پڑھے لکھے شخص کے لیے بمشکل ہی اچھے ساتھی ثابت ہوتے تھے اور نہ ہی کلکتہ کا کوئی بندہ دوسرے لوگوں سے میل جول میں ماہر تھا۔ اجنبیوں کے درمیان، یا تو وہ مغرور بن جاتا یا آسانی بیمار ہو جاتا۔ کسی بھی حال میں، پوسٹ ماسٹر کی کچھ تھوڑی بہت جان پہچان تھی اور زیادہ کا وہ شوقین بھی نہ تھا۔ کبھی کبھار وہ اکا دکا اشعار لکھنے کی مشق کرنے کی کوشش بھی کرتا رہتا۔ کہ پتوں کی سرسراہٹ اور آسمان پر بادلوں کی بہتات اس کی زندگی میں خوشی بھرنے کے لیے کافی تھے۔ ایسے ہی کچھ احساسات تھے جن کو وہ ہمیشہ اظہار دینا چاہتا تھا۔ لیکن خدا جانتا ہے کہ بھلے مانس انسان نے اس سب کو بھی ایک نئی زندگی کے تحفے کے طور پہ لیا ہوگا، اگر لیلی مجنوں کی کہانی کے کسی جن کی طرح وہ ان تمام درختوں پہ چڑھ جائے گا، ان تمام پتوں پہ اور سب کچھ پہ اور ان سب کو کنکروں والی پکی سڑک میں تبدیل کر دے گا اور ان بادلوں کو اونچے گھروں کی قطاروں کے نظارے سے چھپا دے گا۔

پوسٹ ماسٹر کی تنخواہ بہت کم تھی۔ اس کو اپنا کھانا خود بنانا پڑتا تھا جو وہ گاؤں کی ایک یتیم لڑکی رتن کے ساتھ مل کے کھاتا تھا جو اس کے چھوٹے موٹے کام کر دیا کرتی تھی۔ جب شام کو، گاؤں سے گائے کے اُپلوں کا لچھے دار دھواں ابھرتا اور ہر جھاڑی سے جھینگر شور مچاتے؛ جب باؤل کے فرقے کے بھکاری اپنی روزمرہ کی جگہ پہ اونچی اونچی چیختی آواز میں گانے گاتے، جب کوئی شاعر، جو بانس کے گھرے جنگل جھاڑیوں میں پتوں کی سکنات کو دیکھنے کی کوشش کرتا، تو وہ ضرور اپنی پیٹھ پہ ایک عجیب سی سنسنی دوڑتی محسوس کرتا، پوسٹ

ماسٹر اپنا چھوٹا سا لیمپ جلاتا اور رتن کو بُلاتا۔ رتن باہر بیٹھی اس پکار کا انتظار کر رہی ہوتی، اور فوراً آنے کے بجائے، وہیں سے جواب دیتی: "جناب کیا آپ نے مجھے بلایا ہے؟"

"کیا کر رہی ہو تم؟" پوسٹ ماسٹر اس سے پوچھتا۔

"میں کچن میں آگ جلانے جا رہی تھی۔" یہی جواب ہوتا۔ اور پھر پوسٹ ماسٹر کہتا: "او، کچھ دیر کے لیے کچن کی آگ کو رہنے دو؛ پہلے میرا حقہ جلا دو۔"

آخر کار رتن پھُولے ہوئے گالوں کے ساتھ تمباکو کو جلانے کے لیے ایک جلتے ہوئے کوئلے کے شعلے کو پھونکیں مارتے ہوئے اندر داخل ہوتی۔ یہ چیز پوسٹ ماسٹر کو کوئی نہ کوئی بات چھیڑنے کا موقع فراہم کر دیتی۔

"اچھا رتن" شاید وہ دوبارہ شروع ہوتا، "کیا تمھیں اپنی ماں کے بارے میں کچھ یاد ہے؟" یہ بہت ہی سرسبز موضوع ہوتا۔ رتن کو کچھ تھوڑا بہت یاد تھا اور بہت کچھ وہ بھول چکی تھی۔ اس کا باپ اس کو اس کی ماں سے زیادہ پیار کرتا تھا؛ کچھ واضح طور پر اس کو صرف اتنا یاد تھا۔ وہ اپنے کام کے بعد، شام کو واپس گھر آتا تھا، وہ ایک یا دو راتیں واضح طور پر باہر گذارتا تھا، اس طرح کی کچھ تصویریں اس کی یاد میں تھیں۔ رتن پوسٹ ماسٹر کے قدموں کے قریب نیچے زمین پہ بیٹھ جاتی جیسے کہ یادوں نے اس پر یلغار کر دی ہو۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کے بارے میں بھی بتایا جو ابھی تک اسکی یادوں میں تھا۔ اور کیسے کسی بارش والے دن، وہ اس کے ساتھ تالاب کے کنارے پر مچھلیاں پکڑنے گئی تھی اور اس مقصد کے لیے انھوں نے ایک شاخ کو مچھلی پکڑنے والے راڈ کے طور پر استعمال کیا تھا۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں اس کے دماغ سے بڑی بڑی باتیں نکال کر لے آتیں۔ اس لیے، جب تک وہ بولتے رہتے، اکثر اوقات ان کو بہت دیر ہو جاتی اور پوسٹ ماسٹر بہرصورت کھانا پکانے میں سستی محسوس کرتا۔ رتن پھر جلدی جلدی آگ جلاتی اور کچھ بغیر خمیر کے روٹیاں بنا دیتی، صبح کے کھانے سے بچی ہوئی یہ ٹھنڈی روٹیاں، ان کے شام کے کھانے کے لیے کافی ہوتیں۔

کچھ شاموں کو، وہ اس بڑے خالی چھپر کے کونے میں پڑے اپنے ڈیسک پر بیٹھ کر گزارتا، پوسٹ ماسٹر کو بھی اپنے گھر کی یادیں گھیر لیتیں، اپنی ماں کی اور اپنی بہن کی اور ان تمام لوگوں کی جن سے وہ جدا تھا، جن کے لیے اس کا دل اداس تھا۔ یادیں جو ہمیشہ اس کو ڈستی رہتی تھیں لیکن جن کے بارے میں وہ فیکٹری کے ملازمین سے بھی بات نہیں کر سکتا تھا۔ اگرچہ اس سادہ اور چھوٹی لڑکی کی موجودگی میں وہ قدرتی طور پہ ان کو اونچی آواز میں یاد کرتا۔ اور پھر ایسا ہوتا کہ وہ لڑکی اس کو ان لوگوں، جیسے کہ ماں، بھائی اور بہن کی جگہ بہلاتی جیسا کہ وہ ان تمام لوگوں کو ساری زندگی سے جانتی ہو۔ درحقیقت، اس نے اس کے چھوٹے سے دل میں، ان سب کی ایک مکمل تصویر بنا دی تھی۔

ایک دوپہر کو، برسات میں وقفے کے دوران، ٹھنڈی ٹھنڈی بھیگی ہوا چل رہی تھی؛ تیز سورج میں گیلے پتوں اور گھاس کی بُو ایسے محسوس ہوتی جیسے کسی کے جسم پر تھکی ہوئی زمین گرم سانس لے رہی ہو۔ ایک حواس باختہ پرندہ تمام دوپہر کو قدرت کے سامعین کے کمرے میں اپنے بوجھوں کی ایک شکایت کو بار بار دہرا رہا تھا۔

پوسٹ ماسٹر نے کچھ بھی نہیں کرنا تھا۔ تازہ تازہ دھلے ہوئے پتوں کی چمک اور چھٹتے ہوئے بادلوں کے جمع کیے ہوئے باقیات ہی صرف دیکھنے والے نظارے تھے؛ اور پوسٹ ماسٹر انھی کو دیکھتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا: ''اوہو، اگر کوئی مہربان روح قریب ہوتی۔۔۔ صرف ایک محبت کرنے والا انسان جسے میں اپنے دل کے قریب رکھ سکتا!'' یہ بالکل ویسے ہی تھا جو کچھ بھی وہ سوچتا چلا گیا، جو ک وہ پرندہ کہنے کی کوشش کر رہا تھا اور یہ بالکل ایسے ہی احساسات تھے جو کھسر پھسر کرتے پتے اظہار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن کوئی نہیں جانتا ہے اور یقین کرتا ک اس طرح کا خیال کسی کم تنخواہ لینے والے گاؤں کے کسی پوسٹ ماسٹر کے دماغ میں، گہرے اور خاموش آدھے دن کو اس کے کام کے وقفے کے دوران جنم لے سکتا ہے۔

پوسٹ ماسٹر نے آہ بھری اور رتن کو بلایا۔ رتن اس وقت امرود کے درخت کے نیچے ستا رہی تھی اور کچے امرود کھانے میں مگن تھی۔ اپنے مالک کی آواز سن کر، وہ سانس لیے بغیر دوڑتی آئی، یہ کہتے ہوئے: ''دادا، کیا تم مجھے بلا رہے تھے؟''

''میں سوچ رہا تھا'' پوسٹ ماسٹر نے کہا، '' ک میں تمھیں پڑھنا سیکھاؤں۔'' اور پھر باقی سارا دوپہر، وہ اسے حروف تہجی پڑھاتا رہا۔

پس، بہت ہی کم عرصے میں، رتن بہت کچھ پڑھنا جان گئی تھی۔ ایسا دکھائی دیتا ک اگرچہ اس سال کی موسم برسات کبھی بھی ختم نہیں ہوگی۔ نہریں، کھائیاں اور گڑھے پانی سے بھر کر سیلاب کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ صبح شام بارش کی تیز بوچھاڑ اور مینڈکوں کی ٹراہٹ سنائی دیتی۔ گاؤں کی سڑکیں گزرنے کے قابل نہیں رہی تھیں اور سارا کاروبار کشتیوں کے ذریعے کیا جا رہا تھا۔

ایک بہت ہی ابر آلود صبح کو، پوسٹ ماسٹر کی ننھی طالبہ دروازے کے باہر اس کی پکار کا خاصی دیر انتظار کرتی رہی لیکن وہ اسے آج حسب معمول سنائی نہ دی۔ اس نے اپنی مڑی ہوئی صفحات والی کتاب اٹھائی اور دھیرے دھیرے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے دیکھا ک اس کا استاد اپنے بستر پر سو رہا تھا اور یہ سوچ کر ک وہ آرام کر رہا ہے، وہ دبے پاؤں واپس پلٹنے لگی ک اچانک اس نے اپنا نام سنا۔ ''رتن'' وہ یک لخت واپس مڑی اور پوچھا: ''دادا، کیا آپ سو رہے تھے؟'' پوسٹ ماسٹر نے افسردہ آواز میں کہا: ''میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ میرے سر پہ ہاتھ رکھو؛ کیا یہ بہت گرم ہے؟''

اس کی جلاوطنی کی اس تنہائی میں اور برساتوں کی اس غمگینی میں، اس کے بیمار جسم کو تھوڑی تیارداری کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنے ماتھے پر ان نرم ہاتھوں کے لمس کو یاد رکھنے کی خواہش کی جن میں جھنجھناتے کنگن تھے، اسے ایک عورت کی محبت بھری موجودگی کا خیال آیا اور اپنی ماں یا بہن کی قربت کا احساس عود آیا اور جلاوطنی مایوس کن نہ رہی۔ رتن ایک چھوٹی سی لڑکی تھی۔ فوراً ہی وہ ماں کے درجے کو پہنچ گئی، گاؤں کے ڈاکٹر کو بلایا، مریض کو اس کے مقررہ وقت پہ دوائیں دیں، ساری رات اس کے سرہانے بیٹھی رہی، اس کے لیے دلیا بنایا اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پوچھتی رہی: ’’دادا، کیا تم ٹھیک ہوناں؟‘‘

کچھ دنوں بعد، پوسٹ ماسٹر اپنے کمزور جسم کے ساتھ، بیماری کا بستر چھوڑنے کے قابل ہو گیا تھا۔

’’بہت ہو گئی بس۔۔۔‘‘ اس نے خود کو فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ’’مجھے اپنی تبدیلی کروانی چاہیے۔‘‘ اس نے فوراً ہی کلکتہ تبدیلی کے لیے ایک درخواست لکھی کہ اس جگہ پر صحت کے مسائل ہونے کی وجہ سے اس کا فوری تبادلہ کیا جائے۔

بطور نرس اپنے فرائض سے سبکدوش ہونے کے بعد، رتن نے دروازے کے باہر دوبارہ اپنی پرانی جگہ سنبھال لی تھی۔ لیکن اب اسے دوبارہ وہ پہلے والی پکار کبھی نہ آئی۔ کبھی کبھار وہ چوری چھپے اندر جھانک لیتی تو پوسٹ ماسٹر یا کرسی پہ بیٹھا ہوتا، بستر پہ سویا ہوتا یا غائب دماغی کے ساتھ ہواؤں میں گھور رہا ہوتا۔ جب رتن پوسٹ ماسٹر کی پکار کا انتظار کر رہی تھی، وہ خود اپنی درخواست کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ لڑکی نے اپنے سارے پرانے سبق دھرا دھرا کے رٹ لیے تھے، اس کا خوف اب کافی حد تک کم ہو چکا تھا کہ جب پکار آئے تو اس کو اپنا سارا سبق آتا ہو۔ آخرکار ایک ہفتے بعد، ایک شام کو اس کی پکار کی آواز آئی۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ، رتن کمرے کی جانب لپکی:

’’دادا، کیا تم نے مجھے بلایا تھا؟‘‘

’’رتن، میں کل جا رہا ہوں۔‘‘ پوسٹ ماسٹر نے جواب دیا۔

’’دادا، تم کہاں جا رہے ہو؟‘‘

’’میں گھر جا رہا ہوں۔‘‘

’’تم کب واپس آؤ گے؟‘‘

’’میں نے دوبارہ کبھی بھی واپس نہیں آنا۔‘‘

رتن نے دوبارہ کوئی سوال نہیں پوچھا۔ پوسٹ ماسٹر، اپنی ہی دھن میں اسے بتاتا چلا گیا کہ اس کی تبدیلی کی درخواست مسترد کر دی گئی ہے، اس لیے اس نے اپنی نوکری سے استعفیٰ دے دیا ہے اور واپس گھر جا رہا ہے۔ خاصی دیر ان دونوں میں سے کوئی بھی ایک لفظ نہ بولا۔ لیمپ دھیما دھیما جلتا رہا اور چھپر کی چھت کے

ایک کونے میں سوراخ سے ٹپکتا پانی تیزی سے اس کے نیچے فرش پر پڑے مٹی کے پیالے میں گرتا رہا۔

کچھ دیر کے بعد، رتن اٹھی اور کھانا تیار کرنے کے لیے کچن کی جانب چلی گئی; لیکن دوسرے دنوں کی طرح، اس کے ہاتھ اتنی تیزی سے کام نہیں کر رہے تھے۔ بہت سی سوچنے والی نئی چیزیں، اس کے چھوٹے سے دماغ میں گھس گئی تھیں۔ جب پوسٹ ماسٹر نے اپنا شام کا کھانا ختم کیا تو لڑکی نے اچانک اس سے پوچھا: ''دادا، کیا تم مجھے اپنے گھر لے جاؤ گے؟''

پوسٹ ماسٹر ہنسا اور کہا، ''کیا بات ہے۔۔۔!!!'' لیکن اس نے لڑکی پر یہ واضح کرنا ضروری نہ سمجھا کہ اس بات میں بے وقوفی کی کیا بات ہے؟ ساری رات، چاہے اس کے جاگتے یا سوتے، پوسٹ ماسٹر کا ہنستے ہوئے جواب اس کو ڈستا رہا۔ ''کیا بات ہے۔۔۔!!!''

صبح سویرے اٹھنے پر، پوسٹ ماسٹر کو نہانے کے لیے پانی تیار ملا۔ وہ اپنی کلکتہ والی عادت کے مطابق، پانی نکال کے نہانے کا عادی تھا اور باقی گاؤں کی دریا پر نہانے کی رسم کے بجائے اس نے گھڑے رکھے ہوئے تھے۔ کچھ وجوہات کی وجہ سے لڑکی اس سے اس کے جانے کے صحیح وقت کے بارے میں نہ پوچھ سکی، اس لیے سورج ابھرنے سے بہت پہلے ہی دریا سے پانی بھر لائی تھی، تاکہ یہ صبح سویرے جلد از جلد تیار ہو چاہے اسے جب بھی ضرورت ہو۔ نہانے کے بعد، رتن کے لیے پکار آئی۔ وہ بہت خاموشی کے ساتھ اندر داخل ہوئی اور خاموشی سے اپنے اگلے حکم کے لیے اپنے مالک کے چہرے کو دیکھا۔ پوسٹ ماسٹر نے کہا: ''رتن، میرے یہاں جانے سے تمھیں خفا ہونے کی ضرورت نہیں: میں اپنی جگہ آنے والے لوگوں سے بات کروں گا کہ وہ تمہارا خیال رکھیں گے۔'' بے شک، یہ الفاظ مہربانی سے لبریز تھے لیکن عورت کے دل کے راستے بہت پُراسرار ہوتے ہیں!

رتن کئی بار بغیر کسی شکایت کے اپنے مالک کی جھاڑ جھپاڑ برداشت کر چکی تھی لیکن ان مہربان الفاظ کو وہ برداشت نہ کر سکی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی اور کہا: ''نہیں، نہیں، آپ کو میرے بارے میں کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں؛ میں یہاں پر مزید نہیں رہوں گی۔''

پوسٹ ماسٹر ٹھٹکا کے رہ گیا۔ اس نے رتن کو پہلے اس طرح کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نیا افسر عین اسی وقت وہاں پہنچ گیا اور پوسٹ ماسٹر چارج اس کے حوالے کر کے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ جگہ چھوڑنے سے پہلے اس نے رتن کو بلایا اور کہا: ''یہ تمھارے لیے کچھ ہے؛ میں امید کرتا ہوں کہ ان سے تمہارا کچھ وقت اچھا گزر جائے گا۔'' اس نے اپنی جیب سے پورے ایک ماہ کی تنخواہ نکالی، اس میں سے اس نے اپنے سفر کے معمولی سے اخراجات نکال لیے۔ پھر رتن اس کے قدموں میں گر گئی اور چیخی: ''دا،

دادا، میں آپ کے لیے دعا کرتی ہوں، مجھے کچھ بھی مت دو، کسی بھی صورت میرے لیے تکلیف نہ اٹھائیں۔" اور پھر وہ بھاگتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

پوسٹ ماسٹر نے ایک لمبی آہ بھری، قالین کے کپڑے کا بنا اپنا بیگ اٹھایا، چھتری اپنے کندھے پر رکھی۔ اسکے ساتھ ایک آدمی تھا جس نے اس کے کئی رنگ برنگے ٹین کے صندوق اٹھائے ہوئے تھے، وہ آہستہ آہستہ کشتی کی جانب بڑھ رہا تھا۔

جب وہ کشتی میں بیٹھا اور کشتی بارش بھرے دریا میں آہستہ آہستہ دور ہونے لگی، اسے یوں محسوس ہوا کہ یہ زمین کے اندر سے نکلے ہوئے آنسوؤں کی ندی ہو جو خم کھائے ہوئے، آہیں بھرتے ہوئے چکر کاٹ رہی ہو۔ پھر اس کے دل سے درد کی ٹیس اٹھی۔ گاؤں کی لڑکی کا غمگین چہرہ اس کو ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی بڑی بڑی ان کہی باتیں، اس دھرتی ماں کے غم میں سرایت کر گئی ہوں۔ ایک لمحے کے لیے اس کا جی چاہا کہ وہ واپس چلا جائے اور اس اکیلی بھٹکی ہوئی لڑکی کو اپنے ساتھ لے چلے جس کو ساری دنیا نے ٹھکرا دیا ہے۔ لیکن ہوا نے بادبانوں کو بھر دیا تھا اور کشتی تقریبا دریا کے درمیان میں پہنچ چکی تھی اور گاؤں پہلے ہی بہت پیچھے رہ گیا تھا اور صرف اس میں دورافتادہ جلتی ہوئی زمین ہی نظروں میں رہ گئی تھی۔

تاہم تیزی سے بہتے ہوئے دریا کے سینے پر سفر کرنے والے مسافر نے خود کو دنیا میں ہونے والی لاتعداد ملاقاتوں اور جدائیوں کے فلسفیانہ خیالات سے تسلی دی۔ موت، دنیا کی سب سے بڑی جدائی جس سے کوئی بھی واپس نہیں آتا۔

لیکن رتن کی کوئی فلسفی نہیں تھی۔ وہ آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب لیے ڈاکخانے کے اردگرد چکر لگا رہی تھی۔ شاید یہ اس وجہ سے تھا کہ اس کے دل کے کسی کونے میں ابھی تک کوئی امید گھات لگائے بیٹھی تھی کہ اس کا دادا واپس آئے گا اور اس لیے وہ یہ جگہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ہماری احمقانہ انسانی فطرت پر صد افسوس! اس کی بچگانہ غلطیاں بہت پکی ہوتی ہیں۔ وجوہات کی اصطلاحات کو خود ثابت کرنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ اس موقعے پر یقینی ثبوتوں کو بھی جھٹلا دیا جاتا ہے۔ غلط امید اپنی پوری طاقت کے ساتھ اس کے ساتھ چمٹ جاتی ہے، یہاں تک کہ ایک دن آتا ہے جب یہ دل کو چوس کر خشک کر دیتی اور یہ منہ زور ہو کر سارے رشتے اور تعلقات توڑ دیتی ہے اور ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد، جاگنے کی تکلیف شروع ہوتی ہے اور ایک بار پھر، ویسی ہی غلطیوں کی دلدل میں دوبارہ چھلانگ لگانے کی امنگ زندہ ہو جاتی ہے۔

☆☆☆☆

امیر خسرو

فارسی سے ترجمہ: اختر عثمان

بازارِ شوق

وصل کی راگنی تمام ہوئی
ڈھل گیا آفتاب شام ہوئی
غم اُٹھا نے نواز جاگ اُٹھے
لے کے انگڑائی ساز جاگ اُٹھے
تن گیا ہے رُواں رُواں تن کا
کس نے چھیڑا ہے راگ ایمن کا
ارغنوں از کنارِ یار اُٹھا
آنکھیں ملتا ہوا ستار اُٹھا
انگلیاں جم گئی ہیں کالوں پر
آئی سرخی غزل کے گالوں پر
جوں ہی طبلے پہ تازیانہ پڑا
تانپورے کو سر اُٹھانا پڑا
وقت باجے میں کھو کے رُک سا گیا
رُوئے گوہرتاں پہ جھک سا گیا
تھرتھرانے لگی ہے سارنگی
سُر کی سنگت میں چل پڑے سنگی

لَے بلندی کی سمت بڑھتی ہے

سَم کی سیدھی چڑھائی چڑھتی ہے

پھیلتی جا رہی ہے درد کی شاخ

بانسری کے بدن میں ہیں سوراخ

رقص فرما ہیں پائے سیم تناں

بجلیاں ہیں بجائے سیم تناں

طبل آسا کسے ہوئے سینے

خوشبوؤں میں بسے ہوئے سینے

لب ہیں لرزاں پہ جسم بولتے ہیں

کیسے کیسے طلسم بولتے ہیں

ضوفشاں جام خوش کلام بدن

یہ تھرکتے ہوئے تمام بدن

لَو لُٹاتے ہوئے لآلی ہیں

لیکن اندر سے کتنے خالی ہیں

☆☆☆☆

منیر فیاض

تعارف: ٹریسی کے سمتھ

۴۶ سالہ ٹریسی کے سمتھ اس سال مسلسل دوسری مرتبہ امریکہ کی ملک الشعرا منتخب ہوئی ہے۔ یہ انتخاب اس کے گزشتہ سال سے جاری پراجیکٹ کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے کیا گیا ہے جس میں وہ شاعری کو دیہی علاقوں تک پھیلانے کے لیے طویل مدتی منصوبہ بندی کے لیے ان علاقوں کے لوگوں اور تخلیق کاری کے طالب علموں کے ساتھ شاعری کے حوالے سے مختلف نوعیت کے پروگراموں کا انعقاد کر رہی ہے۔

سیاہ فام ٹریسی کی شاعری بجائے خود انسان کی نئی بیداری کی حامل ہے۔ اس کی شاعری کا چوتھا مجموعہ 'پانی میں خرام' اسی سال شائع ہوا ہے۔ اس سے قبل اس کے تین مجموعے 'جسم کا سوال'، 'Duende' (ہسپانوی: روح)' اور 'مریخ پر زندگی' شائع ہو چکے ہیں۔ 'مریخ پر زندگی' کو Pulitzer Prize مل چکا ہے۔ اس کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے ہے جو سیاہ فام چرچ سے گہری وابستگی رکھتا ہے۔ اس کا باپ ہبل دوربین کے انجینئر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔

ٹریسی کا کہنا ہے کہ اس نے سیاہ فامیت کے بارے میں زیادہ نہیں لکھا مگر یہ اس کے تخلیقی تحت الشعور اور زندگی کے تجربے کا حصہ ہے۔

اس کے اپنے الفاظ میں شاعری اس کے لیے 'ناگفتہ کا اظہار' ہے۔

☆☆☆☆

ٹریسی کے سمتھ

انگریزی سے ترجمہ: منیر فیاض

سائی فائی (سائنس فکشن کا مخفف)

کنارے کہیں نہیں ہوں گے، بس خم ہوں گے
واضح خطوط آگے کی طرف اشارے کریں گے
تاریخ، اپنی سخت ریڑھ کی ہڈی اور کتے کے کانوں جیسے
کونوں کے ساتھ تبدیل ہو کر نئی کروٹ لے گی
بالکل جیسے ڈائنوسار نے
برف کے بے شمار ٹیلوں کو راستہ دیا
عورتیں، عورتیں ہی رہیں گی مگر
امتیاز سے خالی ہوں گی، جنس
سب خطرات سے بچ نکلنے کے بعد صرف
ذہن کو شاد کرے گی اور وہیں رہے گی
ہم لائٹیں چلاتے ہوئے اپنے لیے رقص کریں گے
سنہرے قمقموں سے سجے آئینوں کے روبرو
ہم میں سے معمر ترین اس چمک کو شناخت کر لے گا
مگر لفظ 'سورج' مبتدل ہو کر
گھروں اور اسپتالوں میں استعمال ہونے والی
یورینیم کو بے اثر کرنے والی مشین کو مل چکا ہو گا
اور ہاں، ہم بہت طویل العمر ہوں گے،
معروف مردم شماری کا شکریہ، بے وزن، بے توازن
اپنے نئے چاند کے ابدی ادوار میں
ملگجی خلا میں سرکتے رہیں گے

جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے
قابلِ فہم اور محفوظ ہو گی

☆☆☆☆

ایک پرانی کہانی

ہمیں یہ سمجھنے کہ قابل بنایا گیا تھا
کہ یہ بھیانک ہو گا۔ ہر چھوٹی سی ضرورت
ہر چھبتی ہوئی خواہش، ہر نفرت
پھول کر کسی رزمیہ بردار آندھی میں بدل گئی ہے

بچھری ہوئی زمین غصیلے خواب کی طرح
تاراج ہو گئی ہے۔ ہم پر ہماری بدترین صفات قابض ہیں
اور باقی سب کچھ تباہ شدہ حالت میں زمین پر بکھرا پڑا ہے

ایک طویل عمر
گزر گئی۔ جب بالآخر ہمیں یہ علم ہوا کہ ہم میں
سے کتنا کم بچ گیا ہے۔ ہم نے کتنا کم تعمیر
یا مرمت کیا ہے جو بھی کھویا بھی نہیں تھا۔۔۔
کچھ تو ہی ہیکل اور قدیم بیدار ہوا۔ اور پھر ہمارے گیتوں نے
ایک مختلف النوع موسم کو مدعو کر لیا

پھر وہ جانور جن کا ہمیں یقین تھا
کہ مدتیں ہوئیں روپوش ہو چکے تھے
درختوں سے نیچے اتر آئے

ہم ایک دوسرے کی نئی ہیئت دیکھنے لگے
ہم کسی رنگ کی یاد میں رونے لگے

☆☆☆☆

فلورسی عورت

(انڈونیشیا کے دور افتادہ جزیرے فلورس پر صرف ۱۸،۰۰۰ سال قبل کے آٹھ انسانوں کے باقیات ملے ہیں جن کے جسم بونوں کی طرح بہت چھوٹے تھے اور جن کا قد صرف ایک میٹر تھا اور ان کے سروں کا حجم بمشکل چکوترے جتنا تھا۔ یہ حیران کن لوگ اوزار بناتے تھے اور چھوٹے ہاتھیوں کا شکار کرتے تھے اور اسی زمانے میں زندہ تھے جب جدید انسان اس جزیرے کے قریبی علاقوں میں آبادکاری میں مصروف تھا)

روشنی: میں اٹھ کر اپنا مختصر جسم پھیلاتی ہوں
رنگ: خالی آنکھوں کے عقب میں دن کی روشنی
آواز: بھوک کے پرندے حریص چونچوں سے

ان تنوں اور ریچھوں کو نوچتے ہیں
جہاں میرے خوابیدہ اور پیارے رہتے ہیں

میں ہر صبح اسی منظر میں بیدار ہوتی ہوں

راستے کچھ درندوں کے تعاقب میں
ان کی کمین گاہوں تک مراجعت کرتے ہیں

شکار: بھوک کے خلاف رقص
موسیقی: دعوت اور خوف

جزیرہ ہم میں بدل جاتا ہے

درخت ہمارے آسمان کو ڈھک دیتے ہیں
سرشاری جیسی سبز آواز میں
ان کی سرسراہٹ بلند ہوتی ہے

رینگنے والے جانور
اپنی دُموں سے رات کو کھینچ لاتے ہیں
اندھیرے میں رہتے ہیں
لہروں کا جوش افق کو بچاتا ہے
جسے ہم ہڑپ کر جائیں گے

میں ایک دن ان میں غوطہ لگا کر
سرکتی رہوں گی

بازو اور ٹانگیں خوف میں جکڑے ہوئے ہیں
میں ہمیشہ کے لیے زندہ رہنا چاہتی ہوں
ایک تاریک ستارے کی طرح

☆☆☆☆

ریاست ہائے متحدہ امریکہ تمھارا استقبال کرتی ہے

تمھیں کس کے اختیار سے اور کیوں بھیجا گیا؟
تم یہاں کون سی چیز چرانا چاہتے ہو؟
یہ رقص کیوں ہے؟ تمھارے تاریک جسم
روشنی کیوں پی جاتے ہیں؟ تمھاری طلب
جو تمھیں محسوس ہو رہی ہے، کیا ہے؟ کیا تم نے کچھ چرایا ہے؟ پھر

تمھارے سینے میں یہ کیا دھڑک رہا ہے؟
تمھارے مشن کی نوعیت کیا ہے؟ کیا تم
اقبالِ جرم کرنا چاہتے ہو؟ کیا تمھارا ان دوسرے لوگوں سے
کوئی تعلق ہے جو ہمیں نقصان پہنچانا چاہتے ہیں؟ پھر
تم خوف زدہ کیوں ہو؟ اور تم ہماری رات میں
ہاتھ بلند کیے ہوئے، آنکھیں پوری طرح کھولے ہوئے
کسی بدروح جیسی خاموشی کے ساتھ کیوں داخل ہوئے ہو؟
کیا کوئی ایسا جرم ہے جسے تم قبول کرنا چاہتے ہو؟
کیا یہ کوئی معمہ نما امتحان ہے؟ اگر ہم ناکام ہو گئے
تو کیا ہوگا؟ ہم اپنی اپیل کیسے اور کس کے نام لکھیں گے؟

☆☆☆☆

امرتا پریتم
پنجابی سے ترجمہ: اختر رضا سلیمی

رب خیر کرے

رب خیر کرے مرے آنگن کی
رانجھے کے ڈیرے سے آج
کھیڑے کی آوازیں آئیں
رب خیر کرے----

پوچھ رہی ہیں دیواریں
آج اس "ملکی" کے گھر سے
کس نے چرائیں دودھ کی بوندیں
رب خیر کرے-----

بھینسوں میں بے چینی سی ہے
صبح سویرے دوہنی میں
کس نے خون کی دھاریں دوہیں
رب خیر کرے-----

چیخ رہا ہے ہر اک بستہ
میرے مدرسے سے کس نے
سچائی کے حرف چرائے
رب خیر کرے---

امرتا پریتم
پنجابی سے ترجمہ: اختر رضا سلیمی

پانچواں چراغ

وضو کروں گی نا ہی سجدہ
نا ہی منت مانگنے آئی
چار چراغ ازل سے روشن
میں اک اور جلانے آئی

دِل گھانی سے تیل نکالا
پیشانی کو طاق بنایا
دُکھ کا دیپ جلایا
چار چراغ ازل سے روشن
میں اک اور جلانے آئی

یاد کے نتھرے پانی سے
دِل نہلایا
جان ہتھیلی پر رکھی اور
تن من کو سلگایا
چار چراغ ازل سے روشن

میں اِک اور جلانے رکی
میری قسمت میں بُت آیا
لیکن ساتھ نبھایا
دل نے شور مچایا
چار چراغ ازل سے روشن
میں اِک اور جلانے آئی

☆☆☆☆

وہ لفظ اس نے سنا میں نے جو کہا نہیں تھا

(پاکستانی زبانی سے تراجم)

منیر مومن

بلوچی سے ترجمہ: واحد بخش بزدار

رومال

میں نے بہت کوشش کی کہ اُس کے جنازے کو کاندھا دوں، لیکن ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ میں ان کی میت کو کاندھا نہ دے سکا۔ وہ بہت مشہور شخص تھا اور لوگوں میں پُرفکر اور پُرمغز گفتگو کے حوالے سے جانا جاتا تھا۔ آج اس کی میت کو لے جانے اور جنازہ پڑھنے تک لوگ اس کی ایمان داری اور خوبیوں کا ذکر کر رہے تھے۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ اُس نے میرے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ تم لوگ نہیں جانتے کہ یہ شخص بے ایمانیوں کی ایک کھلی کتاب تھی، وگرنہ تم لوگ بہت سی ایسی چیزوں کے بارے میں بھی نہیں جانتے، جن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔ مگر میں کہ تمھارے سامنے ہوں، لیکن تم مجھے نہیں جانتے، کیوں کہ اس صاحبِ ایمان نے اپنی کسی کہانی کی شہ سرخیوں میں میرا نام نہیں لکھا۔

لوگ کہتے ہیں کہ یہ صاحب بڑے کہانی کار تھے اور انھوں نے اپنا جو بھی کردار تخلیق کیا، اسے زندہ و جاوید بنا دیا، مگر اس میں آپ کا قصور نہیں ہے، کیوں کہ مجھ سے آپ کی شناسائی نہ ہو سکی۔ میں نے اُسے اپنی ہر کہانی میں تحریر کیا اور ہر جگہ اسے مطعون کیا۔

میں ایک دفعہ ہوٹل میں چائے پی رہا تھا تو میں نے اُسے دیکھ کر پہچان لیا لیکن وہ مجھے نہ پہچان سکا۔ وہ اکیلا تھا۔ میں نے چاہا کہ اُس کی تنہائی میں مداخلت نہ کروں مگر چند ثانیے بعد میں نے دیکھا کہ اُس کی تنہائی میں ایک مکھی مخل ہوئی اور چائے کے قطرے اس کے دامن پر گرے۔ میں نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اُسے تھما دیا کہ وہ چائے کے دھبے صاف کرے۔ اُس نے چائے کے دھبے صاف کر کے رومال اپنی جیب میں ٹھونس لیا۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ جناب تم مجھے جانتے ہو، اس نے کہا نہیں۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں اُن کا ایک کردار ہوں اور میرا نام گُل محمد ہے۔ کچھ سوچنے کے بعد اُس نے کہا لگتا ہے کہ میں نے اب تک تجھے تحریر نہیں کیا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اُس نے کہا ٹھیک ہے اب میں زینب کے بارے میں لکھنے کا سوچ رہا ہوں۔ کچھ توقف کے بعد کہنے لگا، زینب کو میں نے کل دیکھا تھا اور اس کی مسکراہٹ میں، میں نے اپنی کہانی

تلاش کرلی تھی۔ وہ نہایت ہی زخم خوردہ تھی، اور اگر میں بہت جلد اس کی کہانی کو تحریر نہ کروں تو ہو سکتا ہے کہ وہ مرجائے اور اس کی مسکراہٹ متاثر ہو جائے۔

میں نے عرض کیا کہ جناب ایک زینب کی کہانی تو تم نے بہت پہلے لکھی تھی، وہی زینب کہ جس کی پیاس نے اپنے پیر دریا میں جھونک دیے تھے۔ نہیں، وہ کوئی اور تھی، اُس کے آنسوؤں نے میرا سکون غارت کردیا تھا اور وہ کہانی میں نے اپنی مرضی سے نہیں بلکہ خوف زدہ ہو کر تحریر کی تھی۔

دورانِ گفتگو میں نے اسے یاد دلایا کہ میرا رومال اُس کی جیب میں ہے تو کہانی کار نے کہا کہ تمھارا کا رومال میری جیب میں رہے تا کہ میں تجھے لکھنا نہ بھول پاؤں۔

دوسری بار میں نے اپنے کہانی کار کو پورے پانچ سال بعد دیکھا تھا۔ بہت سے تخلیق کار اور قلم کار اُس کے اردگرد جمع تھے۔ وہ بول رہا تھا جب کہ دوسرے ہمہ تن گوش تھے۔ میں بھی اُن کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ کسی ایک نے اُن سے دریافت کیا: حضور! آپ کہانی کا آغاز کہاں سے اور کیوں کر کرتے ہیں۔ اُس نے جواب میں کہا کہ میں وہیں سے کہانی کا آغاز کرتا ہوں، جہاں پر کہانی کا اختتام ہوتا ہے۔

پھر اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑی اور کچھ توقف کے بعد اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے اُس نے کہا: میرے کردار مجھ سے خفا ہیں کہ میں انھیں تحریر نہیں کر رہا ہوں، لیکن انھیں خبر ہی نہیں ہے کہ میں نے کہاں کہاں انھیں تحریر کیا ہے۔ لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ صرف کتابوں میں لکھی ہوئی کہانیاں پڑھتے ہیں۔ ہواؤں کے سرہانے کتنے مقبرے ہیں کہ جہاں ہم نے اپنے زندہ کردار بٹھا رکھے ہیں۔ کتنی کہانیاں، سوئی سے قمیصوں کے گریبانوں اور رومال کے کناروں پر کشیدہ کی گئی ہیں۔ ہواؤں اور پانیوں نے انھیں پڑھ رکھا ہے، حتیٰ کہ ان کے نقوش بھی اب دھندلا گئے ہیں، مگر لوگ ہیں کہ انھیں خبر ہی نہیں ہے۔

بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے، اُس نے ایک نوجوان کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا: وہ مرغ جو تمھاری آنکھوں میں محوِ پرواز ہے، وہ بھی میرا ایک کردار ہے۔ وہ خواب جس کے لیے تو نے اپنی راتوں کی نیندیں حرام کی تھیں، کل رات اپنی کہانی سنانے کی خاطر میرے یہاں آیا تھا مگر میں نے اپنے دیے کی لَو کو اونچا رکھا۔ بھلا ایک اکیلا کہانی کار کس کس کی دل آزاری کرے اور کتنوں کو خوش رکھے۔

کچھ دیر کے لیے اپنی گفتگو کو معطل کرتے ہوئے اُس نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور پسینہ پونچھ لیا۔ اُسی دن سے میں اپنے وجود اور اپنے کہانی کار ہر دونوں سے فراموش ہو گیا تھا مگر آج اچانک جب مجھے

اس کے مرنے کی خبر ملی تو میں قبرستان کی طرف روانہ ہوا۔ لوگوں کا جمِ غفیر تھا۔ تمام لوگ افسردہ اور مضمحل تھے۔ لوگوں کی باتوں اور آنسوؤں کے درمیان فقط مرحوم کے کفن کا سوراخ نمایاں تھا۔

مرحوم کے کفن دفن کے بعد تمام لوگ واپس آ گئے تھے، صرف مرحوم کا بیٹا اُس کی قبر کے سرہانے بیٹھا ہوا تھا اور میں اُس سے چار قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ مرحوم کا بیٹا جیب سے رومال نکال کر آنسوؤں کو پونچھنے لگا تو میں اور بھی قریب ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ رومال کے کنارے پر سیاہ دھاگوں سے زینب کا نام کاڑھا ہوا تھا۔ میں پیچھے مُڑا۔۔۔ اس سے زیادہ بے ایمانی۔۔۔ منافقت۔۔۔ بخیلی اور کیا ہو سکتی ہے۔

☆☆☆☆

قاسم فراز

بلوچی سے ترجمہ: واحد بخش بزدار

ہجرت

ہم جنگلوں کے ہم سفر ہوئے
بستیوں کی پُر پیچ گلیاں
ماچس کی ڈبیا کے مانند
پھیلے ہوئے راستے
ہم نے کسی پرانے اخبار میں لپیٹ کر
دُور اُچھال دیے
ساحل ہم نے اَٹ دیے
یہ آسماں
یہ زرد نقطہ و لکیر
ہمارے تھے اور نہ ہی ہمارے بعد باقی رہیں گے
ہجرتوں کے ان لمحوں میں
جو ہمارے شریکِ سفر ہوں
یا جو شریکِ سفر نہ ہوں
پھر جب ہم
جنگلوں کو آگ لگا دیں گے
کسی کشتی میں سوار ہو جائیں گے

پشتو تخلیق و ترجمہ۔ محمد ارشد سلیم

زندگی کڑی دھوپ ہے

لوحِ جہاں پہ میرا نام لکھا جا چکا تھا۔

روزِ ازل کے قول قرار کے بعد زمین پر میرا پھینکا جانا ناگزیر تھا۔

وہ میرا جنم دن تھا۔

ماں بے نہایت کمزور اور بے آرام تھی۔ سرتا پا درد سے نڈھال تھی اور زمین پر بچھی پھٹی پرانی چٹائی پر وہ دردِ زہ کی شدت سے بے حال کراہ رہی تھی۔ بات دلبر وماسی کے بس سے باہر تھی۔

جس گھر میں غربت نے مستقل ڈیرا ڈالا ہو۔۔۔ اچھی خوراک کا ہفتوں اور مہینوں کوئی اتا پتا نہ ہو۔۔۔ دکھوں کی برسات ہو اور صبح سے شام تک گھر کے کام کاج ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتے ہوں۔ ایسے گھر میں بیماری کسی کو گلے لگا لے تو آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس بندے کی کیا حالت ہوگی اور اگر مریض ''بندی'' ہو اور بیماری بھی بال بچے والی ہو۔

دادا، فضل ربانی مُلا سے دم کیا ہوا پانی بھی لے آئے۔۔۔ دادی کو دلبر وماسی سے زیادہ تجربہ کار فیروزہ بوا کا خیال آیا تو اپنی بوسیدہ ہڈیوں کا بوجھ اُٹھائے جھٹ اسے بلانے چل پڑی۔ فیروزہ بوا نے آتے ہی دلبر وماسی کو مزید مالش سے منع کر دیا؛ گرم دودھ میں دیسی گھی کے ساتھ اجوینی ملا کر دی لیکن درد سے آرام گویا حرام تھا۔

ہمارے گھروندے کی دیواریں برائے نام تھیں۔ اُن دنوں آبادی زیادہ نہیں تھی۔۔۔ محلے کے گھروں کے بیچ فاصلے زیادہ تھے لیکن پھر بھی درد میں لپٹی یہ آواز خرکاروں، کمہاروں اور بھٹیاروں کے کچے مکانات اور جھونپڑیوں میں بازگشت کی صورت میں سُنائی دے رہی تھی۔ مرد مُرغ بانگ سے بھی پہلے کام کے لیے نکل چکے تھے۔ بچے ابھی سیپارے کے درس سے نہیں لوٹے تھے۔ کشمالہ چاچی گائے دوہنے کی تیاریوں میں منہمک تھی، کنوئیں کے تازہ پانی سے اس کے تھنوں کو بھگو کر وہ بسم اللہ کر چکی تھی۔ دُودھ کی دھار ابتدائی مرحلے میں ''تھرک دھک'' کے ردھم کے ساتھ بالٹی کی تہہ کو چُھو رہی تھی ___ عین اسی وقت ماں کی چیخ آسمان کی بلندیوں سے ہم کلام ہوئی:

”ہائے ربّا۔۔۔ میں مرگئی ماں۔“ ماں نے دردبھری ساعتوں میں اپنی مری ہوئی ماں تک آواز پہنچائی۔

کشمالہ چاچی دوڑتی ہوئی آ پہنچی تھی۔ اُس نے ماں کی حالت دیکھ کر سب کی خُوب خبر لی۔ چارپائی پر توشک بچھایا۔ ”مرے تیرے دُشمن۔۔۔ میں صدقے میں واری۔“

پو پھٹنے سے قبل میرے رونے کی آواز کے ساتھ ہی میرے باپ اور میرے دادا کی جان میں جان آئی۔ ”اللہ اکبر۔۔۔ اللہ اکبر“ دادا نے اپنا منہ میرے کانوں سے لگالیا تھا۔

اپنے روزِ پیدائش کا یہ قصہ میں اپنی پڑوسن کشمالہ چاچی، باپ اور دلبرو ماسی سے معمولی ردّوبدل کے ساتھ بارہا سُن چکا ہوں۔ کشمالہ چاچی اکثر کہا کرتی: ”تیری پیدائش تو تیری ماں کے لیے موت کا سامان تھی۔ اُس دن چارپائی سے جاگی تو پھر کسی نے غمی خوشی اور دُکھ سُکھ میں اسے نہیں دیکھا۔ تجھے تو ڈیڑھ مہینے تک دودھ بھی تیری خالہ پلاتی رہی تھی۔ ماں تیری تو نہ زندوں میں تھی نہ مُردوں میں، تو مسلسل روئے چلا جا رہا تھا۔ اسی لیے تو تیری خالہ نے جھٹ تجھے اپنی چھاتی کے آگے ڈال دیا۔“

مجھے باور ہے کہ اس محلے کے لوگوں نے میری پیدائش کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا ہوگا۔ نہ کسی نے بے تحاشا خوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہوائی فائرنگ کی ہوگی۔ باپ، عقیقے کا خیال بھی دل میں لانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ گُلی ترکھان کے ہاں پوتے کی پیدائش کی خوشی میں گلی محلے کے لوگوں نے نہ تو میلاد کا اہتمام کیا اور نہ ہی کسی کے دِل میں ڈومنیوں یا ہیجڑوں کو بُلانے کی تمنا جاگ اُٹھی۔

میرے باپ کی یہ بات میرے دِل پر کندہ ہے: ”ہماری اس خوشی میں دو گھرانے۔۔۔ شمرا اور شفقت اللہ خان کے اہلِ خانہ ہی پیش پیش تھے، انھوں نے ہی پورے گاؤں میں شیرینی بھی بانٹی تھی۔“

میرے دادا کی شخصیت بارُعب تھی۔۔۔ ملنگ خان کے قافلے کا ساتھی اور خُدائی خدمت گار تھا لیکن ترکھان تھا۔ خُدائی خدمت گاری زندگی کا مقصد اور ترکھانی کسب تھا۔

میرا باپ ترکھان نہیں تھا۔ وہ گناہ گار تھا تو بس اِتنا کہ ایک ترکھان کے گھر میں جنما تھا۔ اس کا ترکھان باپ خدا کی مخلوق کی خدمت میں مست تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے ”ترے“ کو بھی اس گناہ کی لذت سے رُوشناس کرایا اور دسویں تک تعلیم دِلائی، یہی اُس کے بس میں تھا اور بس اِتنا ہی۔

باپ نے جس زمانے میں آنکھ کھولی تھی، وہ برطانوی استعمار اور اس استعمار کے خلاف سرگرم تحریکوں کا دور تھا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد اقوامِ عالم دوسری جنگ کے خطرے سے دوچار تھے۔ دُنیا کے کئی خِطّے اور ممالک قحط اور مہنگائی کی زد میں تھے۔ بارُود کے سوداگروں اور سرمائے کے کالے ناگ نے لاکھوں

انسانوں کی لاشوں پر رقص کیا۔ ان خون ریز جنگوں کی کالی بارش رُکنے کے دو سال بعد، ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ ہی انسان کئی خانوں میں بٹ کر فسادات کی نذر ہوئے۔ میرے باپ نے ان دنگوں اور جنگوں کے واقعات اپنے باپ سے سُنے تھے لیکن وہ انگریز کی رُخصتی کے ایک برس بعد بابڑہ کے میدان میں نہتے خُدائی خِدمت گاروں پر اندھا دُھند برستی گولیوں کے شور اور مظلوموں کی آہ و بکا اور چیخ و پکار سے تا دمِ مرگ پیچھا نہیں چھڑا سکے تھے۔

وہ گارے مٹی کا کام کرتے تھے۔۔۔ اسی ہنر اور کسب میں وہ یکتا تھے۔ آس پاس کے دیہات کے لوگوں کے لیے گارے سے گھر اور اپنے لیے ہر وہ چیز بناتے، جو شبیہ وہ مٹی کے اندر یا تخیل کی آنکھ سے دیکھ لیتے۔ وہ اور اس کے بعض ساتھی عدم تشدد سے ضمنی اختلاف رکھنے والے ملنگ خان کے بڑے بیٹے کی صف میں شامل تھے۔ انھوں نے کشکول خان کے ساتھ ہم آواز ہو کر اپنی چیخ کابل تک پہنچائی تھی اور بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کو گجروں پر محمول کیا تھا۔

ماں بیماری اور بے آرامی نے چھین رکھی تھی اور باپ نے اپنے ارمانوں اور آرزوؤں کی سُرخ ڈولی کے خواب میں خود کو گُم کر رکھا تھا۔ پیٹ بھر کر روٹی کبھی کبھار ہی نصیب ہوتی۔ ویسے تو میں اپنے ماں باپ، دادی، دادا، خالہ، ماموؤں اور ہر کسی کا زڑ گے☆ تھا لیکن میرے دِل کے درد سے کوئی آشنا نہ تھا۔ ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی بن ماں، باپ کا بچہ تھا۔ ماں کے دودھ اور اچھی خوراک کی چاہ کے بدلے چائے سے میری بھوک کا گلا گھونٹ دیا جاتا۔

ماں کی گود سُونی ہی رہتی۔ اُسے اپنے متعلق کسی خطرناک بیماری کا وہم تھا اور اسی دھڑکے اور خدشے کی وجہ سے وہ خود کو مجھ سے یا مجھے خود سے دُور ہی رکھتی۔ باپ کے ہاتھ کے تکیے کے لیے بھی روتا رہا ہوں۔۔۔ سر چارپائی کے بازو پر پڑا رہتا۔۔۔ اُوپر آسمان کو تکے جاتا اور ایک ہی جگہ پر جمع اِتنے سارے ستاروں کے خاندان پر رشک کرتا۔

میرا نانا ملّاح تھا۔ موچی تارے اعلیٰ اور عمدہ جال بنانے کا ماہر بھی تھا۔ نانا کے ہاتھ کے بنے جال جو بھی مچھی مار، یا مچھلیوں کا شکاری اور یا شوقین ماہی گیر دریا میں پھینکتا، وہ کبھی خالی ہاتھ گھر نہ لوٹتا۔ میرے دو ماموں اپنا آبائی پیشہ اور کسب، ماہی گیری سے بدل چکے تھے۔ وہ ''منڈا'' کے علاقے سے جال پھینکنا شروع کر دیتے اور ''خیالی پُل'' پر اپنا کار اور شکار تمام کر دیتے۔ جو مچھلیاں بیچنے سے بچ جاتیں، اُن میں وہ ہمارا حصہ بھی الگ کر دیتے۔

☆ پشتو میں دل کو زڑہ کہا جاتا ہے۔ زڑ گے اسی لفظ کا اسم تصغیر ہے

ہم الم نصیبوں کے بخت میں سب سے اچھی خوراک بس یہی مچھلی ہوا کرتی، پر وہ بھی کبھی کبھار۔ بڑے ماموں ماں کو کافی ساری باتیں سناتے: ''تجھ میں رتی بھر خون نہیں ہے۔۔۔!!'' یہ جملہ تو گویا ماموں کا تکیہ کلام بن چکا تھا۔ اس کے ساتھ نتھی دوسری بات مچھلیوں کی تعریف میں کرتے: ''تیرے لیے مچھلی دوا ہے دوا۔۔۔ شیر علی اور شیر محمد کو بارہا کہا ہے کہ دیکھو لاڈ کو میرے سان گمان میں ہو گا یا نہیں۔۔۔ تم لوگ کٹ کیڈی اور آوارہ گردی چھوڑنے والے تو ہو نہیں۔۔۔ مچھلی دینے کے بہانے ہی بہن کی خبر لیا کرو۔''

بڑے ماموں ایک ایک مچھلی کا سینہ چیرتے جاتے اور جب تک صاف کرتے، اسی مچھلی کی خوبیاں بیان کرنے لگ جاتے: ''بہنا! یہ سلیمانی ہے۔ اس کا پکڑنا مشکل ہوتا ہے، کیوں کہ پتھروں کے نیچے خود کو چھپائے رکھتا ہے۔ جال کے نیچے تب ہی آتا ہے جب یہ خود کسی کام کے لیے یا شکار کے لیے نکلتا ہے۔۔۔ دیکھو بہن۔ دیکھ اس کے گلے پر انگوٹھی کے گول نشان کو۔'' وہ بولتا چلا جاتا اور ماں کے ہونٹ ''ہاں''، ''نہ'' اور ''اچھا'' جیسے الفاظ کی ادائیگی کر کے آہستگی سے ہلتے رہتے ___ شیر ماہی، مہاشیر، رہو، بریتو☆، پوٹھی، مار ماہی اور ہمدر جیسی مہان مچھلیوں سے پہچان ماموؤں نے کرائی اور کھلائی ہیں۔

ماں کی موت سے چند روز قبل مشر ماما (بڑے ماموں) نے مارے خوشی کے دیوانہ وار دوڑتے ہوئے ہمارے گھروندے کے اندر قدم رکھا: ''اے بہنا! تم تو بلاوجہ اپنی قسمت کا رونا روتی رہتی ہو۔۔۔ تیرا نصیب خوار نہیں، بیدار ہے بیدار۔۔۔ دیکھو تو، تیرے نام کا جو جال پھینکا تھا، اس میں پورے بارہ سیر کا ہمدر پھنسا ہے۔۔۔ یہ بالکل نیچے مٹی کی تہ میں پڑا رہتا ہے، اسی لیے اس کی گوشت کی لذت کا بھی جواب نہیں۔''

ماں کے بے دم وجود میں لحظے بھر کے لیے جنبش پیدا ہوئی۔ کمزور وجود میں توانا روح نے حرکت کرتے ہوئے آنکھیں نیم وا کیں۔ آنکھوں میں زردی گھلی ہوئی تھی۔ بے آرامی اور بے خوابی کے سبب خمار نے بھی اپنا قبضہ جما رکھا تھا: ''خدا تجھے دونوں جہانوں کی خوشیاں دے۔'' وہ بہ مشکل تمام اتنا ہی بول پائی۔

میں چھ برس اور تین ماہ کا تھا، جب ماں نے میرے نومولود بھائی کے سنگ اس سنگین دنیا کے رنج و الم کو خیر باد کہا۔ میں نے تو اسے کبھی زندہ و تابندہ دیکھا ہی نہیں تھا۔ مجھ پر تو زندگی اک کڑی دھوپ کی صورت میں منکشف ہوئی تھی۔

شامیں بھی مجھ پہ گراں گزرتیں
رات رات بھر جاگتا اور روتا رہتا

☆ موہ مچھر

بیمار، تنہا اور اُداس ماں کے لیے بھی دل کڑھتا رہتا۔ جمال اور صنوبر مجھے اپنے خوابوں کے احوال اور اسرار میں شریک کرتے۔ وہ خوابوں میں ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتے۔ سُریلے پرندوں اور رنگ بارنگ کے پرندوں کے ساتھ کھیل رہے ہوتے۔ جنات اور جادوگروں کے ساتھ لڑتے اور ہر جنگ میں اُنھیں ہراتے لیکن میں سپنوں کی دنیا اور خوابوں کے جہاں کے لیے بس ترستا ہی رہا کیوں کہ خواب اور سپنے بھرپور نیند کے دوران میں آتے ہیں اور میں رت جگوں کا ساتھی اور راہی تھا۔ میلے کچیلے تکیے اور چارپائی کے بازو پر میری آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں سے خوف ناک اور ڈراؤنی تصاویر بنا کرتیں۔ میرے بچپن کے دنوں کی ہر شام غم کی شام ہوا کرتی اور مجھے اپنے چاروں طرف مرثیوں کا اہتمام نظر آتا اور میرے لب پہ دُعا بن کے جو تمنا آتی، وہ میری آنکھوں پہ ماں کے ہاتھ کی طلب ہوتی۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے!

☆☆☆☆

پنجابی تخلیق و ترجمہ۔ میر تنہا یوسفی

موڑ مہاراں

وہ ایک عالی شان دفتر تھا اور اس کے اندر جہاں وہ سب بیٹھے تھے، اُس دفتر کا چائے والا کمرہ تھا جو اتنا ہی صاف ستھرا اور سجا ہوا تھا جتنا اُس بڑی کمپنی کی اُس عمارت کا ہر کمرہ تھا۔

فرش پر ہلکے نیلے رنگ کا قالین، اُسی رنگ کے پردے جو دھوپ کو روکنے والے شیشوں کے آگے، چھت سے فرش تک لٹکے ہوئے تھے۔ دیواروں کے ساتھ لگے اُسی رنگ کے صوفے اور درمیان میں شیشے کی ایک میز ویسے ہی نیلی نیلی لگ رہی تھی۔ اندر بیٹھے شخص کو یوں محسوس ہوتا کہ شاید وہ سمندر کے پانی کے اندر کسی بلبلے میں بیٹھا ہو۔ میز پر مٹھی والے کھڑے پیالوں میں گرم گرم چائے اور چینی کی تھالی میں نرم نرم بسکٹ رکھے ہوئے تھے۔ ایسی جگہ پر بیٹھا انسان چاہے مہمان ہی کیوں نہ ہو اپنے آپ کو کوئی راٹھ سمجھنے لگتا ہے۔

چوہدری نذیر وہاں اپنے ایک پرانے دوست نصیر خان کو ملنے گیا تھا اور وہ چوہدری کو چائے پلانے اس کمرے میں لے آیا تھا۔ وہاں اصول طے تھا کہ ”بزنس از بزنس اینڈ اے کپ آف ٹی از آ کپ آف ٹی، چناں چہ مہمان کو اپنے کمرے کے بجائے یہاں لا کر عزت سے بٹھایا اور خدمت کی جاتی۔ دفتری کمروں میں کاروبار کی بات یا صرف کام کیا جاتا تھا۔

نصیر خان ہزارہ کا رہنے والا تھا، مانسہرہ کا باشندہ۔ اُسے اس بات پر بہت غصہ آتا تھا کہ اردگرد کے پختون بھائی وہاں کے ہندکو بولنے والوں کو ”دا پنجابیان دے“ (یہ سب پنجابی ہیں) اس انداز سے کہتے کہ جیسے غصہ کیا جاتا ہے۔ نصیر خان ان عقل مندوں میں سے تھا جو گھر میں ہندکو، بازار میں پشتو، پنجاب آ کر پنجابی، دفتر میں اردو اور صاحب کے سامنے انگریزی بولتا تھا۔ انگریزی بولنا ایک مجبوری تھی کیوں کہ اس کمپنی میں رنگ رنگ اور ڈھنگ ڈھنگ کے ملکی اور غیر ملکی لوگ کام کرتے تھے اور یوں انگریزی کا چلن عام تھا۔ اس کمپنی کے کاروبار کا سارا زور بلوچ علاقوں میں تھا اور یوں بلوچ جوانوں کو ملازمت دینا کمپنی کی مجبوری تھی۔ مجبوری یوں کہ اُس علاقے میں کمپنی کے کاموں کے لیے درکار قابلیت والے پڑھے لکھے جوان ڈھونڈنا بہت مشکل امر تھا۔ حکومت کے ساتھ کیے معاہدوں کی بنا پر کمپنی اس بات کی پابند تھی کہ مقامی لوگوں کو ملازمتیں مہیا کرے گی۔ وہ علاقے ایسے تھے جہاں ایک پرلطف بات عام سنی سنائی جاتی تھی جو کچھ یوں تھی کوئی آدمی کسی دوسرے کے پاس

گیا اور کہا: ”یار! ایک خط لکھوانا ہے“ دوسرا بولا ”کس کا نام؟“ تو پہلے نے کہا: ”اپنے سسر کے نام“ یہ سن کر وہ پڑھا لکھا آدمی گویا ہوا ”میں نہیں لکھ سکتا۔۔۔ میرے دائیں پاؤں میں درد ہے۔“ یہ سن کر سوالی بولا: ”چلو رہنے دو۔“ وہیں پاس ہی ایک انجان پردیسی بیٹھا تھا، وہ حیران ہوا کہ یہ کیا تماشا ہے؟ خط کا پاؤں سے کیا واسطہ؟ جب اس کی سمجھ میں نہ آیا تو پوچھ ہی بیٹھا: ”بھائی صاحب!۔۔۔“ تو وہ آدمی ہاتھ اٹھا کر بولا: ”مجھے معلوم ہے آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔۔۔ بات یہ ہے کہ جناب اس علاقے میں دُور دُور تک کسی کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا۔۔۔ یہ جو شخص خط لکھوانے آیا تھا اس کا سُسر پانچ کوس دُور رہتا ہے۔ جب یہ خط اُسے ملتا تو اُس نے پڑھنے کے لیے مجھے ہی بلانا تھا۔۔۔ اور یہ بات لکھوانے والا بھی جانتا ہے۔۔۔ تو یہ ہے بات۔۔۔! دُکھتے ہوئے پاؤں سے میں وہاں کیسے جا سکوں گا!!؟“

مذاق کی یہ بات اُسی ملک کے ایک ایسے علاقے میں مشہور تھی جس کے سب سے بڑے شہر کی آبادی پچھلے ساٹھ باسٹھ برسوں میں ڈھائی لاکھ سے بڑھ کر ڈیڑھ کروڑ تک پہنچ گئی تھی اور جہاں کبھی ایک بھی یونی ورسٹی نہیں تھی اور اب وہاں پچاس سے زیادہ یونی ورسٹیوں کے میلے لگے ہوئے تھے مگر اسی دیس کے سب سے بڑے صوبے کی سب سے کم آبادی کے لیے، سوتیلے سمجھے گئے بلوچوں کے لیے علم حاصل کرنے کی ایک بھی ایسی جگہ موجود نہ تھی جسے مناسب کہا جا سکے۔

نذیر اور نصیر کو چائے پیتے، بسکٹ کھاتے اور باتیں کرتے لگ بھگ دس منٹ ہو چکے تھے۔ جب دروازہ کھلا اور باہر سے تین جوان اندر آ گئے۔ سلام دعا ہوئی۔ ہندکو اور پنجابی کی جگہ اردو چل پڑی۔ تھوڑا سمے بیت گیا۔

چوہدری نذیر کو ایسا محسوس ہوا کہ ایک جوان، کبھی کبھی ایسی تیکھی بات کرتا ہے، جس کا دوسروں سے جواب نہیں بنتا۔ اُس کی یہ چبھتی ہوئی باتیں ایسی کہ جیسے دہکتا ہوا کوئلہ چمٹی میں پکڑ کر جسم کو بس چھوا کر پرے کر لیا جائے جس سے کچھ جلے بھی نہ اور تپش کا بھی کچھ دیر احساس ہوتا رہے۔

”آئی ایم سوری! کیا نام ہے آپ کا؟ میں پوچھنا بھول گیا۔“ نذیر سے آخرکار رہا نہ گیا تو اُس نے اُس طناز جوان سے پوچھ ہی لیا۔

”جی مجھے کامل کہتے ہیں۔۔۔ میر کامل بلوچ۔“ اُس نے پنجابی میں جواب دیا اور اپنی بھرپور مونچھوں تلے ہنستے ہوئے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”آپ تو بہت سوہنی پنجابی بولتے ہیں۔“ چوہدری نذیر نے حیران ہوتے ہوئے ہنس کر کہا۔

”جی ہاں! میں بلوچستان کے پنجاب کے نزدیکی علاقے سے ہوں۔ ابا جی کوئٹہ میں نوکری کرتے

تھے۔ ڈرائیور تھے۔ ہمارے پڑوس میں پنجابی رہتے تھے اور میں انھی کے ساتھ کھیل کر جوان ہوا ہوں اور اب انھی کے ہاں میرا اسرال ہے۔ وہ حافظ آباد کے ہیں۔'' میر کامل بلوچ نے پورا تعارف کرایا جیسے کوئی اپنی سندیں گنواتا ہے۔

''واہ جی! آپ تو بڑے مزے کے آدمی ہیں۔'' چوہدری نذیر نے یوں جواب دیا جیسے کہہ رہا ہو اور کچھ۔''

بلوچ بھی عقل مند تھا، سمجھ گیا اور بولا: ''اب یہاں جس فلیٹ میں رہتا ہوں وہاں میرے سوا سارے پنجابی ہیں اور مجھے آپ کے اردو بولنے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ پکے پنجابی ہیں۔''

''پنجابی جیسی، میٹھی زبان بولتے ہوئے آپ کبھی کبھی بہت کڑوا بول جاتے ہیں۔'' چوہدری نذیر نے ذرا سا مسکرا کر وہ بات کہہ ہی دی جس کے لیے اُس نے اتنی فالتو باتیں کی تھیں۔

''اوہو! نہیں جناب! بس دوستوں سے ذرا مذاق شذاق کرتا ہوں اور رہ گئی پنجابی کے میٹھا ہونے کی بات تو۔۔۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ غصے والی بات جتنی سختی سے پنجابی میں کی جاتی ہے۔۔۔'' بلوچ نے بات آدھی ہی چھوڑ دی۔

''چلیں!۔۔۔ مگر اتنی کڑواہٹ۔۔۔ کیوں آخر؟''۔۔۔ چوہدری نذیر نے عمر میں بڑا ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ذرا زور سے کہا۔

''نہیں سر نہیں! کڑواہٹ نہیں ہے، یہ۔۔۔ سچ ہے۔ یہ سارے۔۔۔'' بلوچ نے کمرے میں خاموش بیٹھے آدمیوں پر نظر گھما کر چوہدری نذیر کی سمت دیکھا اور بولا: ''یہ نصیر خان، حیدر نقوی، گل زرّین اور دوسرے سارے۔۔۔ مجھے اور میرے ساتھ کے سب بلوچوں کو اُجڈ، جنگلی اور بیوقوف سمجھتے ہیں۔ مگر میں۔۔۔ کیوں ان کے دباؤ میں آؤں۔۔۔ میں کسی کا دیا ہوا تو نہیں کھاتا۔۔۔ میں نے کسی کے گھر نقب تو نہیں لگائی۔۔۔'' بات نامعلوم جہت کو چل پڑی تھی۔

''دباؤ میں آنا بھی نہیں چاہیے مگر جب تک کوئی چھیڑے نہ اُس وقت تک خود آگے بڑھ کر اگلے کو زچ بھی تو نہیں کرنا چاہیے۔'' چوہدری نذیر نے بات بنانے کی کوشش کی۔

''میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں!۔۔۔ میں نے کبھی پہل نہیں کی تھی۔ ان کی بہت سنیں۔ اب کبھی کبھی جواب دینا پڑتا ہے۔۔۔ اب دیکھیں نا! یہ سارے۔۔۔ نصیر صاحب! ان کا اُدھر بگرام میں سنگِ مرمر کا کاروبار ہے۔۔۔ کروڑ پتی لوگ! حیدر نقوی کا بڑا بھائی کراچی میں اپنی سیاسی پارٹی کا لیڈر ہے یعنی۔۔۔ واہ واہ۔۔۔ اور گل زرّین صاحب کشمیر کے جنگل اُجاڑنے والے ٹھیکے داروں کے فرزند ہیں، کشمیر کو آزاد کرانے

کے بجائے یا ادھر والے علاقے کے پہاڑ گنجے کر کے لکڑی بیچتے اور بکرے ہضم کرتے ہیں۔۔۔ میرا ان لوگوں سے کیا مقابلہ؟ میرا باپ ایک ڈرائیور! یہ سب بہترین یونی ورسٹیوں سے پڑھ کر یہاں پہنچے ہیں اور میں کیسے آیا ہوں؟ یہ بس میں ہی جانتا ہوں۔ یا میرے خدا! میں بھلا ان کو کیا کہہ سکتا ہوں؟'' کامل بلوچ کو کوئی سننے والا کیا ملا، وہ بولتا ہی چلا گیا۔ ذرا سانس لی اور کہا: ''مذاق اڑائیں گے تو جواب تو دینا ہی پڑے گا نا! اور پھر کبھی کبھی ادھار بھی تو اتارا جا سکتا ہے۔ جیسے ابھی ابھی آپ نے ''کڑوی بات'' کہہ کر میرے سر الزام تھوپ دیا ہے۔''

کمرے میں سنجیدگی نے ڈیرا ڈال دیا تھا۔ چائے اور بسکٹ بس پڑے ہی رہ گئے تھے۔ چوہدری نذیر اور کامل بلوچ ایک دوسرے کو آنکھوں میں تول رہے تھے جیسے دو پہلوان اکھاڑے میں اتر رہے ہوں اور تماشائی ہر شے بھول کر ان دونوں کے اگلے داؤ کے منتظر ہوں۔ نجانے کون۔ دوسرے موجود لوگ یہی چاہ رہے تھے کہ چوہدری نذیر ہی کامل سے بات کرے۔۔۔ خود وہ سب خاموش بیٹھے تھے۔

کامل کی لمبی تقریر ختم ہوئی تو چوہدری نذیر نے ذرا سا کھانس کر اپنے آپ کو جیسے ہلایا اور کہا: ''میں سمجھ گیا ہوں۔۔۔ آپ بلوچ ہیں اسی لیے آپ کو نوکری مل گئی ہے۔۔۔ اب آپ اپنے ان دوستوں کو چھوڑ دیں اور میری بات سنیں! مختصراً کچھ یوں ہے کہ میرے والد صاحب بھی پڑھانے کے قائل نہیں تھے۔ چناں چہ میں نے ایف اے کر کے نوکری کر لی۔ پھر بی۔ اے کیا اور تھوڑی سی ترقی ہو گئی۔ نوکری چلتی رہی۔ میں نے ایم۔ اے کر لیا اور پھر بھی باز نہ آیا شام کو اکاؤنٹس کی کلاسوں میں جا گھسا اور اب میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہوں۔۔۔ بات یہ ہے کہ محنت بندے نے خود کرنا ہوتی ہے اور اجر دینے والا اوپر۔۔۔ سب کا مالک ہے نا!'' چوہدری نذیر نے اپنی دانست میں ''ایک لوہار کی'' چوٹ لگائی۔

''یہ بات نہ کریں۔'' کامل بلوچ نے حجت کی۔

''کیوں نہ کروں؟ آپ نے اپنی جنگ خود لڑنی ہے۔ اگر آپ۔۔۔ میرا مطلب ہے میر کامل بلوچ زیادہ نہیں پڑھ سکا تو اس میں کسی بھی دوسرے سے زیادہ اس کی اپنی ذات کا قصور ہے۔ آپ کو کس نے پڑھنے سے، آگے بڑھنے سے روکا تھا؟'' چوہدری نذیر نے جیسے چکمہ دے کر آگے بڑھتے اور اچانک پلٹتے ہوئے داؤ لگایا اور پوچھا: ''ویسے آپ کتنا پڑھے ہوئے ہیں؟''

''میں نے ڈپلومہ کیا ہے الیکٹرک ٹیکنالوجی میں، ملتان سے۔'' کامل نے نرمی سے کہا جیسے اگلے داؤ کے بارے میں سوچ رہا ہو۔

''آگے بی۔ ٹیک کرنا تھا۔۔۔ یا انجینئرنگ۔۔۔؟'' چوہدری نذیر نے سوال جیسا مشورہ دیا۔

''کہاں سے۔۔۔؟ جیسے۔۔۔؟'' بلوچ جیسے الف ہو گیا۔

''چوہدری صاحب! یہ نہیں مانے گا۔'' حیدر نقوی اچانک بولا: ''یہ ہے ہی اُوت کا اُوت ۔۔۔ ہم روز سمجھاتے ہیں بھیا! اتنے بڑے شہر میں آئے ہو تھوڑی کوالیفیکیشن امپروو کرلو، ترقی کرجاؤ گے، پھر بلوچ ہو، کمپنی کو ضرورت ہے، بہت اوپر جاسکتے ہو، مگر یہ مان کے ہی نہیں دیتا۔''

''آپ ٹھہریے! میں بات کررہا ہوں نا!'' چوہدری نذیر نے حیدر کو سمجھاتے ہوئے کہا اور کامل بلوچ کی طرف رُخ کر کے بولا: ''کہاں سے ۔۔۔ کیا مطلب؟ اُدھر کوئی ٹیکنیکل کالج نہیں ہے؟''

''اگر میں کہوں کہ نہیں ہے تو پھر ۔۔۔؟'' کامل آرام سے بولا۔

''یہ کیا بات ہوئی؟'' چوہدری نذیر کو اور کچھ نہ سوجھا۔

''خیر چھوڑیں یہ بات ۔۔۔ میں آپ کو ذرا گھما کر سمجھاتا ہوں۔ بات یہ ہے چوہدری صاحب کہ دریائے سندھ کے مشرق میں پنجاب اور سندھ کے صوبوں میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ دریا کے بائیں ہاتھ کا مشہور شہر پشاور ۔۔۔ کابل اور لاہور کے درمیان ہونے کی وجہ سے خود بخود اہم ہوگیا ہے۔ پہلے پہل وہاں والے بھی قصہ خوانی بازار میں بیٹھ کر قہوے پی کر اور نسوار کھا کر وقت گزارا کرتے تھے مگر روسی فوجوں نے ہر شے ہلادی۔ کابلی کابل کو چھوڑ کر پنجاب آگھسے پھر کراچی تک پہنچ گئے۔ ان کی ہمراہی میں پشاوری جوان بھی گھر سے نکلے اور اپنے حجرے چھوڑ کر اٹک پار کر کے ہر طرف پھیل گئے۔ لاہور، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، ملتان، حیدرآباد، کراچی ان کے لڑکے سکولوں، کالجوں سے ہوتے ہوئے یونی ورسٹیوں تک پہنچ گئے۔ اب وہ سب ڈاکٹر ہیں، انجینئر ہیں۔ اور تو اور سوات کا رحیم شاہ اردو گانے گا رہا ہے۔ اسلام آباد کے ہسپتالوں میں پٹھان ڈاکٹر اور نرسیں کام کررہے ہیں، خوشی کی بات ہے۔ پھر شاہد آفریدی، یونس خان اور عمر گل کو ساری دنیا جانتی ہے۔ جہانگیر خان اور جان شیر خان جیسے جوانوں کا ایک زمانہ معترف ہے۔ پنجاب اور سندھ کے ساتھ ساتھ سرحد والے بھی ہوش میں آگئے ہیں۔ یہ سب سچ ہے مگر ۔۔۔ کیا کسی جگہ کسی بلوچ جوان، بوڑھے، ادھیڑ عمر کا نام بھی سننے میں آیا ہے؟ بلوچ تو جیسے کہیں ہے ہی نہیں۔ نہ تین میں نہ تیرہ میں، نہ گھگرے کے گھیراں میں، نہ نوکری کے پیراں میں ۔۔۔'' میر کامل بلوچ نے ایک سانس میں تین صوبے ایک طرف اور بلوچستان دوسری طرف کھڑا کردیا۔

چوہدری نذیر سے پہلے گل زرّین بولا: ''وہ اس لیے کہ تم خود کچھ نہیں کرنا چاہتے ۔۔۔ ہمیں دیکھو کشمیریوں کو! ہم نے دریائے جہلم سے پار کے پہاڑوں اور ان کے جنگلوں میں سڑکیں نکال لیں، وہاں کالج ہیں ۔۔۔ یونی ورسٹیاں ہیں ۔۔۔''

''چھوڑو کشمیری بچے چھوڑو!'' کامل ہتھے سے اُکھڑ گیا۔ ''سیز فائر لائن کے اُس پار ترقی نہ ہوئی

ہوتی۔۔۔سری نگر اور جموں کی سڑکوں اور یونی ورسٹیوں کی خبریں ادھر نہ آئی ہوتیں تو مظفر آباد والوں کو کس نے پیسے دینے تھے۔ انڈیا اُدھر والوں کو خوش کرنے کے جتن کرتا رہا اور ادھر تمھاری لاٹری نکل آئی اور تم لوگوں نے کوہالے کا پُل پار کیا اور پنجاب پہنچ گئے۔ ہر فن سیکھ لیا۔ دوہرے ووٹ ڈالتے ہو کہ بھئی ہم تو مہاجر ہیں۔ مگر ہم بلوچ۔۔۔ہم قندھار سے لے کر قلات تک۔۔۔پسنی اور جیوانی اور گوادر۔۔۔خضدار اور تربت۔۔۔ایک لامتناہی بیابان۔۔۔جہاں سے ہر سکول، ہر روشنی اور ہر کتاب۔۔۔نور کے تمام منبع جات لاکھوں سالوں کی دوری پر۔۔۔ہمیں پاکستان میں شامل ہونے کا کیا صلا ملا؟ کشمیری زیادہ سگے ہو گئے اور ہم جو سگے تھے انھیں سوتیلے کر دیا گیا۔ ہمیں کچھ دینے کے بجائے ہر کوئی ہم سے چھین چھین کر خود کھا رہا ہے۔ سارا ملک گیس استعمال کرتا ہے اور کوئٹہ کو گیس کی فراہمی اُس وقت ہوتی ہے جب کراچی اور لاہور میں گیس کے چولہے جلتے ہوئے تیس سال بیت جاتے ہیں۔ گل زرّین صاحب! باتوں کا ایک الاؤ ہے۔۔۔سمجھو! تمھارے کشمیر کے جھنڈے میں چاند ستارا ہے۔ ہمارے ہاں چاند ستارے والا اپنا پرچم اگر کہیں نظر آ جائے تو لوگ اس گھر کو آگ لگا دیتے ہیں۔۔۔سمجھو! ماں باپ جائیوں کو یتیم نہ کرو۔۔۔” کامل کی آواز کانپنے لگی۔

“ہم گیس کے پیسے دیتے ہیں۔ مفت تو نہیں جلاتے۔” نصیر خان نے وکالت کی۔

“پیسے دیتے ہو!۔۔۔کس کو دیتے ہو پیسے؟ اُن سرداروں کو جو اس پیسے کو ”ذاتی“ کمائی سمجھتے ہیں۔ اُس پیسے کی حیثیت سیاسی رشوت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یہ پیسہ نیچے۔۔۔عوام تک آیا ہی نہیں۔ کروڑوں روپے بھی فقط فرداً فرداً چند لوگوں کے بینک بھرتے رہے۔ جب ذرا کم ہوئے تو ان لوگوں نے حکومت کو آنکھیں دکھائی، بلیک میل کیا اور تھوڑے اور بٹور لیے۔ میں پوچھتا ہوں عام بلوچ کو کیا ملا؟ بیٹے تو سرداروں کے پڑھتے رہے۔ وہ بھی غیر ملکی کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں۔۔۔پڑھ کر آئے تو ہمارے جیسے بے بس لوگوں پر آ کر ”سردار“ لگ گئے، اسلحے خریدتے اور گاڑیوں میں سیر کرتے رہے۔ ان کے ایک ڈنر کا خرچہ کسی بھی بلوچ گھر کے تین مہینے کے خرچ کے برابر ہو سکتا ہے۔ عام بلوچ کے بچے تو بس بکریاں پالنے اور اونٹ چرانے کو ہی رہ گئے ہیں۔۔۔آئی ایم سوری۔۔۔مجھے خود سمجھ نہیں آ رہی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور کس سے کہہ رہا ہوں۔۔۔” بلوچ کا مقدمہ کھلتا ہی چلا جا رہا تھا اور چوہدری نذیر سمیت سبھی پانی پانی ہو رہے تھے۔

“ہوں۔۔۔” چوہدری نذیر نے کامل کے چپ ہونے پر ہلکی سی آواز نکالی، چائے کا کپ اٹھا کر ایک ٹھنڈا سا گھونٹ لیا۔

“آپ کہتے ہیں بلوچ پڑھیں” ٹھیک ہے۔۔۔مگر کہاں؟ یونی ورسٹیاں کھلتی ہی نہیں۔ وہاں جنگ کی حالت ہے جناب، جنگ کی۔۔۔!” کامل کو جیسے نئی بات یاد آئی۔

’’ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ چوہدری نذیر ماننے پر آمادہ ہو گیا اور یوں بولا جیسے کہنا چاہتا ہو کہ ’’اپنے اندر کی آگ اُگل دو، بول دو، دل ہلکا کر لو میرے یار۔‘‘

’’ٹھیک کیا اور غلط کیا چوہدری صاحب! آپ سب کے سب یہ ساری باتیں جانتے ہیں اور بس یوں ہی مزے لے رہے ہیں، مجھے چھیڑ کر۔ میں پوچھتا ہوں کبھی کسی نے یہ بھی سوچا ہے کہ اُس بلوچ بچی کا کیا قصور ہے جو تیز دھار پتھروں اور خارزار زمین پر ننگے پاؤں بکریوں کے ریوڑ کے پیچھے بھاگتی ہے اور اُس کی عمر کی پنجابن، کشمیرن، سندھن یا پٹھان بچی سکول میں بیٹھ کر لفظوں کو پہچان رہی ہے۔ کیا وہ بلوچ بچی کوئی غلام زادی ہے کہ باقی سارے ملک کی ہانڈیوں کو درکار گوشت کے لیے بکرے پالے اور باقی ملک کی بچیاں کوئی شہزادیاں ہیں کہ سکولوں میں پڑھ کر آئیں اور گھر آ کر قورمہ کھاتے ہوئے بھی نخرے کریں؟ کیا بلوچ بچے اور بچیاں ڈاکٹر، انجینئر، افسر بننے کے خواب نہیں دیکھ سکتے---؟ چھوڑیں جی!---یہ پاگلوں والی باتیں ہیں---کون جانے بلوچوں کو اگلی صدی کا سورج بھی اُجاڑوں اور بیابانوں میں ہی دیکھنا پڑے گا---‘‘ بلوچ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور اس نے اپنا چہرہ پرے کو پھیر لیا۔

’’کیا کریں؟ ہمارے بس میں کیا ہے---؟ نصیر خان بولا۔

میر کامل بلوچ یوں پلٹا جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو اور پھر وہ سُرخ دہکتے ہوئے چہرے اور اُبلتی ہوئی آنکھوں سے دیکھتا ہوا بولا: ’’کیوں؟ افغانستان میں اپنی مرضی کی حکومت بنانے کے لیے اپنے جوان مروانے کو تیار ہو مگر اپنے ہی ملک میں تبدیلی لانے کا کہو تو کہتے ہو کہ ’ہمارے بس میں کیا ہے؟‘‘ واہ عقل مند واہ! ا مجھے یہ سمجھاؤ کیا حکومت میں صرف لوٹ مار کرنے کو ہی آتے ہو؟ چلو! وہ بھی کر لو مگر کوئی اچھا کام بھی تو کر جاؤ جو تمھارے گناہوں کی کالک کو کم کر دے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اگر حکومت چاہے تو کیا نہیں کر سکتی---؟ بولو---جو قوم ساری دنیا---امریکہ، یورپ، روس اور چین جاپان سمیت ہر کسی کو چکمہ دے کر ایٹم بم بنا سکتی ہے وہ کیا نہیں کر سکتی---؟ بھائی صاحب ہم ہی ٹھیک نہیں، ہمارا قبلہ ہی درست نہیں ہے۔ حکومت ہوتی کس لیے ہے؟ صرف بلیک میل ہونے کے لیے؟ آخر کیوں ہوتی ہے بلیک میل؟ عام بلوچوں سے کیوں نہیں بات کرتی جو ہر طرف سے رگڑے جا رہے ہیں؟ کیا کمی ہے بلوچوں میں؟ یوں تو پنوں کو پنل کہہ کے اُسے سینے لگا کر، اُس کے گانے گاتے پھرتے ہو۔ مُراد بلوچ کو کھیڑوں کی سنگتی دے کر بھنگڑے ڈالتے ہو مگر یہ نہیں دیکھتے کہ پنوں اور مُراد کی آج کی نسلیں اب بھی محبت بھری نظروں سے منتظر ہیں۔ وہ اپنا رنگ اور روپ دکھانا چاہ رہی ہیں مگر نہ جانے ادھر سب کے سب اندھے اور بہرے ہو چکے ہیں۔ کسی کو کچھ نظر ہی نہیں آ رہا۔ کسی کان تک پنوں کی چیخ اور مُراد کے رُباب کی تان پہنچ ہی نہیں رہی۔ سندھیوں کو کراچی کراچی کرتے اور لاہوریوں کو

''لاہور لاہور اے'' کے نعرے لگانے سے فرصت ہی نہیں مل رہی۔ پشاور والے اپنی ہوا میں ہیں اور کوئٹے میں کیا ہو رہا ہے کسی کو رتی برابر خبر نہیں۔۔۔ دیر ہو گئی تو روؤ گے۔۔۔ جاگو! ہوش کرو۔۔۔ ہوش! اس سے پہلے کہ بیمار دم توڑ جائے کوئی حکیم طبیب ڈھونڈ لو جو ابھی، اسی وقت پہنچے۔'' میر کامل بلوچ بات کرتے کرتے ہانپنے لگا اور پلکیں پٹپٹا کر چھت کو دیکھنے لگا۔

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

''پنّوں۔۔۔'' کی چیخ اُن چاروں تک پہنچ گئی تھی۔ دُور کہیں ریگستان میں پھرتے مراد کے رباب کی آواز اپنے ہونے کا پتہ دے رہی تھی۔ لگتا تھا پنّوں اور مُراد اپنی اپنی اونٹنی کی مہار سسی اور سمّی کے گاؤں کی طرف موڑنے کو تاؤلے ہو رہے تھے۔

میر کامل بلوچ نے اپنی ہتھیلیوں سے آنکھیں خشک کیں اور کہا: ''چوہدری صاحب! آپ مہمان ہیں ہمارے۔ کل آپ نہ جانے کسی اور میر کامل بلوچ کو ملیں نہ ملیں۔۔۔ آپ نے اپنی کہانی سنائی، بہت اچھا کیا۔ آپ نے جو کچھ کیا وہ اس لیے کر سکے کہ آپ کے پاس کتابوں کی دکانیں تھیں، پڑھنے پڑھانے کے ٹھکانے تھے، آپ کے پاس نوکری تھی اور جہاں میں نے زندگی گزاری ہے وہاں نہ کتابیں، نہ کوئی پڑھنے کی جگہ اور نہ ہی کوئی پڑھانے والا استاد۔ میں نے ملتان میں دو سال پڑھا ہے اور جہاں میں رہتا ہوں وہاں لڑکوں کو اپنے گھر کے چولہے جلانے کے لیے لکڑی نہیں ملتی۔۔۔ وہ جنگل بیلے سے لکڑیاں اور سوکھی شاخوں کے ٹکڑے ڈھونڈ کے لائیں یا پڑھائی کریں؟ ایسی جگہ اگر کتاب مل جائے تو چولہے میں جلا کر اُس سے روٹی پکائی جاتی ہے، اُسے پڑھا نہیں جاتا۔''

☆ ☆ ☆ ☆

اکبر لاہوری

پنجابی سے اردو ترجمہ: **اعظم ملک**

گھگو

میں نے گھگو کو پہلے پہل بلے جھیور کے تندور پر دیکھا تھا۔ وہ روٹیاں لگوانے آیا اور بار بار بلے کو جلدی کرنے کو کہہ رہا تھا۔ وہ کہتا تھا بھئی پہلے ہماری روٹیاں لگا دو۔ ویسے تو بلے کے تندور پر ہر وقت ہی بھیڑ لگی رہتی۔ مگر اس وقت تو بہت ہی بھیڑ تھی کیوں کہ یہی ٹائم تھا بابو لوگوں کا دفتر جانے کا اس لیے ہر بابو کا نوکر پہلے روٹیاں لگوانے کا کہتا تھا۔ مگر گھگو کی اکتاہٹ پن دوسروں پر حاوی تھی۔ جیسے جیسے بلا دوسرے لوگوں کی پراتیں، کنالیاں اور تھالیاں کھینچ کھینچ کے اپنے آگے کرتا گھگو جھٹ سے اپنی پرات ان سے آگے ٹکا دیتا بلا اسے ٹوکتا ''او وہ جیون جوگیا! تو کل بھی دوسروں کی باری لے گیا تھا، بھائی! ہماری دکان داری ہے ہم ہمیشہ آنے والے لوگوں کو پیچھے نہیں کر سکتے۔ تجھے ہر وقت کیا جلدی پڑی رہتی ہے؟''

مگر گھگو کسی کی بھی بات نہیں سنتا۔ جیسے کوئی نشے میں ہو۔ ہر تھالی، ہر کنالی ہر پرات کے فارغ ہونے پر اپنی پرات آگے کر دیتا۔ ''بھائی! اب ہماری روٹیاں لگا بھی دو۔ اتنا وقت کیوں لگا دیا، ہمارے بابو کو دفتر سے لیٹ کرنا ہے اور بی بی بھی غصے ہوں گی۔''

ویسے بھی ہر دیکھنے والا اس کی پرات کو پہچان لیتا تھا۔ کیوں کہ یہ پرات چمکدار ہونے کے ساتھ سات رنگی ریشمی رومال سے ڈھکی ہوتی تھی۔ دوسروں کی قندوریاں کڑھائی ہوئی کشمیری چادروں کے سامنے، کھدر کی میلی صافی لگتی تھیں۔ سات رنگی ریشمی رومال میں سے انوکھی خوشبو چاروں طرف پھیل جاتی تھی اور نیچے سے دودھ کی طرح سفید آٹے کے پیڑے ایسے ڈھنگ سے ٹکائے ہوتے تھے کہ جیسے سنیارے کی تکڑی نے تول کے بنائے ہوں۔ دوسری بات یہ کہ دیکھنے والا اسے اس لیے جلد پہچان لیتا کہ گھگو کے اتاولے پن کا ڈھب عام لوگوں یا عام نوکروں والا نہیں تھا۔ وہ بار بار بلے جھیور کو ایسے جلدی ڈالتا تھا جیسے اس کی اپنی زندگانی کو جلدی ہو۔ وہ اپنے دانت کریچتا، منتیں کرتا، کبھی غصے سے نتھنوں کو پھلاتا بھئی میریاں روٹیاں جلدی لگیں تو میری جان خلاصی ہو۔ کئی نوکروں نے دیکھا کہ گھگو کی جان پہ بنی ہوئی ہے اور انھوں نے ترس کھا کے اپنی باری گھگو کی پرات بلے کے آگے رکھتی اور کہتا کہ اسے فارغ کر دو تا کہ اس کی جان خلاصی ہو ہماری پرواہ نہ کرو۔ ہمارا کیا ہے ہم تھوڑی دیر اور انتظار کر لیں گے۔ ایسے سخی داتاؤں کو دیکھ کر گھگو کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جاتی

جیسے جیٹھ ہاڑ کے موسم میں ٹھنڈے شربت کا گلاس دیکھ کر۔

روٹیاں لگ جانے پر گھگو نے گرم گرم پرات سر پر ٹکائی اور گھوڑے کی طرح بھاگتے ہوئے گھر جا کر سانس لینا۔ گھگو جن لوگوں کا بغیر تنخواہ کے نوکر تھا وہ محلے میں سوہنے لوگ کہلاتے تھے۔ کہتے ہیں اس گھر میں حسن کی فوج اتری ہوئی ہے۔ حسن کے پروانے ہیں ایک سے ایک بڑھ کر۔ گھر جاتے ہوئے یا گھر کو آتے لوگ ان کی ایک جھلک کو ترستے تھے۔ مگر یہ جھلک کسی قسمت والے کے حصے میں ہی آتی تھی۔ جو ہمیشہ قدموں میں لگے پتھروں کی طرح حسن کے سورج کی تپش میں جھومتے تھے کہ شاید اس امید میں بھی کبھی اس تپش میں ان کی زندگی کا کالا پتھر ہیرا، پکھراج، نیلم یا کم از کم عقیق ہی بن جائے۔ وہ تن من سے سوہنیوں کی سیوا میں لگا ہوا تھا اس سیوا میں وہ تھکتا نہ ہی اکتاتا تھا اور نہ ہی مزدوری مانگتا۔

”بو بکرا ک تیرے دم بدلے میں سارے ٹبر دی نوکر“

کسی نے بھی ایک دھیلے کی شے منگوانی ہو گھگو اس کے لیے کئی کوہ کے سفر پر جانے کے علاوہ میلوں کا سفر کرنے کے بعد واپس جانے پر بھی تیار تھا۔ انکار یا ادھار تو ایک طرف گھگو تو اپنی کھال کی جوتیاں سلوا کے دینے کو تیار تھا۔ بھئی کوئی گھگو کو ایک بار کہہ دے کہ تیری کھال کی گرگابی پاؤں میں پہننی ہے اور پھر بے شک کھال کی گرگابی بنا کے گھگو کے گوشت کا قیمہ کٹوا کے کوفتے بنوا لے۔ گھگو ہر بات پر راضی تھا۔ گھگو جوان تھا مگر اسے یہ پتا نہیں تھا میں جوان ہوں۔ اسی طرح گھگو انسان تھا مگر اسے پتا نہیں تھا میں انسان ہوں۔ وہ تو اپنے آپ کو گھوڑا یا گدھا یا کوئی اور جانور سمجھتا تھا جس کا کام ہی بھار ڈھونا تھا۔

سوہنے تو رہے ایک طرف، ان کا نام لے کے بھی کوئی گھگو کو بیگار ڈالتا تو گھگو ویسے ہی اس کا حکم بجا لاتا۔ ایسے کام گھگو کو پڑتے ہی رہتے تھے۔ کوئی اسے بھیجتی جاؤ چکی سے دانے پسوا لا، کوئی کہتا چارپائی ٹھکوا لاؤ۔ کوئی کہتی جا بچوں کو چونڈھی لگوا لا۔ یہاں تک کہ محلے میں فوتیدگی ہو جائے تو قبر بنوانے کے لیے گورکن والے بھی گھگو کو بھیجتے تھے گھگو سے انکار کی کبھی آواز نہ آتی۔ جیسے مردہ بدن سے کوئی آواز نہیں نکلتی۔

سیانے کہتے ہیں بھئی اگر گھگو ہمارے محلے میں نہ ہوتا تو سارے کام خراب ہی رہتے تھے کبھی ٹھیک نہ ہوتے۔ بارش پڑنے لگتی تو مسجد کی دریاں تہہ کر کے گھگو کے بغیر کون اندر رکھتا۔ کسی عورت نے ہسپتال جانا ہو تو اس کے ساز و سامان یا بیٹی کو کون کاندھوں پہ چڑھا کے چھوڑ کے آئے۔ کسی نے اکیلے کسی رشتے دار کی طرف جانا ہو تو چور اچکوں سے حفاظت کے لیے گھگو کے بغیر کون اس کے خالی صحن میں چارپائی ڈال کر حفاظت کرے گا۔

سچ تو یہ ہے کہ گھگو صرف سوہنے لوگوں کے لیے نہیں پورے محلے کے کوجھے لوگوں کے لیے بھی انمول تھا۔

مگر گھگو سے ایک کام لوگوں کی مرضی سے نہ ہوا۔ وہ یہ کہ سب سے اپنی لمبی زندگی کی دعائیں لیتا ہوا

بھی لمبی زندگی نہ مان سکا۔ بس تین دن کے بخار میں رہا اور چوتھے دن اچانک فوت ہو گیا۔ جو لوگوں کی چارپائیاں اٹھا کر قبرستان لے جاتا تھا اسے ایک دن خود لوگوں کے کاندھوں پر قبرستان جانا پڑا۔

ایسے لگتا کہ گھگو مرنے والا نہیں تھا یا جسے ہم قبرستان دفنا کے آئے تھے وہ گھگو نہیں تھا وہ کوئی اور ہی تھا۔ کیوں کہ میں نے اگلے ہی دن گھگو کو جیتا جاگتا دیکھا ہے۔

ریل کے ڈبے میں اتنی بھیڑ تھی کہ بندے اک دوسرے سے سینے سے سینہ اور منہ سے منہ جوڑ کے کھڑے ہونے پر مجبور تھے۔ ان میں سے گزرا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ کوئی اتر یا چڑھ نہیں سکتا تھا۔ دوسری طرف حد کی گرمی تھی۔ اک بندے نے چیخ مار کر کہا بھئی کوئی ریل کے حکمرانوں کو کہے کہ ہوش کریں ہم سے انسانوں جیسا سلوک کریں۔ ایسے سڑے ڈبے کے ساتھ ایک ادھ ڈبہ اور جوڑ دیں کہ لوگوں کو بیٹھنے یا کھڑے ہونے کی جگہ مل سکے۔ ہم تو ایسے قید ہیں جیسے ذبح ہونے والی مرغیوں کو لٹکا کے لاتے ہیں۔ پاس ہی سے ایک اور بندہ بولا حاکموں کے پاس اور کام بہت ہیں وہ ہماری تکلیف کی طرف دھیان کیوں دیں۔ میں نے غور سے دیکھا تو وہ بولنے والا بندہ گھگو ہی تھا۔ ہو بہو گھگو جیسے ہمارے محلے میں سوہنے لوگوں کا بغیر تنخواہ کے نوکر تھا۔

ایسے ہی چراغاں کے میلے پر بھی کسی نے شکایت کی بھئی ہمیشہ سے اس میلے والے دن شالامار باغ کھلا رہتا تھا۔ لوگ مادھول لال حسین کی درگاہ سے دیے جلا کر شالامار باغ میں آتے تھے میلے کی بہار دیکھتے تھے۔ گرمی سے ستائے ہوئے فواروں کی پھوہار کی ٹھنڈک اور پھولوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اسی لیے مدتوں سے چراغاں کا میلا شالامار باغ کا میلا کہلواتا رہا۔ اب یہ کیا ہو گیا کہ کسی نے لوگوں کے اس پرانے حق کو اچانک چھین لیا اور چراغاں کے میلے والے دن شالامار باغ کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

پاس ہی سے ایک اور بندہ بولا کیوں نہ بند کریں وہ دروازہ۔ عام لوگوں کے جانے سے باغ ویران ہو جاتے ہیں۔ یہ شاہی باغ ہے یہاں باہر سے آنے والے بادشاہوں اور سرکاروں کا سواگت ای ہونا چاہیے۔ گندے پیروں والے عام لوگوں کے آنے سے باغ کا حسن ماند پڑ جاتا ہے۔ دھیان سے دیکھا تو یہ بات کہنے والا گھگو ہی تھا۔ ہو بہو گھگو۔ رتی بھر فرق نہیں تھا۔ جیسے ابھی ابھی قبر سے نکل آیا ہو۔

ایک اور بندہ اونچی اونچی کہہ رہا تھا کہ یہ کیا ظلم ہے کل تک ہمارا اناج گوداموں میں تھا ہم دوسرے ملکوں کو اناج دیتے تھے۔ اب یہاں گندم اتنی مہنگی ہو گئی ہے کہ غریبوں کا کچومر نکل گیا ہے۔ آٹے کو ہاتھ نہیں لگتا۔ سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک اور اٹھ کر بولا یہاں آٹے کا کوئی توڑا نہیں۔ اپنے ہمسائے دیس کی طرف دیکھو۔ آٹے کا توڑا وہاں ہو گا۔ ہمارے دیس میں آٹے کی کوئی کمی نہیں۔ ذرا دھیان سے دیکھا تو یہ بات کہنے والا بھی گھگو ہی تھا۔ ہو بہو گھگو۔ ویسا چہرہ مہاندرا وہی ماتھا۔

پھر دوسری طرف سے آواز آئی شاباش اوئے گھگو جیوندا رہو، اوئے گھگو۔ کیا بات کی ہے جوان نے۔ تیرے ہوتے شکایتی لوگوں کا کچھ نہیں بننا، جیون جوگیا! تو سدا ای جیتا رہے۔ جیسے بلے جھیور نے کہا تھا جس کے تندور سے سوہنے لوگوں کی روٹیاں لگوانے جانا تھا جن کا تو بغیر تنخواہ کے نوکر تھا۔ بلے بھی شاباش گھگو۔ جیتا رہ اوئے گھگو، زندہ باد اوئے گھگو۔

☆ ☆ ☆ ☆

حنیف باوا

پنجابی سے ترجمہ: سعدیہ شمن

کیا وہ میری بہن تھی؟

دروازے کے باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور بند کھڑکی کے شیشوں میں سے گزر کر میری نظریں برابر کے مکان پر پڑ رہی ہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ اس مکان کے اندر دو بھائی بہن اپنے پیار کی سچی خوشبو مہکا رہے ہیں۔ بہن کے ہاتھ میں سویٹر بننے کی سلائیاں ہیں اور بھائی چائے پی رہا ہے۔ جب میری نظریں اس مکان سے لوٹتی ہیں تو میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ پھر میں دیکھتا ہوں کہ ان آنسوؤں کی چمک میں ایک دودھ جیسی پاکیزہ اور شفاف صورت کھڑی ہے۔

”بھیا! لاؤ میں آپ کو جرسی بنا دوں۔ پوہ کی ٹھنڈی سرد ہواؤں میں آپ دفتر جاتے ہیں۔ اللہ نہ کرے آپ کو سردی لگ جائے ورنہ میں مر جاؤں گی۔ بھائی دفتر جاتے ہوئے آپ کے ہاتھ ٹھٹھر گئے ہوں گے۔ لاؤ میں آپ کے لیے دستانے بُن دوں۔ پاؤں کے لیے جرابیں بھی ضروری ہیں۔ دفتر جاتے ہوئے پاؤں بھی ٹھٹھرتے ہوں گے۔ تو پتہ ہے باہر قہر کی ہوا چل رہی ہے۔ ہائے بھائی! آج آپ دفتر نہ جائیں۔ آج چھٹی پر رہیں۔ جب تک میں آپ کو یہ سب چیزیں نہ بنا دوں۔ بھائی! اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو میں زندہ نہ رہ سکوں گی۔ آپ میرے ایک ہی تو بھائی ہیں۔ اچھا اگر آپ کو جانا ہی ہے تو چائے پی کر جائیں۔ میں ابھی بنائے دیتی ہوں۔ بھیا! ہر وقت سردی سے بچا کرو۔ جب آپ کسی بھی کام سے باہر جاتے ہیں، میرا دل زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔“

”ہائے میں مر جاؤں! ارشد آپ بیمار ہو گئے ہیں۔ میرا ابیٹا، میرا بھتیجا بیمار ہو گیا ہے۔ آپ کو کتنی دفعہ منع کیا ہے کہ آپ سردی میں باہر نہ جایا کریں۔ جب باہر جائیں چادر لے کر جائیں۔ ہائے میرے بیٹے کا جسم تو آگ کی طرح تپ رہا ہے۔ میں ابھی ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔ یا اللہ! میرے بیٹے کو سکون دے۔ میرے بھتیجے کو رحمت بخش دے۔“

میں یہ باتیں سُن کر گھبرا جاتا ہوں، جیسے میرا سپنا ٹوٹ گیا ہو۔ جب میں آنسو پونچھ ڈالتا ہوں تو وہ

دودھ جیسی پاکیزہ ہستی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ میں سوچتا ہوں میرے پاس جرسی نہیں، جرابیں نہیں یا دستانے نہیں؟ میرے پاس سب کچھ ہے۔ کیا یہ میری بہن تھی جو میرے آنسوؤں کے شیش محل میں کھڑی تھی جو ان سب کپڑوں کے ہوتے ہوئے مجھے سردی میں ٹھٹھرتا دیکھ رہی تھی اور مجھے مزید ایسے کپڑے بنا کر دینے کا کہہ رہی تھی اور میرے بیٹے ارشد کی صحت کے لیے سخت فکر مند تھی۔

☆☆☆☆

پوٹھوہاری تخلیق و ترجمہ: **فیصل عرفان**

ما مَر سی تے جیساں کَس رے

ماں دعاؤں کا ہرا ابھرا درخت اور
جنت کا اونچا جھولا ہے
سارا رونق میلہ، رحمتیں اور برکتیں،
دین اور دنیا داری اور اچھا وقت
اُسی کے دم سے ہے
آس پاس میرے تمام دشمنوں
کا مقابلہ میری ماں اکیلے کر سکتی ہے
اب یہ سوچ سونے، تنہا بیٹھنے اور ماں سے دور نہیں رہنے دیتی
کیسے اُسے قبر میں اتاروں گا،
کیسے منوں وزنی سلیں رکھوں گا اور کیسے مُٹھی مُٹھی مٹی ڈالوں گا
ماں کے مرنے پر اپنے آنسو کیسے پیوں گا اور کیسے جیوں گا

☆ ☆ ☆ ☆

غزالہ احمدانی

سرائیکی سے ترجمہ: سلیم شہزاد

بارود کی خوشبو

قدیم درس گاہ اور جدید ہسپتال کے وسطی چوراہے کے فوارے کی چوٹی پر دو سفید کبوتر بیٹھے ہیں۔ اچانک گولیوں کے چلنے کی آواز آئی اور بارود کی خوشبو پھیل گئی ہے۔ ایک کبوتر زخمی ہو کر گر پڑا۔ دوسرا زخمی کبوتر اڑ گیا۔

دور کہیں دو الو کسی شاخ پر بیٹھے محو کلام ہیں۔ یہ ہمارے تمھارے معاشرے کے روایتی منحوس الو نہیں۔ یہ دور حاضر کے دانش مند کالے سفید اُلو ہیں۔ سفید تو کبوتر ہوتا ہے مگر وہ کبوتر تو صرف اولمپکس میں اڑانے کے لیے ہوتے ہیں۔ مگر یہ الو کسی قبرستان کا ذکر نہیں کر رہے۔ یہ ایران کے عادل بادشاہ نوشیرواں کا دور نہیں، یہ آج کل کی بات ہے۔ اچھا اچھا۔ آج کے دور میں قبرستان کا ذکر فضول ہے یہاں تو لاشیں شفا خانے کے سرد خانوں میں سڑتی ہیں یا پھر غائب ہو جاتی ہیں۔

ایک اُلو نے دوسرے سے پوچھا: دوست تمھیں اس دنیا میں سب سے خوبصورت آواز کون سی لگتی ہے؟

دوسرے نے ترت جواب دیا: کلاشنکوف کے منہ سے نکلنے والی آواز۔ میرا جی چاہتا ہے میں اس میوزک پر رقص کروں۔ ایک سیکنڈ میں تیس گولیاں۔ تیس لاشوں پر میرے رقص کے تیس چکر۔

خاموشی کو کبھی محسوس کیا---بامعنی---خوبصورت سناٹا---! دیکھو فضا کتنی معطر ہو گئی ہے!

پہلا اُلو بارود کی خوشبو سے مست ہو کر پوچھتا ہے: یہ ہم کہاں بیٹھے ہیں؟ کمپوچیا میں یا لبنان یا پھر فلسطین میں؟

ہاں شاید کسی تعلیمی ادارے میں---؟ آج کیا تاریخ ہے؟

دوسرے نے مسکرا کر جواب دیا: کسی مستقبل کے شہید کی تاریخ پیدائش---یا کسی جیالے کی تاریخ شہادت ہو گی!

وہ گولی چلنے کی آواز۔ کئی کمال راہموں، فاضل راہو اور راہو جہاد ہر گولی کے ساتھ مرتے جاتے ہیں۔

بارود کی خوشبو سے فضا معطر ہو گئی ہے۔ واہ---واہ---پہلے سفید الو نے دوسرے الو کو آنکھ مارتے ہوئے کہا: بس کر یار! ہم نے امن پھیلانا ہے---ہم سپر پاور ہیں---! ہم نے امن کا نوبل پرائز لینا ہے۔

مگر یار! کبوتر کو کیسے ختم کریں---؟ اسے ہر مرتبہ اولمپکس میں اڑا دیتے ہیں مگر وہ پھر لوٹ آتا

ہے۔۔۔ پٹرول بم سے لے کر راکٹ لانچر تک سارے جنگی آلات دنیا کے بیشتر کونوں پر چل رہے ہیں۔ کئی سہاگ اُجڑ رہے ہیں۔۔۔ کئی نئے بیاہ ہو رہے ہیں۔

دونوں الو اڑ کر کسی اور جگہ جا بیٹھے۔ یہ شاید زیتون کے درخت کی شاخ ہے۔ آج کل الوؤں کا بسیرا شاید یہاں ہے۔

وہ دیکھو۔۔۔ دور کہیں جنگ ہو رہی ہے۔۔۔ یہ کشمیر ہے یا بوسنیا۔۔۔ یہ کوئی میدان جنگ نہیں۔۔۔ اس میں شہید ہونے والے مجاہدین یا عام شہری ہیں یا پھر کسی نہ کسی کالج، یونیورسٹی کے طالب علم۔۔۔ ہر صورت میں اُلو کی فتح۔۔۔ الو اڑتے جاتے ہیں۔۔۔! منہ میں زیتون کا پتہ اٹھائے۔۔۔ اڑتے جاتے ہیں۔۔۔! بوسنیا۔۔۔ انگور نوکارلباخ، لبنان، افغانستان اور کشمیر کا چکر لگاتے ہیں۔۔۔ ایک پرسکون شہر کی کسی عالی شان عمارت پر آ کر بیٹھے ہیں۔۔۔!!

یہ کلہوڑوں، تالپور کا شہر ہے۔ وہ دیکھو پکا قلعہ ہے! شہر کے مختلف حصوں سے اسلحہ سے لیس گاڑیاں داخل ہوئی ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک زوردار دھماکہ ہوا اور تمام جنگی آلات چل گئے۔

تمھارے میرے شہر پر۔۔۔ یہ خالی شہر تو نہیں اور نہ ہی میدان جنگ ہے۔ وہ دیکھو لاشوں کے ڈھیر، کھوپڑیوں کے مینار۔۔۔ فٹ پاتھ۔۔۔ سڑکیں۔۔۔ بازار، دکانیں لاشوں سے بھر گئی ہیں۔۔۔ یہ کیا ہے۔۔۔؟ دکانیں کھلی ہوئی ہیں۔۔۔ شہر کی آبادی ویسی ہی۔۔۔ مگر یہ سناٹا کہاں سے آ گیا ہے۔۔۔ بارود کی خوشبو سے فضا معطر ہو گئی ہے۔۔۔ گہرا سناٹا اور معنی خیز سکوت پھیلتا ہے۔

میرے اندر۔۔۔ اندر۔۔۔ میری روح میں۔۔۔!! دور کہیں کتے بھونک رہے ہیں، لاشوں کو جھنجھوڑ رہے ہیں۔ کہاں ہیں خدائی فوج دار۔۔۔؟ کہاں ہیں امن کے پیامبر۔۔۔؟ کبھی الو بھی امن پھیلا سکتے ہیں۔۔۔؟ کبھی ان کا وجود بھی امن کی علامت بن سکتا ہے۔۔۔؟ سسکتی انسانیت کے گال پر جبر کا یہ بہتا ہوا آنسو پونچھو۔

وہ دیکھو! اس لاشوں کے شہر میں آج بھی میٹرنٹی ہوم بھرے پڑے ہیں!!

وہ دیکھو لیبر روم سے 'لڑکے' کی پیدائش کی خوش خبری آئی ہے... شاید خدا اپنی کائنات سے مایوس نہیں ہوا۔۔۔ مگر باہر تو بارود کی خوشبو ہے۔۔۔ کالے الوؤں کا راج ہے۔۔۔ ہسپتال کے باہر 'مدر ٹریسا اور عبدالستار ایدھی' منتظر کھڑے ہیں۔۔۔ دیکھو ان کو کیا ملتا ہے۔۔۔ لاش۔۔۔ کہ بچہ۔۔۔؟

چوک فوارے کے قدموں میں ایک کبوتر آخری سانس لے رہا ہے اور دوسرا زخمی ہوا دُور اُفق کی وسعتوں میں لڑکھڑاتا اڑتا جاتا ہے.... شاید شاخ زیتون کی تلاش میں....!

شہباز مہروی

سرائیکی سے ترجمہ: تسلیم فیروز

نہر کنارے سایہ دار درخت تو جس نے بیچے ہیں
میں کہتا ہوں اس نے اپنے بیٹے پوتے بیچے ہیں
ہم سے برہنہ پا لوگوں نے گھر کا دودھ نہیں بیچا
جب کہ کئی سرداروں نے اپنے دودھیا شملے بیچے ہیں
ہم منکر ہیں اس کے تخت کے، ہاتھیوں کے اور لشکر کے
جس حاکم نے ہمارے روایتی رقص اور میلے بیچے ہیں
ہنستے بستے ان قصبوں کو ایسے قحط نے گھیر لیا
لوگوں نے اپنے مال مویشی دل کے رقبے بیچے ہیں
روکھی سوکھی کھانے والے کیسے کسی کا حق چھینیں
ان بیچاروں نے تو پسینے ہاتھ کے چھالے بیچے ہیں
نانی اماں تیرے پاس تو بعد میں کوا آیا تھا
لوگوں نے اس سے پہلے من کے کعبے قبلے بیچے ہیں
ہر اُس انجانے بندے کو دیس نکالا ہی دے دو
جس نے ہماری مچھلیاں، دریا اور یہ پونگے بیچے ہیں
جس نے پشت پہ سورج رکھ کر خاک سے خشت بنائی ہے
اُس نے اپنے ہاتھوں کے پھولوں سے چھالے بیچے ہیں

☆☆☆☆

مسرت کلانچوی
سرائیکی سے ترجمہ: حمزہ حسن شیخ

پیاس

فیضان تھل کا رہنے والا تھا۔ وہ سات دن کے بعد، اپنی بیوی مول کو واپس اپنے گھر لا رہا تھا۔ انھوں نے اپنا سفر صبح سویرے شروع کیا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ جب تک سورج کی کرنیں اپنی تپش سے ٹھنڈی ریت کو خشک کریں گی تو اس وقت تک وہ گھر پہنچ چکے ہوں گے۔

فیضان کو اس سے پہلے کسی عورت کے ساتھ سفر کرنے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ وہ نا آشنا تھا کہ جب ایک عورت پائل پہن کر آہستہ آہستہ اپنے قدم اٹھاتی ہے تو پرندے بھی اس کی جھنکار سن کر اپنے گیت بھول جاتے ہیں۔ وہ عورتیں جو لاٹھی تھامے، سارا دن بھیڑوں کے ریوڑ کے پیچھے بھاگتی تھیں، ان کو بھی آج پتہ چلا تھا کہ کیوں پائل دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ چھنکتی ہے۔

مول کی جلد دن کی سفیدی کی طرح چمکیلی تھی۔ اس نے ناک میں نتھلی پہنی ہوئی تھی۔ سات دن پہلے، اسے اپنے خاوند کی یاد بہت ستا رہی تھی۔ آج ٹھنڈی ریت پر چلتے ہوئے جب وہ پانی کا ایک نالہ عبور کر رہے تھے، اس نے خود ہی اپنا نرم ہاتھ، فیضان کے ہاتھوں میں تھما دیا تھا۔

ساری زندگی فیضان نے کلہاڑے کے ساتھ لکڑیاں کاٹی تھیں اور اس کے ہاتھ سخت اور کھردرے ہو چکے تھے، جیسے ہی مول کے ہاتھوں نے اس کے ہاتھوں کو چھوا، اس کو یوں محسوس ہوا جیسے پھولوں نے کانٹوں کے سارے زہر کو چوس لیا ہو۔

”نیک بخت! کیا تم کو پیاس لگی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں تو ۔۔۔ مجھے تو نہیں لگی۔“

”تم اتنی شرما کیوں رہی ہو؟ اتنے زیادہ سفر کے بعد، مجھے پیاس لگ رہی ہے تو پھر تمھیں کیوں نہیں؟ آؤ، ان جھاڑیوں کے سائے تلے بیٹھتے ہیں، پانی پیتے ہیں اور کچھ دیر آرام کرتے ہیں۔ کیکر کے درخت کے سائے میں، فیضان نے اپنے اور مول کے جوتے اتارے۔ ان دونوں میں سے کسی نے بھی نہ سوچا کہ ابھی ایک لمبا سفر باقی ہے جب کہ ان کے پاس بہت کم پانی ہے۔ انھوں نے پیٹ بھر کے پانی پیا۔ ریت پہ، فیضان نے مول کو ایسے ہی گلے لگا لیا جیسے سامنے والی دونوں شاخیں ایک دوسرے کے گلے مل رہی تھیں۔ سبز پتے اور

کیکر کی پیلی پھلیوں نے خوشی خوشی تالیاں بجائیں۔ ہوا نے محبت بھرے گیت گنگنائے اور مومل فیضان کے بازو پہ سر رکھ کر سو گئی اور فیضان بھی اپنے خوابوں کی دنیا میں کھو گیا۔

لیکن سورج نے ان کے خوابوں کے مقابلے میں بہت تیزی سے سفر کیا اور آدھا دن گزر گیا۔ سورج کی کرنیں جب فیضان اور مومل کی آنکھوں میں پڑیں تو دونوں ہی چونک کر اٹھ بیٹھے۔ دونوں کی آنکھیں سرخ تھیں۔ ان کے چہرے پسینے سے شرابور تھے اور ان کے لب خشک تھے۔

”دن گزر گیا ہے۔“ مومل کی آواز میں لرزش تھی۔ فیضان کے پاس بھی اس کا کوئی جواب نہ تھا کہ کیوں اور کتنا دن گزر گیا ہے؟ مومل بھی کچھ دیر کے لیے خاموش رہی، پھر اپنے جوتے پہنتے ہوئی بولی:

”کیا بہت سفر باقی رہ گیا ہے؟“

”نہیں ۔۔۔ زیادہ نہیں ۔۔۔ تم اتنی پریشان کیوں ہو، جب میں تمھارے ساتھ ہوں؟“

فیضان نے اپنے جوتے ایک دوسرے پہ مار کے مٹی جھاڑی۔ وہ جانتا تھا کہ ریت دوبارہ ان سے چمٹ جائے گی۔ لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ نہ اس نے ایسے جوتے پہلے کبھی پہنے ہیں اور نہ وہ دوبارہ کبھی پہنے گا۔

مومل نے بھی اپنے دوپٹے سے اپنا پسینہ صاف کر لیا تھا اور فیضان جمائیاں لیتا ہوا اس کو گھورنے لگا۔ اس کے لب بھی خشک ہو چکے تھے۔ اس نے سامان میں سے پانی کی بوتل نکالی۔ اس نے مومل کو پانی کے کچھ گھونٹ پلائے اور کچھ خود بھی پیے۔ دونوں نے اپنا سفر دوبارہ شروع کر دیا۔

گرم ہوا نے ریت کے گرم ذرات اڑا کر ان کے منہ بھر دیے تب مومل نے اپنے گاؤں کو یاد کیا جہاں آج کل گنے کی فصل اپنی بہار پر تھی۔ جس کے درمیان چھوٹے چھوٹے نالے سانپوں کی طرح پیچ و خم کھاتے ہوئے گزرتے تھے جو کبھی کبھار فصل میں چھپ جاتے اور کبھی کبھار باہر نکل آتے۔ یہ نالے ان کنوؤں سے بہتے تھے جہاں مومل اور شیداں کھیلتے ہوئے بڑی ہوئی تھیں۔ سبز اور پیلی فصل دوستوں کی طرح ہاتھوں میں ہاتھ لے کر کھیلتی اور جھومتی رہتی۔ نالے کے اردگرد، درختوں پر بیٹھے پرندے گیت گاتے اور مومل وہاں پر اپنی بھیڑیں چراتی۔

بانسری کی لے ہر سو گونجتی لیکن مومل نے کبھی اس پہ کان بھی نہ دھرے تھے۔ اس نے اپنے بچپن میں یہ سنا تھا کہ اس کا منگیتر اس سے شادی کرنے کے لیے روہی سے آئے گا۔ جب اس نے فیضان کو دیکھا تو وہ اس کے خوابوں سے کہیں زیادہ خوبصورت تھا۔

فیضان بھی نا آشنا تھا کہ مومل جس کی ناک ہر وقت بہتی رہتی تھی اور جو ایک ٹافی کے لیے روتا

شروع کر دیتی تھی۔ وہ اب جوان ہو چکی تھی اور اب وہ اصلی والی مومل بن چکی تھی۔ اس کی منگیتر ایک نوجوان عورت ہوگی اور اس کا قد اس کے کندھوں کے برابر ہوگا۔ یہ گرم ہوا اور بنجر زمین کے باشندوں کے لیے ایک خوبصورت خواب تھا کہ سرسبز اور بارش والے گاؤں کی ایک لڑکی اس کی بیوی بننے جا رہی تھی۔ اس نے مومل کو دیکھا جس کا رنگ کپاس کی طرح سفید تھا، اس کی آنکھیں کسی تازہ لبالب بھرے ہوئے تالاب کی طرح تھیں اور اس کا نازک جسم سریم کے درخت کی طرح تھا۔ وہ اپنے گاؤں کی طرح خوبصورت تھی۔

فیضان نے دوبارہ مومل کی جانب دیکھا جو تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی۔ سورج کی چلچلاتی کرنوں نے اس کی بڑی آنکھوں کو چندھیا دیا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنا فراک تھام رکھا تھا جب کہ دوسرے ہاتھ، اس نے اپنے ماتھے پر رکھا ہوا تھا لیکن پھر بھی جھلستی کرنیں اس کی پلکوں کو جلا رہیں تھیں۔

”میں جانتا ہوں مومل۔ روہی کا یہ سفر تمھارے لیے نیا اور مشکل ہے۔ لیکن جب ہم گھر پہنچیں گے تو میں تمھیں ہمیشہ آرام دوں گا۔“

فیضان نے خواہش کی کہ کاش وہ شیشم کا گھنا سایہ ہوتا۔ وہ مومل کے لیے ٹھنڈی ہوا اور سایہ لے آتا یا وہ آسمان پر بادل کی طرح پھیل جاتا۔ وہ زوردار بارش کر کے مومل کو بھگو دیتا۔

لیکن سورج نے ریت کے ٹیلوں کے ساتھ مشورہ کیا اور دوبارہ طوفانی آندھی شروع ہوگئی۔ یہ اتنی تیز تھی کہ دونوں کے قدم اکھڑ گئے۔ آندھی اپنی آگ برسانے کے بعد ختم ہوگئی اور ان کے گلوں میں صرف کنکر اور کانٹے رہ گئے۔

دونوں ہی بے بس ہو کر نیچے گر گئے تھے۔ فیضان اٹھا اور مومل کی مدد کے لیے دوڑا۔ وہ مرجھائے ہوئے گلاب کے پھول کی طرح بے ہوش ہو چکی تھی۔ پیاس کی شدت سے، اس کے لب روہی کی زمین کی طرح خشک ہو چکے تھے جہاں کبھی کبھار پانی کھڑا رہتا اور بعد میں وہ بھی قحط کی وجہ سے ختم ہو جاتا۔ اس کی پلکیں اتنی سیدھی تھیں جیسے وہ پلکیں نہیں بلکہ کانٹے ہوں۔ فیضان خود بھی ہانپ رہا تھا۔

”کیا ہمیں صرف دو دن ہی اکٹھے رہنا تھا؟“ یہ سوچ کر فیضان کانپ اٹھا۔ اس نے بے بسی کے ساتھ آسمان کی جانب دیکھا۔ اس کو ایک اونٹ اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔ اس نے جلدی سے اپنی پگڑی سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور دوبارہ دیکھا۔ اب اونٹ پر سوار نوجوان آدمی بھی نظر آ رہا تھا۔

”مومل۔۔۔ مومل۔۔۔ اٹھو۔ دیکھو کوئی فرشتہ ہمارے لیے پانی لے کر آ رہا ہے۔ ہم نہیں مر سکتے۔ ہمیں ابھی زندہ۔۔۔ یقیناً۔۔۔ ایک دوسرے کے لیے۔۔۔“

فیضان خوشی کے مارے پُرجوش ہو گیا۔ مومل نے بھی اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اونٹ سوار اس کی

جانب آ رہا تھا۔ فیضان نے اپنی پگڑی ہوا میں لہرا کر اپنی جانب اس کو متوجہ کیا۔ اونٹ ان کی جانب دوڑتا چلا آیا۔ وہ بڑی سرخ آنکھوں والا ایک خوفناک آدمی تھا۔

''جناب۔۔۔ ہمیشہ جئیں۔۔۔ آپ کے پاس پانی ہوگا۔۔۔ صرف چند گھونٹ۔۔۔''

''ہاں۔۔۔'' اس نوجوان نے چبھتی ہوئی نگاہوں کے ساتھ جواب دیا۔ ''میرے پاس تمھاری پیاس کے لیے پانی ہے لیکن میں بھی تو پیاسا ہوں۔۔۔'' فیضان کے لبوں پہ پیاس کی خاموشی تھی۔ آدمی نے اپنا ہاتھ نیچے کی جانب بڑھایا اور مومل کو اس کے بازو سے پکڑ کر زبردستی اوپر کی جانب کھینچ لیا۔

اونٹ دوڑا، فیضان نے بھی اس کا پیچھا کیا لیکن اس آدمی نے دور سے پانی کی بوتل اس کی جانب اچھال دی۔ فیضان پانی کی جانب دوڑا۔ پانی قطرہ قطرہ اس کی پیاس بجھا رہا تھا جب کہ مومل لمحہ بہ لمحہ اس کی نظروں سے اوجھل ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆☆

اظہار سومرو

سندھی سے ترجمہ: **مصطفیٰ ارباب**

خوف

خوف اور بے یقینی کے پیچھے
ایک صندوق پڑا ہوا ہے
زنگ خوردہ، بے رنگ اور نظر انداز شدہ صندوق
گویا گھر کا کوئی بوڑھا ہے
جس کی مسلسل کھانسی اور سوالات سے
سارا گھر بیزار ہو
اس صندوق کو کوئی بھی کھولنا نہیں چاہتا
صندوق کُھلتے ہی
خوف معدوم ہو جائے گا
بے یقینی مر جائے گی
اور بوڑھا جوان ہو جائے گا
گھر پھر سے اُس کے اختیار میں آ جائے گا

☆☆☆☆

فیض پیرزادہ

سندھی سے ترجمہ: **مصطفیٰ ارباب**

بوڑھا

بوڑھے برگد کے نیچے
ایک ضعیف بوڑھا
اپنے چہرے کی شکنیں گن رہا ہے
دُکھ
فاقوں
اور جبر سے لپیجا ہوا
لوگوں سے دور
اکیلا درخت کے ساتھ
اپنے دکھ بانٹ رہا ہے

☆☆☆☆

امر اقبال

سندھی سے ترجمہ: مصطفیٰ ارباب

ادھورے خواب سے جاگا ہوا شخص

میں ادھورے خواب سے جاگا ہوا شخص ہوں
مُجھ سے رنگوں کے بارے میں مت پوچھو
میں نے سمندر کو ہمیشہ پیاسا دیکھا ہے
میں تمھیں صحرا میں کھو جانے والے
ایک اجنبی مسافر کی کہانی سُنا سکتا ہوں
جس کے قدموں کے نشان
ہوا اپنے ساتھ اُڑا لے گئی
میں تُمھیں ایک ساز دکھاؤں گا
جو مجھے ورثے میں ملا تھا
اور میرے پاس صرف اس لیے محفوظ ہے کہ
ٹوٹا ہوا ہے
مجھ سے موسم کی پہلی بارش کے بارے میں مت پوچھو
میں تمھیں اُس کمرے کے بارے میں بتانے والا ہوں
جس میں ایک دریچہ بھی نہیں ہے
یہ کمرا ہی میری کائنات ہے

میں سوچتا ہوں
اب فاصلوں کی پیمائش کیسے کروں گا
میں نے تو اپنے حصے میں آئے ہوئے
سارے کیلنڈر پھاڑ دیے ہیں
تُم میری باتوں کے ٹھہرے ہوئے تالاب میں
اپنی ہنسی کا سُرخ گُلاب پھینکنے کے بعد
مجھ سے مُسکراہٹ کی اُمید مت رکھنا
کیوں کہ
میں ادھورے خواب سے جاگا ہوا شخص ہوں

☆☆☆☆

امتیاز ابڑو

سندھی سے ترجمہ: **فہیم شناس کاظمی**

گم شدہ پرچم

جب میری جنم گھڑی تھی
میں دیواروں کی بنیادوں میں تھا
جہاں مجھے
قدیم محاورے کے مطابق
رونا سکھایا گیا
میں نے سفر کرنا سیکھا
تو میرے ہاتھوں میں
ایک معاہدہ دیا گیا
میرے سفر کی رفتار مقرر کی گئی
میں نے ایک کشادہ گھر کی تمنا کی
تو سب راستے خاموش ہو گئے
یک چشمی تاریخ
مجھ پر قہقہے لگاتی رہی
دوپہر میں
درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر

گم شدہ پرچم کے بارے میں سوچا
جو پھولوں کی طرح
مجھ پہ سایہ فگن تھا
جو پانچ ہزار سال کے لشکر میں
کہیں گُم ہو گیا

☆☆☆☆

ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی
کشمیری سے ترجمہ: غلام حسن بٹ

جگر کا خفقان

خدیجہ اپنے دونوں بچوں کو گود میں اٹھائے لوریاں دیتی رہتی، کیوں کہ دونوں بچے ایک ساتھ رونا شروع کرتے، خدیجہ کو سمجھ نہ آتی کہ انہیں کیسے چپ کرائے۔ وہ کبھی ایک بیٹے کو ایک کندھے کے ساتھ لگاتی اور دوسرے بیٹے کو دوسرے کندھے کے ساتھ، یہ خدیجہ کے جڑواں بچے تھے۔ خدیجہ دونوں کو ایک ساتھ گود میں اٹھا کر اتنا خوش ہوتی کہ اسے دنیا کی ہر نعمت مل گئی ہو۔ وہ خود مسکراتی اور خوشی کا اظہار کرتی رہتی۔ دونوں جگر گوشے جب سو جاتے تو وہ ایک بیٹے کو ایک طرف گود میں سلاتی اور دوسرے کو دوسری جانب۔ ایک بیٹے کا سر ایک زانو پہ ہوتا اور دوسرے کا سر دوسرے زانو پر جب تک وہ سو نہ جاتے۔

خدیجہ نے ایک بیٹے کا نام لاڈ سے راجہ رکھا اور دوسرے کا صاحب۔ دونوں بیٹے ہم شکل تھے۔ صرف ایک بچے کی ٹھوڑی پر تل کا نشان تھا اور دوسرے کو بظاہر کوئی علامت نہ تھی۔ دن گزرتے گئے یوں راجہ اور صاحب جوان ہونا شروع ہو گئے۔ سکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی کا سلسلہ چلتا رہا۔ امتحان پر امتحان ہوتے۔ یوں زندگی کی گاڑی رواں دواں تھی۔ خدیجہ بہت خوش تھی اور وہ اپنے شوہر کو بیٹوں کی شادی کے بارے میں کہتی رہتی۔ خدیجہ کا شوہر محمد علی معمولی ملازم تھا۔ وہ ایسے ویسے گھر کا نظام چلا لیتا اور ساتھ ہی بچوں کی پڑھائی کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ محمد علی کی خواہش تھی کہ دونوں بیٹے روزگار حاصل کر لیں پھر شادی ہو جائے گی، لیکن دوسری جانب خدیجہ بہت فکرمند تھی۔ ایک مرتبہ اس نے اپنے شوہر سے کہا ”اگر ہم اپنے بیٹوں کی شادی کرا دیں، میں جھگی میں بہوؤں کا جوڑا لاتی اور پھر سکون سے بیٹھ جاتی، میری طبیعت بھی ناساز رہتی ہے۔“ محمد علی نے جواب دیا ”تمھیں کیا جلدی ہے نوکریاں تو انہیں مل جائیں کل ذمہ داری آن پڑی تو کیا کریں گے؟ دونوں نے درخواستیں جمع کرائی ہوئی ہیں نوکریاں مل جائیں گی انشاءاللہ۔“ جیسے خدیجہ نے کہا ویسے محمد علی نے جواب دیا۔ ”تمھارے ساتھ وعدہ ہے جوں ہی نوکریاں مل گئیں میں ان کی شادی کرا دوں گا۔“

خدیجہ نے شوہر کی بات مان لی اور خاموش ہوگئی۔ وقت دوڑتا بھاگتا چلا گیا۔ ایک دن ایسا آیا جب دونوں بیٹوں کو نوکریاں مل گئیں۔ خدیجہ اب بے قرار ہوگئی۔ کبھی ایک گھر میں بہو تلاش کرنے جاتی اور کبھی دوسرے گھر دستک دیتی۔ یوں دل کو تسلی دیتی رہتی۔ آخرکار ایک دن پانچ انگلیاں، دو کانوں، دو آنکھوں اور ہونٹوں تک پہنچ

ہی گئیں۔ دعا سلام ہوئی، رشتے طے ہوگئے اور دل کو قرار نصیب ہوا۔ شادی کی تیاریاں بڑے زور شور سے ہوئیں، موسم گرما میں شادی انجام پائی۔ خدیجہ کبھی ایک بیٹے اور اس کی دلہن کو پیار کرتی اور کبھی دوسرے بیٹے اور بہو کے ماتھے چومتی۔ لیکن یہ خوشی زیادہ طویل نہ تھی۔

ایک روز صبح سویرے محمد علی کے سینے میں شدید تکلیف ہوئی اسے ہسپتال لے جایا جانے لگا لیکن وہ راستے میں ہی اللہ کو پیارا ہوگیا۔

خدیجہ اب تنہا ہوگئی اور یوں اس کی جوانی کو خزاں آنا شروع ہوگئی۔ اب اسے ساری دنیا جہنم لگی۔ کیوں کہ وہ کبھی کبھار بہت تنہائی محسوس کرتی۔ اسے گھر میں اب کوئی عزت نہ ملتی اور نہ کسی شمار میں تھی۔ دن گزرتے چلے گئے۔ ایک روز اس کے بیٹوں نے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ مکان کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا لیکن مسئلہ خدیجہ کا تھا کہ وہ کس بیٹے کے ہمراہ رہے گی، کہاں کھائے گی اور کہاں پیے گی۔ خدیجہ کو اب اپنا آپ بھاری لگنے لگا کیوں کہ آنسو نہیں ٹپکتے۔۔۔ اس کا دل خون کے آنسو روتا مگر کسی کو نظر نہیں آتا تھا۔ وہ بہو بیٹوں کے فیصلے کا انتظار کرتی رہی۔۔۔ آخر میں یہ فیصلہ ہوا کہ ماں پندرہ دن ایک بیٹے کے ہاں ٹھہرے گی اور پندرہ دن دوسرے بیٹے کے ساتھ۔ خدیجہ کو حکم سنایا گیا کہ وہ دھان والے کمرے (دانی کوٹھ) میں ٹھہرا کرے گی اور اسے کھانا وہیں ملا کرے گا۔ دونوں بہوؤں نے پندرہ دن یہ ذمہ داری نبھائی تھی۔ صبح کی چائے دوپہر کو چاول، چار بجے چائے اور رات کا کھانا بھی وہیں لے جانا پڑتا۔ اس دوران اسے کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ اس نے کسی کو دیکھنا بھی نہ تھا۔ یوں پندرہ دن تو گزر ہی گئے اور دوسری بہو کی باری آگئی۔ دوسری بہو نے صبح و شام ایسا ہی کیا تا کہ مصیبت کم ہو جائے۔ خیر سے پندرہ ایام گزر گئے، لیکن مہینہ اگست کا تھا! وہ ختم نہ ہوا کیوں کہ ایک دن باقی تھا۔ بہو نے تو پندرہ دن کی باری پوری کرنا تھی اور نیا مہینہ ابھی آنے کو تھا۔۔۔ آج خدیجہ کو کوئی نہیں پوچھے گا۔۔۔ جب بات کھلی کہ ماں نے آج چائے نہیں پیئی، صاحب نے اپنی بیگم سے پوچھا ''ماں نے چائے نہیں پیئی دس تو بج گئے۔'' اس کی بیگم زور سے بولی ''ہمارے پندرہ دن تو پورے ہوگئے اب راجہ کی باری ہے۔'' ''لیکن یہ مہینہ تو جاری ہے، کیا فرق پڑے گا اگر ہم نے پندرہ دن کے بجائے سولہ دن کھانا دیا۔'' ''کل بیگم کو سمجھاؤں گا۔۔۔ بہو نے چائے بنائی اور جلتے کڑھتے چائے لے کر جانے لگی۔ وہاں کمرے میں دیکھا تو ماں (خدیجہ) جائے نماز پر ہی سوئی ہے۔ جب ذرا سا ہاتھ لگایا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ماں تو ہمیشہ کے لیے سوگئی ہے۔ اس نے ہمیشہ کے آرام کو گلے لگالیا تھا۔

☆☆☆☆

ہندکو تخلیق و ترجمہ: **احمد حسین مجاہد**

مزدور

میں سارا سال مزدوری کرتا ہوں
پتھر ڈھوتا اور پانی بھرتا ہوں
میں نے دریا پر پل بنائے ہیں
اور صحرا میں خیمے نصب کیے ہیں
میں نے آسمانوں پر جہاز اڑائے ہیں
اور گہرے پانیوں میں چپو چلائے ہیں
میں نے پہاڑ کھود کے نہر نکالی ہے
میں نے خود کو خوب کھپایا ہے
پھر بھی دنیا میرے ہاتھ نہیں آئی

☆☆☆☆

سہ ماہی ادبیات کے چند خصوصی شمارے

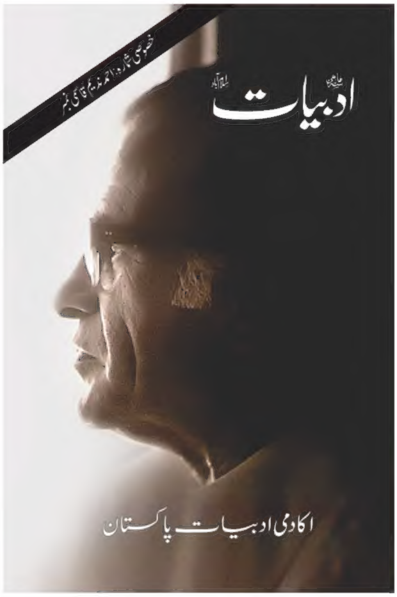
خصوصی شمارہ: احمد ندیم قاسمی نمبر
سہ ماہی
اسلام آباد
ادبیات
اکادمی ادبیات پاکستان

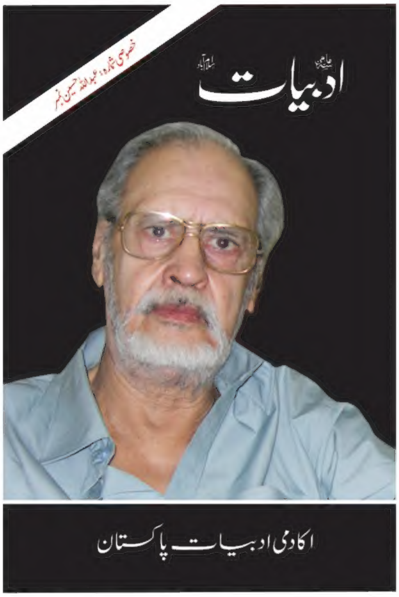
خصوصی شمارہ: عبداللہ حسین نمبر
سہ ماہی
اسلام آباد
ادبیات
اکادمی ادبیات پاکستان

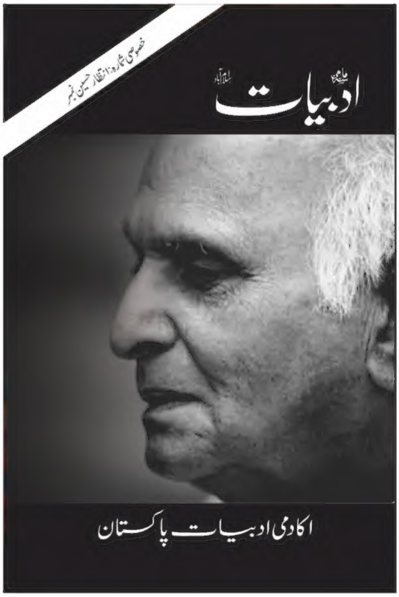
خصوصی شمارہ: انتظار حسین نمبر
سہ ماہی
اسلام آباد
ادبیات
اکادمی ادبیات پاکستان

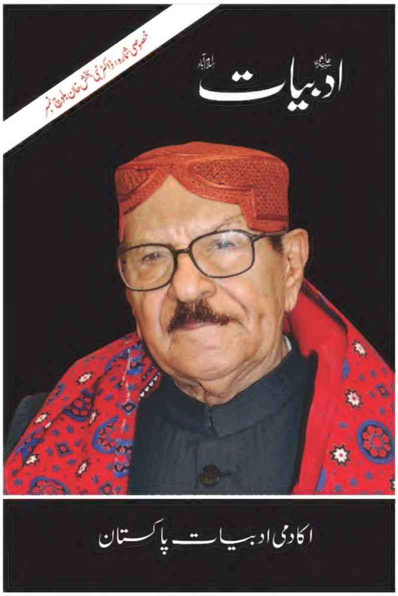
خصوصی شمارہ: ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نمبر
سہ ماہی
اسلام آباد
ادبیات
اکادمی ادبیات پاکستان

Quarterly **Adabiyaat** Islamabad

October to December 2018

ISSN: 2077-0642

اکادمی ادبیات کے دارالترجمہ کی مطبوعات

THROUGH THE WALL CRACK
Pakistan Academy of Letters

علامہ اقبال کی منتخب نظمیں آٹھ پاکستانی زبانوں میں تراجم

PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS
Patras Bukhari Road, H-8/1
Islamabad, Pakistan
Phone: +92-51-9269714
Website: www.pal.gov.pk -email: ar.saleemipal@gmail.com